

..... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

(حصہ اول، حصہ دوم)

(سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی داستان)



غنائت اللہ

.... اور ایک بُت شکن پیدا ہوا

دوسرا حصہ

سلطان محمود غزنوی کے جہاد اور جاسوسوں کی جذباتی اور واقعاتی کہانیاں

عنایت اللہ

علم و عرفان پبلشرز

34۔ اردو بازار، لاہور، فون: 7232336، فیکس: 7352332
www.ilmoirfanpublishers.com, E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

فہرست

| | |
|-----|--------------------------|
| ۷ | نگر کوٹ کی زندگی |
| ۸۸ | معرکہ انسان اور ابلیس کا |
| ۱۲۵ | سانپ سونا اور انسان |
| ۱۶۵ | قلعہ جو سر نہ ہوا |
| ۲۰۲ | طبع تخت کی اور تاج کی |
| ۲۵۸ | طوفان جو غزنی سے آیا |

پیش لفظ

عالم اسلام خصوصاً پاکستان بڑے ہی پرخطر دور سے گزر رہا ہے۔ یہود اور ہنود نے ایسا حملہ کیا ہے جس کے آگے ہماری نوجوان نسل بلکہ اس نسل کے مال باپ بھی ہتھیار ڈالتے جا رہے ہیں۔ یہ حملہ ہمارے تفریح کے ذرائع پر کیا گیا ہے۔

تفریح کے ذرائع کیا ہیں؟ — رسالے، فلمیں اور ناول — تفریح انسانی فطرت کی ایک ضرورت ہے جس سے انسان کو محروم نہیں کیا جاسکتا۔ محروم کرنا بھی نہیں چاہیے کیونکہ مسلسل کام کاج اور بنجیدہ سوچوں سے اعصاب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ تھکے ماندے اعصاب، دل اور دماغ کو سکون دینے کے لیے تفریح لازمی ہے۔

ہمارے دوسب سے بڑے دشمنوں — یہودیوں اور ہندوؤں — نے انسانی فطرت کی اس ضرورت کو سمجھتے ہوئے خفیہ طریقوں سے ہمارے لڑکچہ میں فحاشی اور جنسی لذت کے جراثیم چھوڑ دیئے ہیں۔ چونکہ ہر کس و نا کس کو مانی پڑھنا اور فلم دیکھنا چاہتا ہے اس لیے ان اخلاق سوز کہانیوں کو مقبولیت حاصل ہو گئی ہے اور اس کے نتائج اس صورت میں سامنے آئے ہیں کہ ہمارے بچے اخلاقی لحاظ سے تباہ ہوتے جا رہے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ دشمن اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔

ننگر کوٹ کی زندگی

ننگر کوٹ ہندوستان کا ایک مشہور قلعہ ہوا کرتا تھا۔ وہ دو قلعوں کا ہی تھا۔ ان کے کھنڈرات آج بھی موجود ہیں۔ ایک سے ایک وسیع اور مضبوط قلعہ تھا لیکن ننگر کوٹ کے قلعے کو خصوصی شہرت اس لیے حاصل تھی کہ اس کے اندر بہت بڑا مندر تھا۔ مندر بجائے خود ایک قلعہ تھا۔ اس کے کمرے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ اس کا خانہ بھی تھا۔ اس کے مندر میں گھوڑے اور ہاتھی گم ہو جاتے تھے۔ مندر کی حفاظت کے لیے اس کے ارد گرد قلعہ تعمیر کر دیا گیا تھا۔

یہ قلعہ اور اس کے اندر کا مندر بھارت کے مشہور شہر کانگڑہ کے قریب ایک پہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا اس سے یہ ناقابلِ تخریب ہو گیا تھا۔ قلعے پر ہتھیار کرنے کے لیے پہاڑی پر چڑھنا پڑتا تھا لیکن قلعے والوں کے تیر اور بڑے بڑے پتھر جو اوپر سے پھینکے جاتے تھے حلوہ دل کو قلعے تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔ اُس وقت جب سلطان محمود غزنوی نے پشاور بھیڑا اور ملتان پر قبضہ کر کے ایسی یوژینس حاصل کر لی تھی جیسے خیر بھارت مانا کے دل میں اتر گیا ہو، ننگر کوٹ کا قلعہ ہندوستان کے راجوں ہمارا جوں کے لیے غیر معمولی اہمیت کا مقام بن گیا۔

اس اہمیت کی وجہ اس مندر کا بڑا پنڈت رادھا کشن تھا جو کٹر برہمن اور اپنے گھر دار کا آدمی تھا۔ مندروں کے اندر کی دنیا کی جو باتیں مشہور تھیں، ان سے یہ مندر پاک تھا۔ پنڈت رادھا کشن نے ایسا ماحول بنا دیا تھا کہ دال عبادت کا مطلب صرف عبادت تھا۔ دال عبادتیں بھی جایا کرتی تھیں لیکن پنڈت نے حکم جاری کر رکھا تھا کہ کوئی عورت کسی پنڈت کے پاس نہیں بیٹھ سکتی اور مرد اور عورتیں اکٹھے عبادت

مکتبہ داستان لیڈ اس محاذ پر دشمن کا مقابلہ کرے اور اپنے نوجوانوں کو چمکانی اور نفسیاتی تباہی سے بچانے کے لیے ایسا لڑیگر پیش کر رہا ہے جو آپ کے اور لوگوں کے اس فطری مطالبے کو پورا کرتا ہے کہ کہانی کا انداز ناصحانہ نہ ہو تفریحی ہو اور اس میں سنسنی خیزی اور سپینس ہو اور جذبات میں لچیل پیادے۔

ایک اور شہرت شکن پیدائش "ہماری تاریخ کی رویداد ہے جس کا ہیرو سلطان محمود غزنوی ہے لیکن ہر کہانی میں آپ کو کچھ دوسرے ہیرو بھی ملیں گے۔ یہ کہانی بالی تفریح ہوتا کرنے کے ساتھ ساتھ ایمان افروز بھی ہیں اور یہ بیماری ان روایات کا عکس پیش کرتی ہیں جو اسلام اور ہمارے قومی شخص کی مناس ہیں۔

عنایت اللہ
مدیر "حکایت" لاہور

منہیں کر سکتے۔ عورتیں اس کی عقیدت مند تھیں اور ہندوؤں کے رواج کے مطابق عورتیں اس کے باؤں چھو کر ہاتھ اپنے ماتھے کو لگانے کی کوشش کرتی تھیں لیکن وہ کسی عورت کو دفن کی ہونے والا نہ دیکھتا تھا۔

منہ میں چند اور پنڈت اور چیلے جانتے بھی تھے۔ عورت کے معاملے میں وہ ان پر بہت سختی کرتا اور ان پر نظر رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ عورت خدا کی جڑ ہے اور عورت میں ایسا جادو ہے جو مرد پر سحر ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریے کے تحت وہ نوجوان میں ناک لٹایا ہو گیا اور اور ہمالیہ کی بجائے وادیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے ہندوؤں کا مقدس دیہا لگتا تھا۔ ہندو پنڈرہ برسوں میں اُس کا سن مر گیا۔ اُس کے نفسانی جذبات مرد پڑ گئے اور وہ گنگا کے ساتھ ساتھ پامیادہ اتر آیا تھا۔ کانگرہ کے قریب نگر کوٹ کی ایک بہاڑی پر اُس نے یہ مندر دیکھا تو وہ اس میں چلا آیا۔

اب اس کی عمر پچاس اور ساٹھ کے درمیان تھی لیکن اُس کے چہرے پر اور ڈیل ڈیل میں بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ اس کی آنکھوں میں جوانی کی چمک ابھی موجود تھی۔ وہ ہفت جنوں کی طرح سیفید چال میں جگمگ رہتا تھا۔ وہ اپنی مثال میں نہ کر سکتا تھا کہ میراجیم دینکے لہو و لعب سے اور عورت کے لمس سے پاک رہا ہے۔ اس لیے یہ ایک سو سال تک بھی ایسا ہی صحت مند اور تندرست رہا اور وہ کہا کرتا تھا کہ جس نے اپنی روح کو پاک رکھا اُس کا جسم سدا جوان رہتا ہے گا۔

منہ سب کے معاملے میں وہ کٹر تھا۔ سامان اور ہتھیار اسے زبانی یاد تھے۔ اُس کی زبان میں جادو تھا۔ لوگ اسے اقتدار پیغمبر بھی کہا کرتے تھے۔ اُسے ہندو مت کا ستون بھی اور تلمذ دار بھی کہا کرتے تھے۔ راجوں ہمارا جوں پر وہ اپنا حکم چلا کرتا تھا۔ اور راجے ہمارے اس کے قدموں میں بیٹھ کر بھول جایا کرتے تھے کہ وہ مہلک ہیں اور ان کی رعایا ان کے آگے جھکے کیا کرتی ہے۔

نگر کوٹ کے مندر میں دولت اور زور و جواہرات کے انبار لگے ہوئے تھے تمام راجے ہمارے مندر کو باقاعدگی سے مل کھول کر نقدی اور سونے چاندی کی صورت میں

تھے بھیجا کرتے تھے۔ کانگرہ کے تمام کسان اور زمیندار مندر کو مالیہ ادا کرتے تھے۔ بعض مندر نے کھائے کہ اس علاقے کی کھیتیاں مندر کی ملکیت تھیں اور کسان مندر کے مزارعے تھے اس دولت کو پنڈت راجا کٹن نے خود اپنے استعمال میں لانا تھا۔ کسی دوسرے پنڈت کو ہاتھ لگانے دیتا تھا۔ کہا کرتا تھا کہ یہ ملک اور ہندو مت کے دفن کے لیے وقف ہے اس کا کچھ حصہ غریبوں اور یتیموں کی امداد اور تعلیم پر خرچ ہوتا تھا۔

۱۸۳۸ء کا واقعہ ہے جب سلطان محمود غزنوی نے پہلے آج کے ملک کے گرد و نواح میں لاجپور کے ہمارے راجہ انند پال کو شکست دے کر ایسا بھاگایا کہ وہ گمیر چلا گیا اور اپنی راجدھانی سے لبا عریضہ حاضر ہوا۔ پھر سلطان نے بھیرہ کے راجہ کی رائے کو شکست دی اور فوراً بھارت پر حملہ کر کے ہندوؤں اور عیسائیوں کے آؤ کار قراہیں کی گئی کھائی اور برہمن کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا اور پھر انند پال کے بیٹے سکھالہ نے سلطان محمود سے بھیرہ کے میدان میں شکست کھا کر تھکڑا لے لیا اور اسلام قبول کر لیا۔ اس نے سلطان کی غیر حاضری میں غزنی کی فوج کو دھوکہ دے کر بھیرہ پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر برہمنی طرح ناکام رہا اور سلطان محمود نے غزنی کی خداداد جنگی سے فارغ ہو کر بھیرہ میں آگے کھپال کو عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا۔

۱۸۴۱ء میں اسلام کا ثناء بھارت کے دل میں اُتر گیا تو نگر کوٹ میں پنڈت راجا کٹن کی زمینیں حرام ہو گئیں۔ اُسے سلطان اور راجہ کی فتوحات کی اطلاعیں بھیرہ، پشاور اور لاہور سے ملی تھیں اور اسے یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ہمارے راجہ انند پال راجدھانی سے غیر حاضر ہے۔ پنڈت راجا کٹن نے ہندوستان کی ریاستوں اور عین اقوام کو ایسا راجہ کا بیڑا (موجود کوئی آزاد کشمیر) اور اجیر سے راجوں ہمارا جوں کو نگر کوٹ بلایا۔ سب نے حکم کی تعمیل کی۔

کیا تم سب نے عیش و عشرت کا پھل پالیا ہے یا کچھ ادا مانگے ہو؟ پنڈت راجا کٹن نے منہ نہیں کھولا کہ ان ہمارا جوں سے کہا تمہاری شکست کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم نے اپنے محل کو نگر کی طرح بنا رکھا ہے۔ میں سلائی میں تو عورتیں تھیں سلائی میں تو عورتیں تھیں سلائی میں تو عورتیں تھیں اور عورتیں بھی وہ جو سلائی میں سلائی میں لاجپور میں تمہیں سلائی میں

ایک اور بہت دشمن پیدا ہوا (دور احمد)

ہمارا سامان لائے ہو.... میں کیوں پریشان ہو رہا ہوں؟ مجھے غنہ کیوں نہیں آتی؟ ہمارا قافلہ کو گنگا تا کی آغوش میں ڈوب کر کیوں سویا کرتا ہوں؟ میری کوئی راجدھانی نہیں، میری کوئی ریاست نہیں جس کا مجھے فہم ہو لیکن میری آنکھوں سے دیکھو۔ میری عقل سے سوچو۔ یہ سارا دیش میرا دیش ہے۔ یہ لڑائی کسی زمین کے لیے نہیں لڑی جا رہی یہ ہندو دھرم اور اسلام کی لڑائی ہے محمد بن قاسم کے بعد ہمارے دادا پر دادا نے بڑی مشکل سے اسلام کو اس دیش سے نکالا تھا مگر آج اسلام ایک بار پھر طوفان کی طرح آیا ہے اور تم عیش و عشرت میں بدست ہو۔

”تم مذہب کو بھول جاؤ۔ اپنے آپ کی سوچو تم شکست کھا گئے تو کہاں جاؤ گے؟.... تمہاری لاشوں کو کوہ یا کرم نصیب نہ ہوگا۔ زندہ رہو گے تو مسلمانوں کے قید خانے میں پڑے گلے سڑتے رہو گے اور تمہاری بیٹیوں کے ساتھ مسلمان دی لوک کریں گے جو تم ان ناچنے گانے والیوں کے ساتھ کر رہے ہو جنہیں تم یہاں بھی اپنے ساتھ لائے ہو۔“

ہندت کی آواز میں اور اُس کے الفاظ میں ایسا تاثر پیدا ہوتا چلا گیا کہ راجوں ہمارا جوں کا خون کھولنے لگا۔ وہ بھڑک بھڑک کر سلطان محمود پر جوابی حملے کی باتیں کرنے لگے۔ وہ غزنی کی فوج کو اپنی متحدہ فوج سے بھیرہ اور ملتان میں محصور کر کے ختم کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔

”عقل سے کام لو“ ہندت نے کہا۔ اپنی تمام فوجوں کو اکٹھا کر کے پشاور کی طرف کوچ کرو اور مسلمانوں کے سلطان کو وہاں کہیں پہاڑی علاقے میں گھسیٹ کر لڑاؤ لٹے داداؤں میں گھما گھما کر مار دو اور غزنی پر چڑھا لے کر دود بھیرہ اور ملتان خودی تمہاری چھوٹی بیٹی لے کر آگریں گے۔ اگر تم پشاور کے قریب لڑو گے تو ہمارے متعلقہ میں غزنی کی فوج کا بے سراجہ ہوگا۔ بھیرہ اور ملتان سے جانے والی ملک کو تم راستے میں سوکھو گے۔ کچھ دیر جنگ کی ٹینک پر بحث ہوتی رہی سب ہمارا راجہ اندھا پاں کی کمی محسوس کر رہے تھے۔ ہندت نے کہا کہ معلوم ہوا ہے کہ وہ کشمیر میں ہے۔ اُسے واپس بلایا جائے۔ اور اپنی اپنی ریاست میں سادہ دیو کو مسلمانوں کو یہاں سے نکالنے کے لیے

سے بکھاتے ہو۔

”شکست راجہ اندھا پاں نے کھائی ہے۔“ ایک ہمارے نے کہا۔ مسلمان جب پرے مقابلے میں آئیں گے تو....“

”اس دیش کے ہر ہندو نے شکست کھائی ہے۔ ہندت راجا کشن نے گرج کر کہا۔ گیتا تم ہندو نہیں ہو، غزنی کے ایک مسلمان سلطان نے ہندو دھرم کو شکست دی ہے۔ یہ تمہاری شکست ہے، یہ میری شکست ہے۔ کیا بھیرہ اور ملتان کے ہندو تمہارے لیے نفس نہیں؟ مسلمانوں نے دیوی دیوتاؤں کے جوہت اور ادتاروں کی جو صورتیں توڑ پھوڑ کر باہر پھینکیں اور مسلمانوں نے جنہیں اپنے اور اپنے گھوڑوں کے قدموں میں روندنا ان کا منہ دھرم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، جہاں تکہ اور گھڑیاں بکتے تھے، جہاں کے بڑے بڑے اور جہاں کی ہوائیں بھجن اور اشوک سا کر تھیں وہاں اب اذانیں سنائی دیتی ہیں۔“ راجوں ہمارا جوں پر سناٹا طاری ہو گیا۔ ہندت کہہ رہا تھا۔ ”وہاں کی اذانیں مجھے یہاں سنائی دے رہی ہیں میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔“ میری ہر کشن اور ہری رام کی بجائے اذانیں سنائی دے رہی ہیں۔ میں ہندو کے اندر جانے سے ڈرتا ہوں۔ مجھے بُت غصے سے گھورتے ہیں میں نے صورتوں کے چہرہ پر قہر دکھایا ہے۔ مجھے یہ سارا مندر، ایقلو اور یہاں جس پر یہ کھڑے ہیں، سب ہٹے اہل زنتے ہوئے لگتے ہیں۔ کیا تم برداشت کر لو گے کہ مسلمان انہیں بھی لے کر توڑ دیں اور اس مندر میں بھی اذانیں گھنیں؟

”ایسا نہیں ہوگا ہمارا راج۔“ سب کی پرعزم آوازیں اٹھیں۔ ہم اپنا سب کچھ قربان کر دیں گے۔ اس دیش میں جو مسلمان آگئے ہیں، ان میں سے کوئی بھی زندہ واپس نہیں جائے گا۔“

”وہ واپس نہیں جائیں گے۔“ ہندت راجا کشن نے طنز پر لہجے میں کہا۔ ”وہ یہاں تک آئیں گے۔ میں اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں، اپنی عقل کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں کہ وہ آئیں گے۔“ اس لیے آئیں گے کہ تم یہاں نہیں ہو تم عورت اور شراب کے لئے میں گم ہو گئے ہو کیا مسلمان جین اور جو ان ناچنے گانے والیوں کو اپنے ساتھ رکھتے ہیں جن طرح تم اس اونچے مندر میں آئے ہو اور اپنے ساتھ باپ

فوجوں کو ہتھیاروں، جالوں اور تاج کیگزینوں انیسویں اور سمان کی ضرورت ہے۔
 یہ بندت نے کہا۔ اسی کے لیے رقم چاہیے، ہر وہ آدمی جو اس کتاب ہے، فوج میں شامل
 ہو جائے۔“

”ہم لاہور میں دوبار ایک ایک جوان لڑکی کی جہان کی قربانی بھی دے چکے ہیں“
 ایک راجہ نے کہا ”معلوم ہوتا ہے جھگڑا ان ہم پر اتنے ناراض ہیں کہ وہ تو قربانیاں
 قبول نہیں ہونگی“

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ لڑکیاں پاک نہیں تھیں۔ ہندو راہکاشن نے کہا۔ میں ہندوؤں کو جانتا ہوں۔ وہ لڑکیوں کو بہت دن اپنے پاس رکھتے ہیں اور دیوتاؤں کی امانت میں خیانت کرتے ہیں۔ ایسے بڑکار ہندوؤں کے ماسکتوں دلائی ہوئی قربانی قبول نہیں ہو سکتی... بیس یہ سوچ چکا ہوں۔ دیوی ایک انسان کی قربانی مانگتی ہے۔ یہ قربانی تم میں سے کسی ایک کی رفاہ کی دی جائے گی۔ رفاہ ایسی ہوئی چاہیے جو بہت ہی خوبصورت ہو، جوان ہو اور جو اپنے راجہ کو بہت عزیز ہو اور اس کا مسلمان ہو یا ضرور ہی ہے۔

”عمر قاصد پاک نہیں ہو سکتی ہمارا راج!۔ ایک راجے نے کہا۔ اور آپ کدو رہے
میں کہ مسلمان سبھی ہو۔“

”اُسے کوئی پنڈت بُری نیت سے اپنے پاس نہ رکھے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”میں اسے پاک کرتا ہوں.... اُسے میں اس مندر میں رکھوں گا۔ تم دیکھنا اس کی جان قبول ہوتی ہے یا نہیں۔ رقصہ کا انتخاب میں خود کروں گا۔“

ان تمام ریاستوں میں جو آدھے ہندوستان میں پھیل چکی تھیں، ہندوؤں میں گھلوں میں، بازاروں میں گھلوں میں ہندوؤں کی زبان پر یہی الفاظ چڑھ گئے۔ مسلمان فتح حاصل کرتے آ رہے ہیں۔ انہوں نے پشاور سے لے کر ملتان تک تمام جوان ہندوڑکیاں اپنی فوج میں تقسیم کر دی ہیں۔ ہندوؤں میں گھوڑے اور بیل بندھے ہوئے ہیں۔ عقیدہ لانے والے فوجی زندہ ہیں مگر کدھلی ہو گئے ہیں۔ دیوتاؤں کا کھڑے یہ سب پر گرے گا۔

ہر کسی پر خوف طاری ہوا جا رہا تھا۔ مندروں میں پنڈت مذہب کی بائیں ہمہ کرتے ابد ملانوں کے خلاف نفرت زیادہ پھیلاتے تھے۔ انہوں نے سب سے زیادہ عورتوں کو ڈرایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ (گر دیزی اور علی کے الفاظ میں) "ہندو عورتوں نے اپنے زیورات بچ کر قبض اپنے راجاؤں کے حوالے کر دیں جس عورتوں کے پاس زیورات نہیں تھے، انہوں نے موت کاٹ کر بچا اور پیسے خزانے میں جمع کرادیئے۔ غریب عورتوں نے مزدوری کر کے کھلی خزانے کو پیسے دیئے۔ جسے دیکھو، وہ پیسہ کمانے اور خزانے کو دینے کی فکر میں تھا جو ان آدمی فوج میں شامل ہونے لگے۔ وہ اپنے گھوڑے بھی سامنے لے گئے۔"

ایک جنون تھا جو ہندو قوم پر طاری ہو گیا تھا۔ آتش فشاں پہاڑ کے اندر لاد اویل
را تھا اور اندر سے پہاڑ گھٹتا جا رہا تھا۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ پہاڑ کا دہانہ پھٹے گا۔ تو
لاد اساری دنیا کو نیست و نابود کر دے گا۔

سلطان محمود غزنوی اس پہاڑ کے دامن میں بیٹھا تھا۔ وہ اپنے اُن بھائیوں کے خلاف لڑ کر آیا تھا جو اُس کے ارادوں اور اُس کے ایمان سے بے پرواہ، اُس کی سلطنت غزنی پر ہاتھ صاف کرنے کے لیے جسٹن کر رہے تھے۔ ان ایمان فرودشتوں کے عزائم کو پھیلنے کے لیے غزنی کی سرحدوں پر کافی فوج رکھنے کی ضرورت تھی۔ اگر وہاں یہ ضرورت حال نہ ہوتی تو وہ فوج ہندوستان میں کام آسکتی تھی بھیرہ اور ملتان کی لڑائیوں میں اُس کی فوج کی بہت سی نفری ماری گئی تھی۔ اُس نے اس کسی کوئی بھرتی سننے کی حد تک لورا کر لیا تھا لیکن یہ کافی نہیں تھی۔

سلطان اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں تھا کہ ہندو راجے اُسے محنت دیں گے۔ اُن کا جوہلی حلا لازمی تھا۔ سلطان وقت حاصل کرنے کی خواہش لیے ہوئے تھا۔ اسے راجہ اندیال کی طرف سے زیادہ خطرہ تھا، اور اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ تمام راجے ہمارے متحد ہو کر کبھی آسکتے ہیں۔ سورتھوں نے لکھا ہے کہ اُس نے اپنی فوج کو آرام سے دیکھنے پر ریڈنگ میں زمانہ اور وقت صرف کرتا اور فوج میں غنیمتیں پر زیادہ زور دیتا تھا۔ یہ کام

فوج کے امام کرتے تھے جو فوج کو اس جنگ کی فرض و غاشت بتاتے رہتے تھے۔ سلطان محمود نے اپنی فوج کو مال غنیمت سے کبھی محروم نہیں رکھا تھا، لیکن انہیں مفرد علاقے میں ٹوٹ مار کی کبھی اجازت نہیں دی تھی۔

اُس نے تمام ہندو ریاستوں کی راجدھانیوں میں اپنے جاسوس بھیلار رکھے تھے۔ ان جگہوں کے مقامی مسلمان ان جاسوسوں کی بہت مدد کرتے تھے۔ ان میں ملان فروش بھی تھے جو سلطان کے جاسوسوں کو کچھ لدا بھی دیا کرتے تھے۔ بہر حال سلطان کو لگتا ہی نہ رہتی تھی کہ دشمن کیا کر رہا ہے۔

راجہ انندپال کشمیر سے لاہور واپس آ گیا تھا۔ اُس نے وہاں سے کچھ فوج اکٹھی کر لی تھی۔ وہ شکست کھا کر گیا تھا۔ اُس نے سلطان محمد سے صلح اور امن کا معاہدہ کرنے کی ایک کوشش کی تھی مگر وہ فوجوں میں اس کا ذکر صرف البردئی نے کیا ہے جس کی تحریریں مستند مانی جاتی ہیں۔ البردئی سلطان محمود غزنوی کے ساتھ تھلہ بہت سے ہم واقعات کا غنی ثناء ہے۔ سلطان محمود غزنوی جب بھیرہ اور ملتان کی فتح کے بعد غزنی اس اظہار پر گیا تھا کہ کاشغر کی فوج نے اُس کی سلطنت پر حملہ کر دیا ہے تو اسے دہاں زندگی اور موت کا معرکہ لڑنا پڑا تھا۔ بعض اوقات اُس کی کامیابی خود شہ نظر آئے لگتی تھی۔ سلطان کی اس کیفیت کی اطلاع کسی طرح راجہ انندپال تک پہنچ گئی۔ البردئی لکھتا ہے کہ انندپال نے اپنے ایک قاصد کے ذریعہ سلطان محمود کو یہ تحریر بھیجی:

”مجھے پتہ چلا ہے کہ ترکوں نے آپ کے خلاف بغاوت کر دی ہے اور وہ خراسان تک پھیل گئے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو میں پانچ ہزار سواروں، اس ہزار پیادوں اور ایک سو اسی ہتھیوں کے ساتھ آپ کی مدد کو آ سکتا ہوں، اور اگر آپ پسند کریں تو میں اپنی اپنے بیٹے کو بھیج دوں گا اور اُس کے ساتھ فوج اس سے دگنی بھیجوں گا۔ اس اقدام اور پیش کش سے آپ جو بھی تاثر لیں گے، میں اسے نظر انداز کرتا ہوں۔ آپ نے مجھ پر فتح پائی ہے، میں نہیں چاہتا کہ کوئی آپ پر فتح پائے۔“

اس پیغام اور اس پیش کش سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ انندپال سلطان محمود سے کس قدر خائف تھا اور اُس میں اب لڑنے کی جرات نہیں رہی تھی لیکن محمود جس قدر قابل جرنیل تھا، اتنا ہی قابل سیاست دان تھا۔ اُسے معاہدہ مل کے سلسلے میں ہندوؤں کی جوہیت کا پتہ چل چکا تھا۔ اُسے مدد کی ضرورت تھی لیکن وہ ہندو لڑے کی مدد کا خواہشمند نہیں تھا۔ اُس نے یہ خطرہ بھی دیکھا کہ راجہ انندپال اُسے فوجی مدد کا جھانسہ دے کر یہ مقصد حاصل کرنا چاہتا ہے کہ سلطان غزنی میں ہی لٹا رہتا رہے۔ یہ خطرہ بھی تھا کہ راجہ فوج لے آئے اور سلطان کو کسی خطرناک صورت حال میں چھوڑ کر دشمن سے جا ملے۔

”کیا انندپال تاریخ کو اور ہمارے آنے والوں کو یہ بتانا چاہتا ہے کہ میں ہندوؤں کی مدد سے جیتا تھا؟“ سلطان محمود نے انندپال کا پیغام اپنے سالاروں اور مشیروں کو کرکنا۔ اُس میں کوئی اور خطرہ نہ بھی ہو تو یہ کہنے ہو سکتا ہے کہ دوا ایسے مذہبوں کے حکمران جو ایک دوسرے کی فتنہ ہیں، دوست بن جائیں، ایسی پیش کش قبول نہیں کر سکتا۔ اپنے مذہب کے دشمن کو دوست نہیں بنایا جاسکتا۔

اُس نے انندپال کے قاصد کو زبانی جواب دیا کہ اپنے راجہ سے کہنا کہ ہمارا اور آپ کا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ ہمارے درمیان امن نامکن ہے۔

اس جواب کے بعد راجہ انندپال لاہور آ گیا۔ صلح کی پیش کش مسترد ہو جانے کے بعد اُس کے لیے اب یہی راستہ رہ گیا تھا کہ سلطان محمود سے فیصلہ کن معرکہ لڑے۔ اُس کے پاس فوج کی کمی نہیں تھی۔ اُس نے آتے ہی اپنے وزیر اپنے جرنیلوں اور اپنے مشیروں کی کانفرنس بلائی اور ان سب کو بتایا کہ وہ بہت ٹھونسے سے وقت میں تیار رہی کر کے بھیرہ پر حملہ کرنا چاہتا ہے۔ اس پر بحث کے دوران یہ سبھی زیر بحث آیا کہ سلطان محمود نسبتاً فوج سے اتنی بڑی فوج کو کس طرح شکست دے دیتا ہے۔

”اُسے آج تک ہم اور مرگاشی نہا راجہ نے بال بے خبری میں نہیں دیکھا ہے۔ ایک جرنیل نے کہا۔“ اُسے اتنی قبل از وقت ہماری پیش قدمی کی اطلاع مل جاتی ہے کہ وہ اپنی فوج کو مندرجہ ذیل ترتیب میں تقسیم کر لیتا ہے۔ ہم ہر بار اُس کی گھات میں آئے ہیں۔ اس

سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اُس کے جاسوس بہت ہوشیار ہیں۔ یہ جاسوس ہمارے
درمیان گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔

”یہاں مسلمانوں کی جو تھوڑی سی آبادی ہے، ان میں اُس کے جاسوس ہیں۔“
راجہ اندھ پال نے کہا۔ ”کیوں نہ اس پوری آبادی کو صاف کر دیا جائے؟“

”یہ اقدام ہمیں کوئی فائدہ نہیں دے گا۔“ وزیر نے کہا۔ ”یہ لوگ یہاں سے بھاگ
جائیں گے۔ جاسوس فوراً نکل جائیں گے۔ ایسی کاروائی کریں کہ ہمیں جاسوس مل جائیں۔
یہاں کے مسلمانوں کو اپنا دشمن نہ بنائیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ کتنے ہی مسلمان ہمارے لیے
مجزئی اور جاسوس کرتے ہیں۔ مسلمان کی تجزی مسلمان ہی کر سکتا ہے۔ ہم ایسا انتظام کریں
گے کہ مسلمان گھروں پر نظر رکھیں اور خفیہ طریقے سے پتہ چلائیں کہ کون جاسوس ہے۔ اگر
ایک کپڑا لٹکیا تو ہم طریقے جانتے ہیں کہ اُس سے معلوم کیا جائے کہ یہاں کون کون جاسوس
ہے۔“

”یہ کام آج ہی شروع کر دو۔“ راجہ نے کہا۔ ”اور فوج کو تیار کر دو۔“

”لوگ بہت مدد کر رہے ہیں۔“ وزیر نے کہا۔ ”مہندوں میں ہندوؤں نے لوگوں کو جنگی
تیاری اور فوج کی ضروریات کے متعلق بتلوا رہے۔ وزیر نے بتایا کہ لوگوں کو کیا کچھ بتایا
جار رہا ہے اور لوگ کس طرح مدد سے رہے ہیں۔“

راجہ اندھ پال کے راج محل میں گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والوں کا انچارج شعیب
اور خانی بہم کا ایک مسلمان تھا جو گھوڑوں کو سدھانے کا ماہر اور شہسوار تھا۔ وہ پشاور کے ملائے
کا رہنے والا تھا۔ راجہ جے پال کے آخری دور میں یہاں آیا تھا۔ اُس وقت وہ نوجوان تھا۔ وہ
اب کچھ کار جو ان بن چکا تھا۔ اُس نے بڑے خود سارا عادی بے لگام گھوڑوں کو بھی رام
کر لیا تھا۔ راجہ جے پال کے بعد اُس کا بیٹا راجہ اندھ پال بھی اسے بہت چاہتا تھا۔

گھوڑوں کی بہارت کے علاوہ اُس میں کچھ اور خوبیاں بھی تھیں جن کی بدولت وہ محل
کی رانیوں اور راجکاروں کو بھی اچھا لگتا تھا۔ ایک تو وہ خوب رو تھا۔ اُس کا رنگ گورا اور
آنکھیں سبز تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُس کی زبان میں چاشنی تھی اور اُس کے ہونٹوں پر

”تیس رہتا تھا۔ وہ دروازہ درگٹھے ہوئے جسم کا جوان تھا۔ گھوڑے بھی جیسے اُس سے
محبت کرتے تھے۔ اُس کی وفاداری میں کسی کو شک نہیں تھا۔ اُس کی وفاداری بھی ایسی
کہ اُس کے متعلق راج محل میں کہتے تھے کہ یہ نام کا مسلمان ہے۔“

محل کے محل میں چند ایک مسلمان ملازم بھی تھے جو چھوٹے چھوٹے کام کرتے تھے۔
راجہ اندھ پال کے لئے حکم کے مطابق خفیہ طریقے سے ان سب کی نگرانی ہونے لگی۔ ہندو
فوجی مسلمانوں کے بہرہ دیں انہیں چلنے اور پرکھنے لگے۔ ہندو فعل کی نعریں اور چالاک
راکیاں مسلمان لڑکھوں کے کھیس میں مسلمانوں کے گھروں میں جاتیں۔ محمود غزنوی کے حق میں اور
ہندو فعل کے خلاف باتیں کرتیں اور مسلمان غور توں سے ان کے سروں کے خیالات اور خفیہ
سرگرمیوں سے متعلق پتہ چلانے کی کوشش کرتیں۔ ہندو مرد آج کی پولیس کی طرح مسلمان منزل
سے ملتے۔ راز و نیاز کی باتیں کرتے۔ اپنے آپ کو سلطان محمود کے جاسوس کہتے۔ اس
خفیہ ہم میں کسی ایک مسلمان کپڑے گئے جس کی پرزور اسٹاک ہوتا تھا۔ اُسے بھی پکڑ لیتے اور
یہ سب اتار دیکر پکڑ لیتے گئے۔

شعیب ارغوان پر شک کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ اُس کی سرگرمیاں گھوڑوں تک محدود
تھیں۔ اُس پر صرف اس بنا پر شک کیا جاسکتا تھا کہ وہ اکیلا رہتا تھا۔ اُس وقت تک
اُسے دو تین بچوں کا باپ بن جانا چاہیے تھا لیکن وہ اکیلا تھا۔ اگر اس کی بیوی یا بھریں
تھی تو اسے کبھی بھی لاہور نہیں لایا تھا۔ اگر اُس نے شادی نہیں کی تھی تو اب تک کہیں
چلایا ہے۔ کبھی ہی ایک پہلو تھا جو اُس کے خلاف کچھ شک پیدا کر سکتا تھا لیکن ہندو اُسے
اپنی خفیہ ہم سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ اُس نے کسی بار سلطان محمود کے
خلاف باتیں کی تھیں۔ اُسے کبھی مسجد میں جاتے نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ نماز روزے
سے بھی فارغ تھا۔ اُس کے متعلق معلوم کر لیا گیا تھا کہ وہ کسی مسلمان سے نہیں ملتا۔

ایک شام وہ اپنے گھر میں اکیلا تھا۔ اُس کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اُس
نے دروازہ کھولا۔ باہر ایک سیاہ ریش اجنبی کھڑا تھا۔ اُس کے ساتھ ایک عورت تھی
جس نے چہرہ نقاب میں چھپا رکھا تھا۔ اس اجنبی نے اپنا تعارف یوں کر لیا کہ وہ پشاور

اُس نے گھوڑا سوار کی سی کھینے آئی تھیں۔ دونوں کی کوشش یہ ہوئی تھی کہ وہ خود گھوڑے پر نہ بیٹھیں، ارغمان انہیں اٹھا کر گھوڑے پر بیٹھائے۔ وہ گھوڑا سوار کی سی کھینے کو بھی کشتی تھیں کر نہیں، وہ ابھی طاق نہیں ہوتیں۔

یہ دونوں بصورت لڑکیاں تھیں لیکن ارغمان ان کے اتنے واضح اشاروں کو بھی یوں نظر انداز کر دیتا تھا جیسے وہ بھو اور بھال ہو یا اس کے سینے میں مرد کا دل ہی نہ ہو۔ ایک بار ایک راجکار سی گھوڑا سرپٹ و ڈرانے کے بہانے اُسے دیا کے کنارے جنگل میں لے گئی تھی اور وہاں جا کر ارغمان سے کہا کہ میرے گھوڑے پر میرے پیچھے سوار ہو جاؤ، مجھے ڈر آتا ہے۔ ارغمان نے انکار کر دیا تھا۔ راجکاری نے پہلے التجا کی کہ آ جاؤ میرے پیچھے اور مجھے اپنے بازوؤں میں کپڑو۔ وہ نہ مانا تو راجکاری نے اُسے حکم دیا کہ میرے پیچھے بیٹھو۔ ارغمان نے مسکرا کر انکار کر دیا تھا۔ راجکاری غصے سے گھوڑا واپس لے آئی تھی۔

اس معاملے میں وہ پھرتھا لیکن اپنے بہانوں کی بڑی کو دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں ایسی پہل محسوس کی جس سے وہ آشنا نہیں تھا۔ وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا بھروسہ تھا کہ اُس کی نیت بد نہیں ہو سکتی تھی، پھر بھی اُس کے دل میں یہ خواہش تڑپ لی کہ اُس کا بہانہ ذرا باہر چلا جائے اور وہ اس لڑکی کے ساتھ باتیں کرے۔ لڑکی اُسے دیکھتی تھی تو اُس کے ہونٹوں پر شرمیلا سا قسم آ جاتا تھا۔ یہ قسم ارغمان کے باؤں اٹھا دیتا تھا۔

کھانا کھانے کے بعد ارغمان نے بہانوں کو اُن کا کمرہ دکھایا۔ لڑکی اُسی کمرے میں رہ گئی اور لپٹ لگتی اور اُس کا باپ ارغمان کے کمرے میں آں بیٹھا۔ گپ شپ چلا۔

تو سلطان ہونے کے وجہ سے سلطان محمود غزنوی کی فتوحات کی باتیں ہونے لگی۔ دونوں خوشی کا اظہار کیا۔ بہانوں کی باتوں سے یہ چلتا تھا کہ سلطان محمود کا شہزادی ہے اور وہ صرف تاجر ہی نہیں علم و فضل پر بھی دسترس رکھتا ہے۔ اُس نے محمد بن قاسم کی بھی باتیں کیں اور کہنے لگا کہ اُس کا بس چلے تو سارے ہندوستان کو مسلمان کر دے۔ اُس نے اس پر شامی کا بھی اظہار

کاتا ہے اور سامان لے کر آتا ہے، اور اُس کے ساتھ اس کی جوان سال بیٹی ہے جسے وہ اس لیے ساتھ لایا ہے کہ اس کی بیوی مر چکی ہے اور گھر میں اور کوئی نہیں جس کے پاس وہ بیٹی کو چھوڑ کر آتا۔ بیٹی کی خواہش سیر کی بھی تھی، اس لیے وہ اسے ساتھ لے آتا ہے۔ وہ پشاور کی زبان بول رہا تھا۔

وہ سرائے میں رہائش کا انتظام اچھا ہے۔ اجنبی نے کہا۔ لیکن اتنی جوان اور ایسی خوبصورت بیٹی کو سرائے میں رکھنا ٹھیک نہیں رہتا ہے ہندو فوج چھاپے مارتی سکتی ہے اور مسلمانوں کو شک میں کر دیتے ہیں کسی نے آپ کے متعلق بتایا ہے کہ آپ اکیلے رہتے ہیں اور لوگ آپ کی شرافت اور نیت کی تعریف کرتے ہیں۔ مجھے آپ کے گھر کا راستہ دکھایا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ آپ ہمارے ہی وطن کے رہنے والے ہیں۔

”ایک مسلمان کسی مسافر پر اپنے گھر کا دروازہ بند نہیں کر سکتا۔“ ارغمان نے کہا۔ اور جہاں ایک مسلمان خاتون کی عزت کا معاملہ ہو طل میں ساری رات پہرہ بھی دے سکتا ہوں۔ مسلمان ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں ہوا کرتے۔ آؤ، اپنی بیٹی کو لے آؤ میرے گھر میں بہت کمرے ہیں۔

وہ دونوں اُس کے ساتھ اُسی کے کمرے میں آگئے۔ خاتون نے دیبے کی روشنی میں جہرے، اے نقاب بٹایا تو ارغمان کو دھچک سا لگا۔ وہ عورت نہیں، جوان لڑکی تھی اور اُس کے خن میں کوئی ایسی کشش تھی کہ ارغمان سن ہو کے رہ گیا۔ اُس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ آپ نے اچھا کیا ہے کہ سرائے میں نہیں ٹھہرے چھپا کر رکھنے والی چیزوں کو ایک نہیں سات پردوں میں چھپا کر رکھنا چاہیے۔

انہیں بھاگ کر وہ دڑتا ہوا باہر نکلا اور بازار سے بہانوں کے لیے کھانا لے آیا۔ لڑکی نے برقع نہ پہنا اور بھی اتار دی تھی اُس کا قد اور سراپا اس قدر دلنشیں تھا کہ ارغمان اُس سے نظروں نہ ہٹا سکا۔ راج محل کی نوکری میں کسی لڑکیوں نے ارغمان پر ڈوبے ڈالے تھے لیکن اُس نے اپنے دامن کو ہر کسی سے پاک رکھا تھا۔ راجہ انند پال کی دوا بھلا بیل

”میرا اتفاق براہ راست سلطان محمود غزنوی سے اذناس سر۔ مالارالہ اللہ الطالیٰ سے ہے۔ یہاں نے جواب دیا۔ یہاں مجھے کسی ایسے آدمی کی مدد کی ضرورت ہے جو راج محل اور راج دہار کے اندر کے حالات جانتا ہو۔ وہ آدمی تم ہو۔ مجھے تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والے آدمی میرے لیے ہیں۔ انہوں نے مجھے تمہارے پاس کچھ موقع کچھ کر بیجا ہے۔“

”وہ کون ہیں؟“

”مجھے اس سوال کا جواب نہیں دینا چاہیے۔ یہاں نے کہا۔ یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تم پر اعتبار نہیں ہیں صرف احتیاط کرنا ہوں۔ سب کچھ بنا دوں گا۔ ہم یہ بتا دو کہ میرا ساتھ دو گے، اگر وہو کہ دو گے تو چھٹا دو گے۔“

ارمغانی کا سر جھک گیا۔

”میرے جذبے کا اندازہ اس سے کرو کہ میں اپنی بیٹی کو سلطان محمود کی فتح کے لیے استعمال کرنے کو تیار ہوں۔ یہاں نے جذبات سے لڑتی ہوئی آواز میں کہا۔ ایسی خوبصورت لڑکی پھر دل کے بھی دل چر کر ناز لے آئے گی۔ ہو سکتا ہے یہی سب کو تباہ کاری کرنی پڑے۔“

”میری دو باتیں دھیان سے سنو میرے تاجر دوست۔“ ارمغانی نے کہا۔ ایک یہ کہ بیٹی کو اس کام میں استعمال نہ کرنا۔ مسلمان کی بیٹی میدان جنگ میں لاسکتی ہے اور ہماری بہنیں لڑی بھی ہیں لیکن انہیں جاسوس بنا کر کفار کے حوالے کرنا کفر ہے۔ یہ گناہ کفار کیا کرتے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ میں تمہاری کئی مددیں کر سکتا۔ میں نے راج کا ٹنک دکھایا ہے میں نے راج کی خدمت کی ہے اور راج نے مجھے اتنی اجرت دی ہے جس کا میں حقارت نہ تھا۔“

”ایک طرف تم اسلام اور اسلامی غیرت کی باتیں کرتے ہو، دوسری طرف تم اس کے دشمن کا ٹنک حلال کر رہے ہو۔ یہاں نے کہا۔ میں نے سنا تھا تم نبوت جرات والے اور ایمان والے ہو۔“

”مجھ میں دلوچیزیں ہیں۔“ ارمغانی نے کہا۔ ”جرات بھی، ایمان بھی لیکن میں یہ نہیں کہلاؤں گا کہ مسلمان ٹنک حرام ہوتے ہیں۔“

کیا کہ سلطان محمود کے پاس فوج کی کمی ہے اور اگر تمام راجوں نے اس پر حملہ کر دیا تو مسلمانوں کی فوج مقابلہ نہیں کر سکے گی۔ ارمغانی نے کہا کہ مسلمان کو اپنے اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔

”لیکن مسلمان کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔“ یہاں نے کہا۔ ”ہم دو مسلمان یہاں بیٹھے ہیں۔ ہم اس سلطان کی کیا مدد کر رہے ہیں جو کافروں کے دس میں اللہ اور رسول کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اور کفر کی ساری طاقتیں اس کے خلاف ہیں۔۔۔ میں تجارت کر رہا ہوں اور تم ہندوؤں کی نوکری کر رہے ہو۔“

”ضرورت پڑی تو میں نوکری چھوڑ دوں گا۔ ارمغانی نے کہا۔۔۔“

”سنیں۔“ یہاں تاجر نے کہا۔ ”میں نے تمہارے ساتھ یہ باتیں اس لیے کی تھیں کہ دیکھیں کہ تم کیسے مسلمان ہو اور اسلام کے ساتھ تمہارا رشتہ کیسا ہے۔۔۔ میں نے دیکھ لیا ہے کہ تم اپنے رسول کے نام پر مرنے والے مسلمان ہو۔ میں تمہارے ساتھ دلی کی بات کر سکتا ہوں۔ تم نے نوکری چھوڑ دینے کی بات کی ہے۔ یہ غلط ارادہ ہے۔ ہم اس نوکری کو سلطان محمود کے فائدے کے لیے استعمال کر سکتے ہو۔ ہم راج محل میں کام کرتے ہو۔ تمہارے گھر کا راستہ دکھانے والوں نے مجھے بتلایا ہے کہ گھوڑوں کا استاد ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کی فوج کے حربے بڑے ناکم اور مل کی شہزادیاں بھی نہیں جانتی ہیں۔۔۔ ہمیں کتنا کچھ بھی نہیں۔ یہ معلوم کرتے ہو کہ راج کے ارادے کیا ہیں یہاں کی فوج کی تیاریاں دیکھتے رہو اور یہ اطلاعیں سلطان تک پہنچاتے رہو۔“

”کیا تم یہ کام کرتے ہو؟“ ارمغانی نے پوچھا۔

”یہاں عجیب سی بہنیں ہنس کر بولا۔ ”بے شک میں تاجر ہوں لیکن تجارت کے سلسلے میں مجھے انداز آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔۔۔ میں ادھوں پر مسلمان لاؤں گا اس لیے یہاں آیا ہوں کہ دیکھوں کہ راج اندھ پال کیا کر رہا ہے اور وہ کب تک مسلمانوں پر حملے کے لیے تیار ہو جائے گا۔ دراصل سلطان کو بھی وقت چاہیے۔ اس کی فوج کا جالی نقصان بہت ہوا ہے۔ اس کی کوپڑا کر رہا ہے۔“

”میں کسی نے بھیجا ہے؟“ ارمغانی نے پوچھا۔ ”یا یہ کام اپنے جذبے کے تحت کر رہے“

کر دیا۔ میں کسی امیر کبیر کو درخت نہیں دوں گا۔ جو کوئی وہ ایک بیوی سے ملتی نہیں ہو کر رہے۔
 شعیب ارمغانی کو اپنے کانوں پر بلیں نہیں آ رہا تھا وہ تو اس لڑکی کو دیکھتے ہی اس
 کے حسن سے سحر ہو گیا تھا۔ اس کے لیے مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی۔

اگلے صبح ارمغانی کا بہانہ یہ کہہ کر چلا گیا کہ شام کو واپس آئے گا۔ ارمغانی لڑکی کے
 ساتھ اکیلا رہ گیا۔ اس نے لڑکی کے لیے ناشتے کا انتظام کیا اور اس کے آگے ناشتہ رکھ کر
 اس سے نام پوچھا اس نے بتایا۔ ”زرد“۔

”کیا باپ نے تمہیں بتلایا کہ وہ تمارا بیوی شادی میرے ساتھ کر رہا ہے؟“
 شعیب ارمغانی نے پوچھا۔

لڑکی نے نگاہیں نیچی کر کے سر اٹھا کر دیکھا جیسے زمین میں دھنس جانا چاہتی ہو۔
 ”مجھے جواب دے زرد“۔ اس نے لڑکی کا سر ادا پر اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ”مجھے اچھی
 طرح دیکھ لو۔ اگر مجھے اپنے قابل سمجھو تو نہاد میں تمہیں تمارا مرضی کے بغیر ساری عمر
 کے لیے اپنی زنجیروں میں نہیں باندھوں گا۔ میں ناکارہ کر دوں گا۔“

زرد نے زبان سے کچھ بھی نہ کہا۔ ارمغانی کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں کے لیے
 اپنے ہونٹوں سے پھیرا ہی آنکھوں سے لگا ہوا اور پھر اس کا ہاتھ اپنے سینے پر رکھ کر دیا۔ تب
 اس نے ارمغانی کو نظر بھر کر دیکھا۔ ارمغانی کے ہاتھ گھونڈوں کے چھوٹے ہاتھوں کے پس کے عادی
 تھے۔ وہ گھونڈوں کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے جوانی گزار رہا تھا۔ وہ اتنے نازک ہاتھوں اور
 اتنے نرم اور ملائم بالوں کے پس سے نا آشنا تھا جو اس لڑکی کے تھے۔ اس نے ایسی
 نشانیوں سے اس کی قریب سے بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس پر غار طاری ہو گیا۔

شام کو زرد کا باپ آیا تو اس کے ساتھ دو آدمی تھے۔ انہوں نے زرد کی شادی
 شعیب ارمغانی کے ساتھ کر دی۔ باپ نے زرد کو نقد رقم دی، کپڑے دیے اور سونے
 کے زیورات دیے اور وہ اسی شام چلا گیا۔ اس کے جانے کا انداز ایسا تھا جیسے ارمغانی
 کو اپنی بیٹی دینے ہی آیا ہو۔

”پھر تو مجھے لاہور سے جلدی نکل جانا چاہیے۔“ بہانہ تاجر نے کہا۔ ”وہ نہ تم مجھے
 اور میری بیٹی کو بکتر داغ دے گا۔ میرے یہاں کے آدمیوں نے مجھے بتایا ہے کہ مسلمانوں کو شوک
 اصرار سے میں بکتر رہے ہیں۔“

ارمغانی اٹھا اور طاقت سے قرآن اٹھا کر دونوں ہاتھوں میں لیا اور بہانہ کے آگے
 کر کے کہا۔ ”اس پر آمنا رکھو۔“ بہانہ نے ہاتھ رکھا تو ارمغانی نے کہا۔ ”میں خدا اور رسول
 کے اس پاک کلام کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ تمہیں اور تمارا بیوی کو دھوکا نہیں دوں گا۔۔۔
 اب تم قسم کھاؤ کہ تم میری کو اس کام میں استعمال نہیں کر دو گے اور تم سلطان محمود غزنوی کو دھوکا
 نہیں دو گے۔“

بہانہ نے قسم کھائی کچھ دیر صبح میں بڑا رہا پھر کہنے لگا۔ ”تم نے میری قسم کے متعلق قسم
 لے کر مجھ پر ظلم کیا ہے۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنا خطرناک کام کر رہا ہوں نہیں پڑا گیا تو میری
 بیٹی کا انجام بہت برا ہو گا۔ کیا تم میری بیٹی کی ذمہ داری قبول کر سکتے ہو؟“ ارمغانی اسے
 کچھ دن اپنے پاس رکھو نہیں اپنے کا بعد کے سلسلے میں شاید باہر چلا جاؤں۔
 ”میری بیٹی کی جوانی لڑکی کو اپنے پاس رکھنا بڑی ہی نازک ذمہ داری ہے۔“ ارمغانی نے
 کہا۔ ”میں انکار بھی نہیں کر سکتا اور میں اقرار ہے بھی گھبراتا ہوں۔“

بہانہ تاجر اٹھ کھڑا ہوا اور سر جھکا کر کمرے میں بیٹھنے لگا۔ کچھ دیر بعد ننگ کر لولا۔
 ”اگر میں اپنی بیٹی میں پیش کر دوں تو اسے بیوی بنا لو گے، میں اپنے ہاتھوں شادی کر دے گا۔
 ”آپ نے مجھ میں ایسی کوئی خوبی دیکھی ہے کہ اپنی اتنی خوبصورت بیٹی کی شادی مجھ
 جیسے عام آدمی کے ساتھ کر رہے ہیں؟“ ارمغانی نے کہا۔ ”میں اپنے آپ کو اس
 قابل نہیں سمجھتا۔“

”تمہیں یہ خوبی دیکھی ہے کہ تم جا سوس نہیں ہو۔“ بہانہ نے کہا۔ ”میں اسی لیے تم
 سے پوچھ رہا تھا کہ تم جا سوس کی کر سکتے ہو یا نہیں۔ تم وفادار ملازم ہو، اس لیے میری
 بیٹی کا مستقبل محفوظ رہے گا۔ جا سوس کی زندگی کچھ بہتر نہیں ہوتا۔ وہ اپنی بیوی کو اپنے
 ساتھ بھی نہیں رکھ سکتے۔ میری بیٹی کے لیے دولت مندوں کے رشتے مل رہے ہیں۔
 پشاور میں غزنوی کی فوج کے ایک نائب سالار نے مجھ سے رشتہ مانگا تھا۔ میں نے انکار

مجھے تیغ زل زنگھوڑ سواری اور شیرانہ بازی کی بہت مشق کرا چکے ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے کہا تھا کہ بیٹی! جو سکتا ہے میں تمہاری شادی زکرسکوں سمجھے نظر آ رہا ہے کہ تم اسلام اور سلطان محمود کے نام پر قربان ہوگی؟

ارمغانی نے محسوس کیا کہ لڑکی کے خیالات اپنے باپ جیسے ہیں اور اس میں باپ والا جوش و خروش ہے۔

”تمہیں یہ کس نے بتایا ہے کہ میں غزنی والوں کا جاسوس ہوں؟“ ارمغانی نے

پوچھا۔

نزد نے اپنا ایک بازو اُس کی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور اُس کے اس

قرب ہو گئی کہ دونوں کے گال جھونے لگے۔

”مجھے معلوم نہیں کہ والد کو آپ کے متعلق کس نے بتایا تھا۔“ نزد نے جواب دیا۔

”مجھے انہوں نے کہا تھا کہ تم جس آدمی کے پاس جا رہے ہیں، وہ ہمارے کام کا آدمی ہے۔“

نزد نے مزید اُس کے اور قریب کر کے راز داری سے کہا۔ ”اگر آپ صحیح کہہ رہے ہیں کہ

آپ سلطان محمود کے خفیہ آدمی نہیں تو مجھے مایوسی ہوئی ہے؟“

”پھر تمہارے دل سے میری محبت نکل جائے گی؟“

”محبت تو روح میں اتر گئی ہے۔“ نزد نے جواب دیا۔ ”میرا مطلب یہ ہے کہ

میں غزنی کی فوج کی اتنی مدد کرنی چاہتا ہوں کہ وہ اگر سارے ہند پر نہیں تو آدھے ملک پر

قابض ہو جائے اور یہاں کا بوجھ پر مسلمان ہو۔“

”تمہیں یہ کس نے یہ بتایا ہے کہ صرف جاسوسی سے ہی غزنی والوں کی مدد کی جاسکتی

ہے؟“ ارمغانی نے پوچھا۔ ”اور بھی کئی طریقے ہیں؟“

”میرے والد صرف جاسوسی کی باتیں کرتے ہیں۔“ نزد نے کہا۔ ”ایک عورت

یہی کام کر سکتی ہے لیکن میرے والد مجھے بتا گئے ہیں کہ تم نے ان سے قرآن کی قسم لی ہے

کہ وہ مجھے اس کام کے لیے استعمال نہیں کریں گے۔ میں ایسا کام نہیں کروں گی جس میں

میری عصمت کو خطرہ ہو لیکن میں صرف یوی بن کر نہیں رہ سکتی۔ آپ وہ کام کریں جو آپ

کو میرے والد بتا گئے ہیں۔ یہ میری روح کی آرزو ہے۔“

اس رات ارمغانی کو کئی بار شک ہوا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ ذرا سی دیر میں نزد اُس کے ساتھ بڑی کھل گئی جیسے وہ ایک مدت سے ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ لیکن ارمغانی پر ظلم کی طرح ظاری ہو گئی۔ ارمغانی کی جذباتی حالت ایسی ہو گئی جیسے جسے پرانے کے پتہ چلا ہو کہ وہ بیاس سے مر رہا ہے۔

”تمہارا باپ سلطان محمود کے متعلق بہت جذباتی ہے۔“ ارمغانی نے نزد سے کہا۔ ”تم جانیں ہو کہ اُس کے ارادے کیا ہیں؟“

”اگر میں آپ سے کہوں کہ وہی ارادے میرے ہیں جو میرے باپ کے ہیں تو آپ کیا کریں گے؟“ نزد نے کہا۔ ”میرے باپ نے آپ کے ساتھ جو باتیں کیں تھیں، وہ سب

مجھے بتا گئے ہیں۔“

”اللہ یہ بھی کہہ گئے ہوں گے کہ تم مجھے جاسوسی کے سلسلے میں اُس کی مدد پر آمادہ کرو۔“ ارمغانی نے کہا۔

”ہاں؟“ نزد نے کہا۔ ”میں آپ سے کچھ بھی نہیں چھپاؤں گی۔ وہ مجھے کہہ گئے ہیں کہ میں آپ کا اسلام کی خاطر کام کرنے کے لیے تیار کروں کیونکہ آپ کو راجہ نے ایسی جگہ دے رکھی

ہے جہاں سے آپ بڑے قیمتی راز حاصل کر سکتے ہیں۔“

کیا تم نے ان کی قسم کے لیے میرے ساتھ شادی کی ہے؟“ ارمغانی نے کہا۔ ”معلوم ہونا ہے تم مجھے انعام کے طور پر دی گئی ہو۔“

”نہیں۔“ نزد نے جذباتی لہجے میں جواب دیا۔ ”میرے آپ کو مجھے انعام کے طور پر دیا ہے۔“

آپ میری زندگی کے ساتھی بنیں، میرے دلی اور میری مدد کے مالک ہیں۔ میں نے

آپ کو کل ہی دیکھا ہے نا اگر اے لگتا ہے جیسے ہر لمحہ میری آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔

میرے دل میں جو کچھ ہے وہ آپ کا ہے۔... میرا ہر راز آپ کا ہے۔ آپ کی دم میں قسما

تہ ہوں۔ ہم باپ بیٹی اسلام کی شمع کے پردانے ہیں۔ میرے والد پر یہ جن ظاری ہے

کہ سارے ہند میں اسلام بھیلانا ہے۔ وہ جس مسلمان سے ملے ہیں اُس سے پہلی بات یہ

پوچھتے ہیں۔ سلطان محمود غزنوی کی فوج کے لیے تم کیا کر رہے ہو؟ مسجد میں جاتے ہیں

تو سلطان محمود کی فوج اور ہندوؤں کی شکست کے لیے دعائیں کرتے اور کراتے ہیں۔ وہ

ایک لڑکتی عورت پیدا ہوا (دوسرا حصہ)

شعیب ارمغانی نے اُسے کوئی تسلی بخش جواب نہ دیا۔

اُس رات کے بعد ارمغانی کی یہ حالت ہو گئی کہ وہ کام سے وقت نکال کر گھر چلا جاتا اور زرد کے ساتھ چند سنت گزار کر واپس چلا جاتا۔ زرد اُس کی بوی بقی لیکن کبھی کبھی وہ اُسے اس طرح دیکھنے لگتا جیسے اُسے اُس سے کوئی پھین کرے جائے گا۔ زرد اُس کی محبت کا جواب دیولند دار محبت سے دیتی لیکن وہ ہر رات اُسے اکساں کر دہ ہند میں اسلام کی فتح کے لیے کچھ کرے۔ اس حملے میں بھی وہ اتنی ہی جذباتی تھی جتنی ارمغانی کی محبت میں دیولند۔

دس بارہ روز گزرے ہوں گے۔ آدھی رات تک وہ دیولند زرد نیاز اور پیارو محبت میں غور رہے۔ ارمغانی پر زینہ کا غلبہ ہو جا رہا تھا۔ زرد کے حسن و جوانی نے اُس پر اپنا خمار طاری کر دیا تھا۔ اس کیفیت میں زرد نے آہ بھر کر کہا۔ ”آپ کے جسم کی پیش اور آپ کی محبت کا سرور مجھے جنت میں پہنچا دیتا ہے۔ جنت اس سے زیادہ دلنشین نہیں ہو سکتی، گھر اس نے میں جب غزنی کے وہ جوان یاد آتے ہیں جو اتنی دُور اگر شہید ہوئے ہیں تو میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔ شہیدوں کی روحیں مجھے لعنت طاعت کئی میں کرتی ہیں۔ عیش و عشرت میں پڑی ہوئی ہوں اور تمہیں اپنی روح کی سسرت کا کوئی خیال نہیں۔“

اُس نے بے تاب ہو کر ارمغانی کے گھٹے میں بائیں ڈال دیں اور بولی۔ ”میری بھج کا گلا گھونٹ دے تاکہ میں صرف غول و صورت جسم بہ جاؤں اور تم اس کے ساتھ کھیلے رہو۔ اگر ہم ان شہیدوں کے غم کو جنہیں وہ ادھورا چھوڑ گئے ہیں پورا نہیں کر سکتے تو ہمیں اپنا مذہب تبدیل کر لینا چاہیے۔“

ارمغانی پر خمار طاری تھا۔ یہ خمار اُس کی عقل پر غالب آ گیا۔ اُس نے کہا۔ ”زرد! میں اپنی قسم توڑنے سے ڈرتا تھا۔ میں نے مسجد میں قرآن پر حلف اٹھایا تھا کہ جان دے۔ دل کا اپنا اور اپنے کسی ساتھی کا راز کسی قیمت پر نہیں دوں گا۔ آج میں اپنی قسم اس لیے توڑ رہا ہوں کہ مجھے یقین ہو گیا ہے کہ تم میری بوی ہی نہیں، میرے ان ساتھیوں کی طرح میری ساتھی بھی ہو جو میری طرح حلف اٹھا کر خدا سے آئے ہو۔“

میرا زرد اس لمحہ میں غزنی کی فوج کا جاسوس ہوں۔ میں نے فوجانی میں غزنی جاکر جاسوسی کی تربیت حاصل کی اور یہاں آیا تھا۔ مجھ میں شہرہ تھا کہ گھوڑا کتنا ہی اکھڑا اور مدد زور ہو، اُسے اپنا غلام بنالیتا ہوں۔ خدا نے مجھے چند اور خوبیاں بھی دی ہیں۔ یہاں آیا تو مجھے ہندوؤں نے یہ ملازمت دے دی

”میری قربانی کا اندازہ کرو زرد! میں نے اپنی جوانی کی انگلیں قربان کر دیں تھیں۔ ان کی میں نے راتیں تنہا گزاری ہیں۔ تم جیسی حسین لڑکیوں نے مجھے محبت کے پیغام دیئے۔“
راجا کیوں نے میرے جسم پر قبضہ کرنے کے لیے مجھے لالچ دیئے۔ میرے انکار پر مجھے مروا دیئے کی دھکیلاں بھی دیں لیکن میں غور و فکر کے لیے پھرتا رہا۔ لاہور اور پٹنہ میں غزنی کے جو جاسوس ہیں وہ میری کان میں ہیں۔ وہ میرا گروہ تھا جس نے ہندوؤں کی ہر پیش قدمی کی اطلاع سلطان محمود تک اتنی قبل از وقت پہنچائی ہے کہ سلطان نے صلہ کئے کی پیش بندی بھی کر لی اور گھات بھی لگائی

”میں وہ آنکھ ہوں جس سے سلطان محمود غزنی سے دیکھ سکتا ہے کہ لاہور میں کیا ہو رہا ہے۔ میرا گروہ وہ کان میں جن سے سلطان محمود ان گھوڑوں کے ٹاپ بھی سن سکتا ہے۔ جو اُس کی طرف لاہور سے چلتے ہیں۔ میرے گروہ منہ یہاں فوج کی رسد اور مسلمان کا ذخیرہ بھی چھپا رہے۔ اب راجا اندیاں سلطان پر جوانی حملے کی تیاری کر رہا ہے۔ ہم اس کی رسد ایک بار پھر چلانے کی کوشش کریں گے تاکہ سلطان کو تیاری کا وقت مل جائے

”زرد! میں نہیں بتا سکتا کہ میں کتنے دن اور تھیں نظر آتا رہوں گا۔ تم نے اُس آدمی کے ساتھ شادی کی ہے جو جلائی کو مار کے بچے کھڑا ہے۔ میں تمہارے والد کو یہ راز نہیں دے سکتا تھا کیونکہ وہ میرے لیے اچھی تھے۔“

زرد نے اُسے اپنے سینے سے لگایا اور بولی۔ ”آپ نے میری روح کو سرتوں سے سرشار کر دیا ہے۔ مجھے آپ نے روحانی سکون دیا ہے۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ مجھے آپ جہاں بھی استعمال کریں گے، میں ہر شکل میں آپ کے ساتھ ہوں گی۔ آگ لگانے اور آگ میں گود جانے سے بھی نہیں ڈروں گی۔“

”میں مرجان پسند کروں گا، تمہیں کسی شکل میں نہیں ڈالوں گا۔ ارمغانی نے کہا۔ اگر

کچھ لگایا یا مارا گیا تو تمہیں بہت دن پہلے بتا دوں گا کہ تمہیں کہاں جانا ہے۔
 ”مجھے اپنے ایک دوسا بھتیوں کے ٹھکانے بتادیں۔ زرد نے کہا۔ تاکہ آپ زیادہ
 دنوں کے لیے غیر حاضر ہو جائیں تو میں اُن سے معلوم کر لیا کروں۔
 ”ہم نے یہ راز اپنی مادہ کو بھی کبھی نہیں دیے۔ ارمنی نے کہا۔ تمہیں اگر میری
 عزیز حاضر میں یہاں سے غائب کرنے کی ضرورت پڑی تو میرے ساتھی خود اگر تمہیں لے
 جائیں گے۔ اُن کے پاس میری کوئی ایسی نشانی ہوگی جسے دیکھ کر تمہیں اعتبار آجائے
 گا کہ تمہارے ساتھ دھوکہ نہیں ہو رہا۔“

زرد نے جب ایک بلڈ پھر کہا کہ اُسے اپنے ایک یا دو ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے
 بتا دے تو ارمنی نے غصے سے کہا کہ زرد! اپنی زبان سے یہ سوال دھوڑا لیں اس راز
 پر تباہی بخت کو بھی قربان کر سکتا ہوں۔

دو چار دن اندگندہ گئے۔ زرد ارمنی کی بیوی بن کر خوشی سے پھولی نہیں سماں
 تھی۔ لیکن ارمنی نے اُنہیں پر اپنا آپ ظاہر کیا تو وہ سترت سے سرشار رہنے لگی۔
 ایک رات وہ بہت دیر غشی و محبت کے راز دنیا میں گورے۔ ارمنی دن بھر نئے گھوٹلا
 کے ساتھ بھاگ بھاگ کر ٹھکانے سے چور تھا۔ زرد کے ساتھ وہ زیادہ دیر جاگتا رہا اور
 سو گیا۔ زرد کی آنکھ نہ مٹی۔

وہ تھوڑی دیر ارمنی کو دیکھتی رہی اُس کی منہ جب بے ہوشی کی صورت اختیار کر
 گئی تو وہ اٹھی اُٹھ بیٹے پاؤں صحن میں نکل گئی بذرا سکی دیر کھڑی رہی پھر دیوار میں چلی گئی۔
 صدر دروازے کے ساتھ کان لگائے اور صحن میں چلی گئی۔ داخل کر کے میں گئی۔ احاطہ
 کو دیکھ وہ خولنے لے رہا تھا۔ زرد پھر صحن میں چلی گئی۔ وہ بے چین تھی۔ دے پاؤں چلتی
 تھی۔

اُسے مل کی دھیمی سی میاؤں سنائی دیں، باہر بولی تھی پچھت پر۔ زرد دبے
 پاؤں دیوار میں چلی گئی اور صدر دروازے کی زنجیر کھول دی کھڑا دوسرا کھول کر دیکھا باہر تین
 آدمی کھڑے تھے۔ ایک نے سرگوشی میں پوچھا۔ سورا ہے؟

زرد نے فوراً جواب نہ دیا۔ ذرا سوچ کر بولی۔ ابھی جاگ رہا تھا۔ شاید اب تک
 سو گیا ہو۔ میں دیوار میں سے تیار انتظار کر رہی تھی۔ تم باہر ہی پھرو۔ میں دیکھتی ہوں بیگیا
 ہوا تو اگر دروازہ کھول دوں گی۔“

وہ زنجیر جھاکر تیزی سے اُس کمرے میں گئی جہاں ارمنی گھری نیند سویا ہوا تھا۔
 زرد نے اُسے پھونک کر جگایا وہ ہڑبڑا کر اٹھا کمرے میں داخل رہا تھا۔ ارمنی نے گھبرا کر
 پوچھا کیا بات ہے۔

”زیادہ باتیں کرنے کا وقت نہیں ارمنی!۔ زرد نے بڑی تیزی سے بولتے ہوئے
 کہا۔ بھاگ جاؤ یہاں زیادہ دیر نہ رکتا میں نے تمہیں دھوکا دیا ہے۔ میرا باپ مجھے دھوکے
 کا زلوٹ بنا کر لایا تھا۔ میرا باپ تاجر نہیں۔ راجہ اندیاں کا جاسوس ہے۔ ہم پشاد سے
 نہیں بچتے۔ آئے ہیں۔ ہم مسلمان ہیں تمہارے متعلق کسی نے شک ظاہر کیا تھا کہ تم غریبیوں
 کے جاسوس ہو کر کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ تم سے ایک تو یہ معلوم کرنا تھا کہ تم جاسوس ہو یا نہیں،
 اور اگر ہو تو تمہارے ساتھی کون کون ہیں۔۔۔“

”میرا باپ بھٹنہ سے یہاں آیا تو اسے یہ کام دیا گیا کہ تم سے راز لے۔ وہ پشاد کا تاجر
 بن گیا اور مجھے ساتھ لے آیا۔ اُس نے تمہارا پردہ اٹھانے کی بہت کوشش کی لیکن تم نے راز
 نہ دیا۔ میرے باپ نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مجھے تمہاری بیوی بنا دیا۔ میرے جن آدمی میری
 جوانی کا اثر تو بھرد تھا لیکن میں نے جس طرح تم پر اپنا نشانہ طاری کیا، یہ میرا کمال تھا۔ تم مرد ہو
 اور عورت مرد کی خطرناک کمزوری ہوتی ہے۔ میرا تو کام اسی یہی ہے۔ میں نے تمہارے سینے
 سے راز نکال لیا۔“

شعیب ارمنی مسکود کئے ہوئے آدمی کی طرح اُس رہا تھا۔ باہر ایک بار پھر ملی
 کی میاؤں سنائی دیں۔ زرد اور تیزی سے بولنے لگی۔

”تم جب اپنے کام پر چلے جاتے تھے تو ایک عورت میرے پاس آتی تھی۔ میں اُسے
 بتا کر کرتی تھی کہ راز لیا ہے یا نہیں۔ آخر ایک دن میں نے اُسے بتایا کہ یہ آدمی بڑا خطرناک
 جاسوس ہے۔ مجھے کہہ گیا کہ تمہارے ساتھیوں کے نام اور ٹھکانے معلوم کر دوں۔ تم نے

لائی لای ملا۔ تم نے مجھے روحانی صحبت سے سزا کیا۔ تم نے محبت کا یہ ثبوت دیا کہ اپنا حلقہ
نور اور مجھے اپنا سمجھ کر راز دے دیا۔ میرے اندر اسلام کا جذبہ بیدار ہو گیا۔۔۔
میں نے اپنے باپ کا حکم اس لیے مانا کہ کہیں میں میری ماں گر گئی تھی۔ باپ نے
مجھے باپ کی طرح پالا۔ اس نے مجھے شہزادی بنایا میں جوان ہوئی تو اس کا ہنر بنا جانے حکم
بھی ملا۔ اُس نے میرے ذریعے ہندو حاکموں اور ان کے ذریعے راجہ کی خوشنودی حاصل
کی۔ اُس نے اپنا ایمان بچ ڈالا اور خوب دولت کمائی۔ اُس نے مسلمان ہو کر مسلمانوں کو
ہندوؤں کے ہاتھوں ذلیل و رسوا کرایا۔ میں اسی کو زندگی سمجھتی رہی اگر تم نے مجھ پر جس
دنیا کے درد اڑے کھولے ہیں، اس سے میں ہمیشہ نا آشنا رہی۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ خانہ
کی محبت عورت کی جنت ہے۔۔۔

”میں نے باپ کا حکم پورا کر دیا ہے میں نے درد اڑا کھولنے تک دل میں یہی ارادہ
رکھا جو اٹھا کر تمہیں بکراؤں کی ٹہنیوں درد اڑا کھولا اور ان ٹہنیوں کو دیکھا تو مجھ پر ایسا خوف
طاری ہو گیا جیسے زمینوں میں اسلند چیر کر میرا دل نکال لے جانے کے لیے آئے نمود۔ مجھے
اپنے باپ سے کہیں زیادہ تم عزیز لگے۔ اُن کے لیے میں سب اہل۔ میری درج کو کم کرنے
چاہتا ہے۔ میں نے جھوٹ بولا اور انہیں کہا کہ تم جاگ رہے ہو، ذرا انتظار کرو وہ انتظار
کر رہے ہیں۔ اور چلے جاؤ اور مغالی ایسے سے کوہ جاؤ۔“
”اور تم؟“

”شاید کبھی ملیں۔ زرد نے کہا۔ زندہ رہتے تو ملیں گے۔“

باہر میں آدمی پریشان ہونے لگے تھے۔ ایک نے کہا کہ میں کھوارے چلا جاتا ہوں
مجھے گڑبڑ نظر آرہی ہے۔ وہ اُدھر کو چل پڑا۔

یہ آدمی جب کھوارے گیا تو ار مغالی منڈیر سے اُتر چلا تھا اور دیوار کے ساتھ قافل
جوار تھا۔ بلند کی زیادہ نہیں تھی۔ اُس آدمی نے ار مغالی کو لاکا مارا۔ ار مغالی اُدھر سے کودا
اور دوسری طرف دوڑ پڑا اسے دیکھنے والے نے شور مچایا۔ ار مغالی بھلے بھلے دوڑ رہا تھا۔
دو گھنٹوں میں دو بار اٹھا اور اس کے تعاقب میں تین آدمی تھے۔ اُسے رات کا اندھیرا
فائدہ دے رہا تھا۔

مجھے یہ راز نہ دیا۔ میں نے اپنے باپ کو اطلاع بھیجی کہ یہ راز لینا ناممکن ہے۔ مجھے
اطلاع ملی کہ آج میں جاگتی رہوں۔ باہر کی کسی میاؤں سنائی دے گی تو میں درد اڑا کھول
دون۔ تین آدمی آئیں گے ان میں میرا باپ بھی ہو گا۔ وہ تمہیں کڑ لیں گے۔ اور میں تیار
سیٹنے سے راز نکالنے کے لیے مجھے استعمال کریں گے یا تمہیں اذیتیں دیں گے۔۔۔ مجھ سے
مکھیل سے نہ بچھڑاؤ آگے ہیں۔“

”پھر درد اڑا کھول نہیں کھولا۔ ار مغالی نے پوچھا اور اُچھل کر اٹھا۔ اُس نے کمر سے
تین رکھس ہولی بچھی اٹھا لی اور بولا۔“ جا بدکار! اپنی غصت سے کھینچنے والی اجار اور غم
کو اندر بلا لے۔۔۔ میں خود جا کر درد اڑا کھول رہی ہوں۔ کوکھ میرا شکا کر کس طرح تین آدمیوں
میں سے نکل کر غائب ہوتا ہے۔“

زرد اٹھ کر اُس سے پلٹ گئی۔ ار مغالی میری بات سن کر خدا کے لیے باہر نکل
میری بات سن لو۔

”میںوں آدمی باہر کھڑے بے تاب ہوئے جا رہے تھے۔ ایک نے کہا۔“ اب تک
درد اڑا کھول جانا چاہیے تھا۔“

”لو کی دھوکہ نہ دے جانے۔ ایک اور نے کہا۔“ اس نے اندر سے نگر

کیوں چڑھا دی ہے؟“

”تمہاری بی بی کی غلام ہو گئی ہے۔“ ایک نے زرد کے باپ سے کہا۔ تم بتو

بڑے عقل مند عقل دالے ہو تو فوجوں سے دھوکہ کھایا کرتے ہیں۔“

”ذرا سا اور انتظار کر لو۔ زرد کے باپ نے کہا۔“

اندہ زرد شعیب ار مغالی سے کہہ رہی تھی۔ ”میرا فرض یہی تھا کہ تمہیں کڑ لادتی۔ میں

نے اپنے باپ کا حکم مانا اور اُسے تمہاری دھکی بھکی اصلیت بتادی ہے۔ مگر میں جو

سراپا دھوکہ بن کر آئی تھی، تمہارے مردار جسٹ اور تمہارے اسلامی جذبے کی بکریوں

میں جکڑی گئی۔ مجھے تمہاری بیوی جو بنا گیا تھا، بد فریب تھا لیکن میرے دل نے مجھے مجبور

کر دیا کہ میں ہمیشہ کے لیے تمہاری ہو جاؤں۔ میں کوئی شریف لڑکی نہیں لیکن کچھ جو بلا جہم

”نہیں تو ابھی جوان ہوں۔ سمرتی نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں کبھی یہی کہا کرتی تھی۔“ خادمہ نے کہا۔ ”تم میرے متعلق جانتی ہو گی کہ میں کبھی نکاح نہ تھی۔ تم نے جو شہرہ پایا ہے، وہ میں نے بھی پایا تھا۔ تم جس طرح کسی انسان کو اپنے نہیں بانڈھتی اس طرح میں بھی بڑے بڑے طرح بدل کو دھتکار دیا کرتی تھی۔ مجھے میرے پیشے کی بوڑھی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ کسی کے ساتھ اب شادی کر لو۔ اور یہ پیشہ چھوڑ دو۔ میں بھی بتا رہی طرح کہا کرتی تھی کہ میں تو ابھی جوان ہوں۔۔۔ دیکھ لو آج تہذیبی خادمہ ہوں۔ بہت غور ہوتی ہوں۔ میں نے شادی کی اس وقت سوچی تھی جب میرا جسم ڈھلا پر گیا تھا۔ میری دلہن پرما تھے رگڑنے والوں نے مجھے دھتکار دیا۔ کسی بوڑھے نے بھی مجھے بتول نہ کیا۔“

سمرتی نے پہلی بار محسوس کیا کہ جوانی ڈھلنے والی ہے۔ اس کی خادمہ نے اُسے ایسا ہونک خاکر دکھایا کہ اُس پر تنجید کی طاری ہو گئی۔

باہر کھڑے کے بھونکنے کی آواز آئی، پھر ایسی آوازیں آئیں جیسے کتے نے کسی کو کپڑا ہوا اور اُسے جھنجھوڑا ہوا۔ یہ سمرتی نے حویلی کے لیے کہا تھا۔ رات کو اسے کھول دیا کرتی تھی۔ اُس کی ایسی خوشنک آواز پر سمرتی اور خادمہ باہر کو دوڑ گئیں۔ اُس کا خوشنک آواز کسی آدمی پر چھٹ راتا تھا۔ سمرتی نے دوڑ کر کتے کو کپڑا۔ کتے نے غصے میں اس کے ہاتھ پر بھی پھو مار دیا۔

”کون ہو تم؟“ — اُس نے اس آدمی سے پوچھا جسے کتے نے کپڑا کیا تھا۔ وہ بیٹھ گیا تھا۔

”کوئی چور ڈاکو ہو؟“

”اگر چور ڈاکو ہوتا تو یہاں نہ کھڑا رہتا۔“ اُس آدمی نے کہا۔ ”میرا نام شعیب ارغمان ہے۔“

”گھوڑوں کا استاد؟“

”ہاں سمرتی جی! — ارغمان نے کہا۔

”یہاں کی لینے آئے تھے؟“ سمرتی نے کہا۔ ”اندر چلو۔ اگر تم بھاگے تو جانتے ہو

وہ کھلے علاقے میں جلاگ جاں مکان ایک دوسرے سے الگ الگ تھے۔ ایک حویلی کے ارد گرد فیل تھی اور فیل کے ساتھ چھابڑیاں اور اپنی گھاس تھی۔ وہ فیل کے ساتھ چھٹ کر بیٹھ گیا۔ اُس کے تعاقب میں آنے والے والی رگ گئے اور اصر اور دھر دیکھنے لگے۔ ارغمان بیٹھے بیٹھے سرنگا اور فیل کے پھاٹک تک جا پہنچا۔ وہ پھاٹک کے اندر جا کر فیل کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہ اٹھا نہیں۔ یہ حویلی کا باغیچہ تھا۔

اُسے تلاش کرنے والے پھاٹک تک آئے کسی نے کہا کہ یہاں نہیں ہو سکتا۔ وہ نکلی گیا ہے۔ وہ چلے گئے کچھ دیر بعد ارغمان اٹھا۔ اُس نے دیکھا کہ حویلی کے ایک کمرے میں روشنی ہے۔ اُسے وہاں نہ گیا نہیں چلیے تھا لیکن خطرہ تھا کہ اُسے تلاش کرنے والا ابھی وہاں نہیں گئے ہوں گے۔ وہ بیٹھ گیا۔

اس حویلی سے وہ واقف تھا لیکن یہاں کبھی آیا نہیں تھا۔ راجہ انڈیا کی ایک عاصمہ اور مغنیہ کی حویلی تھی۔ مسلمان تھی لیکن سمرتی کہلاتی تھی۔ اپنے فن اور جہان حسن میں یکساں تھی۔ اپنی صد قیمت جانتی تھی۔ اُس نے راجہ انڈیا سے اپنی یہ شرط منوالی تھی کہ وہ محل میں نہیں رہے گی چنانچہ وہ اس حویلی میں رہتی تھی جس کے آگے جھوٹا سا خوشنما باغیچہ تھا۔ سمرتی ہر رات اور ہر کسی کے لیے ناپچنے والی قاصدہ نہیں تھی۔ اُسے اُس وقت راجہ بلایا کرتا تھا جب کوئی مخصوص مہمان آیا ہوتا تھا۔ وہ اُس نے والی تلی تھی کسی کے ہاتھ نہیں آتی تھی۔

اُس رات جب ارغمان اُس کے باغیچے میں چھپا بیٹھا تھا، وہ دراز پر پہلے راج محل سے آئی تھی۔ کسی دوسری ریاست کا راجہ آیا ہوا تھا۔ وہ لینے کے سامنے بیٹھ کر بیل بیل رہی تھی۔ اُس کی جوانی کے چند دن ہی باقی تھے۔ اُس نے اپنی بوڑھی خادمہ سے کہا۔ ”آج تو تھک گئی ہوں۔“

”قاصدہ جب تھکن محسوس کرے، اُسے شادی کر لینا چاہیے۔“ خادمہ نے اُسے کہا۔ ”لیکن ناپچے گانے والیاں سمجھتی ہیں کہ وہ بداحسین اور جوان نہیں گئی اور ان پر بھنوتے منڈلاتے ہیں گے۔“

کہ اس کاغیجہ کیا ہو گا؟

ارمغانی جب اندر دیکھی تو اُس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں اور ایک ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا۔ کتے نے اُس کی کھال ادا چڑھائی اور ٹانگ پر کاٹا بھی تھا۔

”یہ نہیں مان سکتی کہ تم یہاں چوری کرنے آئے تھے۔“ سمرتی نے کہا۔ ”تم ان لگوں میں سے ہو جو میرے جسم کے ٹیڈالی ہیں، تمہیں میری خوبصورتی اور جوانی یہاں لالائی ہے۔ تم سمجھتے ہو گے کہ میں یہاں اکیلے رہتی ہوں، میرا کتا شیر اور چھپے کو بھی اس باغیچے میں نہیں بٹھرتے۔“ سمرتی نے خاد سے کہا۔ ”اُس کے زخم دھونے کے لیے پانی گرم کرو، صاف کپڑا اور شراب لے آؤ۔ اس کے زخموں پر باندھو، شراب اور جلا ہوا سوت زخم کو بہت جلدی ٹھیک کر دیتا ہے۔“

خاد چلی گئی تو ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔ ”تمہارے کتے نے مجھے تمہارے باغیچے میں پکڑا ہے نا، اس لیے تم مجھے چور کہہ سکتی ہو۔ مجھے بدکار بھی کہہ سکتی ہو جو تمہیں اکیلا جان کر اچھی رات کو آیا ہے۔“ بخور سے سوسمڑی آئیں، اپنے جسٹل اور جوانی پر اتنا زیادہ باز ہے اسے اگر میری آنکھوں سے دیکھو تو اپنے آپ سے نفرت کرنے لگو۔“

”کیا تم مجھ سے نفرت کرنے چوروں کی طرح یہاں آئے ہو؟“

”جیسے میں چاہتا ہوں اور جو مجھے چاہتی ہے، اگر اُسے دیکھ لو تو تم آیتنے میں اپنی صورت دکھنی چھوڑ دو۔“ ارمغانی نے کہا۔ ”دل سے یہ وہم کر میں، تمہاری خاطر آیا ہوں، اور غور کرو کہ تم بہت حسین ہو، نکال دو تم راجہ اندیشہ کی راجکاریلوں سے زیادہ خوبصورت نہیں ہو۔ میں اسیں دھکا دیکھا ہوں۔“

”پھر یہاں کیوں آئے تھے؟“

سمرتی کے ایک ہاتھ کی اُسی طرف کتے نے بچہ مار دیا تھا۔ وہاں سے خون کے دو تین قطرے فرش پر گرے۔ ارمغانی اُس کے سامنے کھڑا تھا، اُس کے خون کے قطرے پہلے ہی گر رہے تھے۔ ارمغانی نے نیچے دیکھا، سمرتی کا خون اُس کے خون کے ساتھ مل گیا تھا۔

”اپنے خون کو دیکھو۔“ ارمغانی نے سمرتی سے کہا۔ ”میرے خون کے ساتھ مل کر اس کا رنگ چمک آیا ہے۔ جانتی ہو کیوں؟.... دونوں خون ایک ہیں، ہم نے اپنے خون کو کبتر، غور اور نگاہ سے بد رنگ کر رکھا ہے۔ یہ اپنے خون سے ملا تو اپنے اصل رنگ میں آ گیا ہے۔... جیران ہو کے سمجھے، دیکھو ارتقاہ! اب میں سمرتی نہیں کہوں گا، تمہارا اصل نام مجھے معلوم نہیں.... میں ہندو نام سے ایک سلمان لڑکی کی تو میں نہیں کہوں گا۔ میں کہہ رہا تھا کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہے اور یہ ان بالوں کا خون ہے جو ایک تھے اور ہو سکتا ہے کہ میرا اور تمہارا خون ایک ہی باپ کا ہو۔“

”تم کوئی پاگل معلوم ہوتے ہو۔“

”تم جانتی ہو میں کون ہوں۔“ ارمغانی نے کہا۔ ”میں تمہیں تمہارے خون کی اہلیت

دکھا رہا ہوں۔ قص اور موسیقی منسا مذہب نہیں جن اور جوانی اور تمہاری آواز کا جادو تمہاری ملکیت نہیں کل پرسوں تم ان سب سے محروم ہو جاؤ گی۔ آج تم مجھے کہہ رہی ہو کہ میں چوروں کی طرح تمہارے گھر میں آیا ہوں، پھر تم دعا کی کرو گی کہ مجھ جیسا کوئی جوان چور دل کی طرح تمہارے گھر میں آئے، مگر کوئی نہیں آئے گا، تم راتوں کو اس کتے کو باندھ کے رکھا کرو گی کہ کوئی تمہارے گھر آئے۔ تم دیکھا کہ اس کتے کے سوا اس گھر میں کوئی نہیں آئے گا.... ایک بلی کرو مجھے پناہ دو۔“

”کیوں؟“ سمرتی نے پوچھا۔ ”کیا کر کے بھاگے ہو؟“

”تمہیں ایک لڑکی کے ایشیا کی کہانی سناؤں گا۔“ ارمغانی نے کہا۔ ”وہ تم سے زیادہ جوان ہے، اُس سے زیادہ حسین ہے، اُس کے حُسن میں وہ جادو پورے جوہن پر ہے، وہ تم گناہچی ہو۔ وہ تم سے زیادہ گناہگار ہے، لیکن اُس نے اپنا گھر جنت میں بنایا ہے.... مجھے پناہ دو، اپنی نوکرائی کو یہاں نہ آنے دینا، اپنے زخم میں خود صاف کر لوں گا۔ اسے کہو کہ کسی کو نہ بتائے کہ میں یہاں ہوں۔“

سمرتی کو خاد پہلے ہی کچھ ایسی باتیں کہہ چکی تھی جن سے اُس کے دل پر بارشہ تھا۔ اب ایک جوان اور دلکش مرد جو اُس کا قیدی اور زخمی تھا، اُسے کہہ رہا تھا کہ اُس کے

حسن و جوانی کا جامہ ختم ہو چکا ہے اس کے دل کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ اس نے خادمہ کو یہ کہہ کر کمرے سے نکال دیا تھا کہ کسی سے ذکر نہ کرے کہ یہاں کوئی آیا تھا۔ سمرتی نے شعیب ارغوانی کے زخم اپنے ہاتھوں شراب سے دھوئے۔ ان پر سفوف اور کورے موت کی راکھ باندھی۔ ٹانگ کے زخم گہرے تھے۔

ارغوانی نے سمرتی کے ہاتھ کا زخم صاف کیا۔ اور اس پر سفوف رکھ کر پٹی باندھی۔ اس دوران ارغوانی اسے زرد کی بات پورے تفصیل سے سنا تا رہا۔ اس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ جھوٹ نہ بولا۔ یہ بھی بتا دیا کہ وہ سلطان محمود کے لیے جاسوسی کرتا ہے۔ اسلام کی عظمت اور ہندوؤں کی اسلام دشمنی کی باتیں کہیں۔ اس نے کہا کہ زرد کو باب نے غلیش اور گناہ میں ڈال کر اسے شہزادی بنایا تھا۔ اس کی فریب کاری کامیاب تھی لیکن روحانی محبت نے اس لڑکی کے سینے میں مسلمان لڑکی کو جگا دیا تو اس نے اسلام کیا کہ خدا کا دل جیت لیا۔

”کھنڈ سمرتی نے عجیب سے لمحے میں کہا۔ آج رات کانچر کا علاج کیا ہوا ہے۔ مجھے اسی کے لیے بلایا گیا تھا۔ راجا انند پال نے اسے میرے متعلق بتایا تھا کہ یہ مسلمان ہے اور میری بڑی ہی عزیز اور قریبی رفاہ۔ کانچر کے راجہ نے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں، اسے اٹوا کر اسے رفاہ یا فاختہ بنا دیتا ہوں۔ مسلمانوں کی نسل ختم کرنے کا یہاں میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے، اور اگر آپ بھی طریقہ اختیار کریں تو آپ دیکھیں گے کہ ہمارے ملک میں جو مسلمان رہ جائیں گے، ان کا پیشہ ناتج گانا اور عصمت فروشی ہو گا۔“

سمرتی نے ارغوانی کو راجہ کا لڑکی یہ بات سنائی تو اس کی آنکھیں پھر گئیں۔ ارغوانی نے اس کے اندر احساس بیدار کر دیا تھا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ وہ مسلمان ہے۔ ارغوانی نے اس کی یہ بات سنی تو اس نے ایسی باتیں کہیں جنہوں نے غلطی پر تھیل کا کام کیا۔

”میں مسلمان پلیٹیوں کی عصمت پر قربان ہو رہا ہوں۔“ ارغوانی نے کہا۔ ”غزنی سے اتنی دُور اگر شہید ہونے والے تم جیسی پلیٹیں اور پہنوں کی عصمت کی خاطر شہید ہوئے ہیں، تم کھلونے ہو اور یہ کھلونہ پرانا ہو رہا ہے۔ زردین جاف اپنی رُوح کو بچاؤ۔“

یہ رفاہ ایسی صورت حال سے کبھی دوچار نہیں ہوتی تھی۔ اسے ایسی کڑی دینی

کلی باتیں کسی نے کبھی نہیں کہی تھیں۔ اسے اس کے حُسن و جوانی اور قریبی غلیش کرنے والے ملا کرتے تھے۔ اب اس کے اندر ایک انکشاف ابھرنے لگا۔ تم بھی فریب ہو اور تبار سے چاہتے والے بھی فریب ہیں؟

”زرد کو شاید میں نے دیکھا ہے۔“ سمرتی نے کہا۔ اگر وہی ہے تو بہت خوبصورت لڑکی ہے۔ تم اسے چاہتے ہو؟

”میری رُوح اسے چاہتی ہے۔“ ارغوانی نے کہا۔ ”تم نے اس محبت کا ذائقہ نہیں چکھا۔“

”اگر میں نہیں پناہ دوں تو.... تو مجھے اس محبت کے ذائقے سے سرتار کر سکتے ہو؟“ سمرتی نے کہا۔ میرے اندر معلوم نہیں کیا ہونے لگا ہے جیسے زمین زلزلے سے ہل رہی ہو۔“

”مجھے بھائی بنا سکتی ہو؟“ ارغوانی نے کہا۔ ”رُوح کو سرتار کرنا ہے تو دل میں ہن کا رخمیدار کرو۔“

”تم میری پناہ میں رہو گے ارغوانی! لیکن.... وہ کہتے کہتے رک گئی۔ اچانک اس نے ارغوانی کے گال اپنے ہاتھوں کے برابر میں تھا لیے اور اس کی آنکھوں میں آنسو گئے۔

”قد زے لڑنی ہوئی اور زمین بولی۔ میرے سامنے زرد کا نام نہ لینا.... ہاں تم ٹھیک کہتے ہو کہ وہ تہاری بہن نہیں لیکن تم اس کی خاطر مجھے دھوکہ دے گے۔“ اس نے ارغوانی کے گال چھوڑ دیے اور ان ہاتھوں سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے۔

”تم تو راجوں مہاراجوں اور بادشاہوں کے دلوں پر حکومت کرتی ہو اب مجھ سے یہ ڈر کیوں؟“

”میں نہیں بنا سکتی۔“ سمرتی نے کہا۔ ”میں نہیں جانتی کیا جواب دوں.... تم میری پناہ میں ہو۔ میری ملکیت ہو.... ہم.... ہم اب.... میں نہیں سمجھ سکتی کہ کیا کہوں.... ہم ایک ہیں۔“ اس نے فرش پر دیکھ کر کہا۔ ہلا خون ایک ہے۔ تم نے میری آنکھوں میں وہ روشنی بیدار کر دی ہے جو ابے خون کو بچان لیش ہے.... سو جاؤ.... ارغوانی! سو جاؤ۔ زخم ٹھیک ہونے تک نہیں کھڑے کوئی نہیں آئے گا؟

پنڈت رادھا کشن کو اطلاع ملی تو اُس نے نیچے پیغام بھیجا کہ وہ راجہ کے استقبال کے لیے شام کے بعد نیچے آئے گا۔

وہ شام کے بعد نیچے آیا تو راجہ اندپال نے اُسکے براہ کراں کے پائل جھوٹے اور لالچہ اپنی آنکھوں سے لگائے پنڈت کو شک ہوئے لگا جیسے جنگ نہیں کی مہاراجہ کا محل ہے۔ اوپر شامیانے اور ارد گرد خوشنما کپڑے کی تہا میں تھیں۔ فالووس اور مشعلیں جل رہی تھیں۔ قایلین بکھے ہوئے اور گاؤں کے گئے ہوئے تھے۔ پنڈت بیٹھا ہی تھا کہ پہلے چار لکھوں نے رقص شروع کیا۔

رقص کے دوران پنڈت نے راجہ سے کہا: آپ شاید وہ راجہ اندپال نہیں ہیں! جن کے باپ نے اور آپ نے بھی مسلمانوں سے بڑے شکستیں کھائی ہیں۔ آپ کے باپ نے خود کشی کر لی تھی اور آپ شاید بھاگ گئے تھے! ... اگر آپ دی ہیں تو آپ کی شکست کی وجہ یہ ہے جو آپ مجھے خوش کرنے کے لیے دکھا رہے ہیں میں نے سنا ہے کہ ہمارے بہادر اپنے میدان جنگ میں بھی اسی شان و شوکت سے جایا کرتے ہیں۔

”ہمارا ج۔“ راجہ اندپال نے کہا۔ ”میرے سے پہلے ہم دل سلا دے کا بندوبست ساتھ رکھتے ہیں۔“

”مگر آپ مرے نہیں۔“ پنڈت نے کہا۔ ”اتنی باریک شکست کھا کر بھی آپ زندہ ہیں، اور آپ صرف اس لیے زندہ ہیں کہ اپنی بہشت خود بنا کر اسی میں رہنا پسند کرتے ہیں۔ میں نے آپ کو اسی لیے بلایا ہے کہ آپ کو بتاؤں کہ آپ کی شکست کی وجہ کیا ہے۔ جسم کی لذت اور سرور حاصل کرنے والوں کا انجام یہی ہوا کرتا ہے۔“

اتنے میں رنگیاں رقص کرتی ہوئی لوں ایک طرف کو غائب ہو گئیں جیسے ہوا میں بترتی ہوئیں تحلیل ہو گئی ہوں۔ ساندوں کی دھن بیل گئی۔ نئی دھن کا تاثر ایسا تھا کہ پنڈت بھی چونک اٹھا۔ ایک طرف سے سختی توں آئی جیسے جل پری پانی میں تیرتی آہری ہو۔ وہ پنڈت کے قریب آگئی۔ اُس کے ہونٹوں پر مخمور سا قسم تھا۔ اُس نے ہم کو ناگ کی طرح بل دے کہ پنڈت کو جھٹک کر سلام کیا۔ فالووس کی روشنی میں سرتی لاکھن سمرانگیز ہو گیا تھا۔ راجہ اندپال نے پنڈت رادھا کشن کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے پنڈت سحر ہوا جا

شعبہ اسماعیلی کو تلاش کرنے والے مالوس ہو کر اُس کے گھر چلے گئے ہندو پر دستک دی تو ہندو نے دھواڑہ کھولا۔ اُس کے باپ نے اس سے پوچھا کہ وہ محل کس طرح گیا ہے۔

”وہ جاگ رہا تھا۔ زرد نے کہا۔ تم لوگ بار بار ملی کی آواز نکالتے تھے۔ میں نہیں خاموش کرنے کو آئی تو اُس نے دیکھ لیا۔ وہ بہت چالاک اور عقل مند آدمی ہے۔ اُس نے مجھ سے کچھ بھی نہ کہا۔ دوڑ کر چھت پر چلا گیا۔ پھر مجھے تم میں سے کسی کا شور سنانی دیا۔ یہ سب تمہاری غلطی ہے۔ مجھے اتنے دن اُس کی بیوی بنائے رکھا اور حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔“

پھر شہر میں اور گرد و نواح میں اُس کی تلاش شروع ہو گئی۔ چار بار پنج دن گزر گئے۔ ہر مسلمان گھر کی تلاش اس طرح کی گئی کہ جانوروں کی کھوپڑیوں میں سے چارہ بھی اٹھا کر دیکھا گیا۔ اسماعیلی کی اس نہیں شک بھی نہ لی۔

مگر کوٹ کے پنڈت رادھا کشن کو اطلاع ملی کہ راجہ اندپال لاہور واپس آ گیا ہے تو اُس نے راجہ کو مگر کوٹ بلا بھیجا۔ قاصد کے آتے ہی اندپال نے تیاری اور فوری روانگی کا حکم دے دیا۔ دوسرے راجوں کی طرح وہ بھی مگر کوٹ کے مندر کا احترام کرتا اور وہاں کے ہر حکم کی تعمیل کرتا تھا لیکن اب اُس کی ضرورت مختلف تھی۔ وہ پنڈت کے حکم سے دوسرے راجوں سے بہت سی فوجی مدد لینا چاہتا تھا مگر سلطان محمود کو فیصلہ کن شکست دی جانی تھی۔

وہ ہمارا جوں والی شان و شوکت سے مگر کوٹ گیا۔ اُس کے ساتھ ایک قاصد تھا۔ جس میں اُس کا محافظہ دہ تھلا دس بارہ پالکیاں تھیں جن میں سے ایک میں اُس کی عزیز ترین تنقارہ سرتی تھی اور باقی پالکیوں میں اُس کی اپنی اور سرتی کی خدامائیں تھیں۔ سرتی اپنی بڑھاپی غلام کو اپنے گھر چھوڑ آئی تھی اور کھیتی سے کرائی تھی کہ اسماعیلی کو ایک راز کی طرح چھپتے رکھے۔ اُس کے ساتھ جو خدامائیں تھیں، وہ جوان لڑکیاں تھیں۔ قاصد میں رنگر ہزوری سامان کے چمچروں کے علاوہ سازندہ بھی تھے۔ راجہ نے مگر کوٹ میں مندر والی پیادہ کی دامن میں ایک سرسبز اور خوشنما جگہ کیپ لگایا۔ وہ چارپایہ دونوں کے سفر کے بعد رات پہنچا تھا۔ اس سے تھکن نے اُسے اُسی دقت اور مندر میں نہ جانے دیا۔

ماتہ جو۔

سمرتی کا جسم ہوا میں چھوٹی، پھولوں سے لدی ہونے والی کی طرح ساندوں کی بھرکتی ہوئی پیرسوز نے پرجھوٹے رنگا تو پنڈت نے راجہ اندھیال سے پوچھا "ہندو یا مسلمان؟" "مسلمان!۔" راجہ اندھیال نے جواب دیا۔ "اس پیشے میں ہم صرف مسلمان لڑکیوں کو لے لے ہیں۔"

"اگر اس رقاہ کو ہم اپنے منہ کی ترنگی بنالیں تو آپ اسے ہمارے حوالے کر دیں گے؟" "اس کی بجائے ہمارا ج مجھ سے ایک سو لڑکیاں لے لیں۔" راجہ اندھیال نے کہا۔ "یہ رقاہ مجھے اپنی جان سے زیادہ پیاری ہے۔"

"میں بھی مننا چاہتا تھا۔" پنڈت نے کہا۔ "میں اسے اپنے لیے نہیں لے جا رہا۔" "میں ہندو میں کسی داسی کو بھی نہیں رکھتا۔" ترنگی (رقاہ) کو کہوں رکھوں گا؟..... اسے کبھی بھگوان کے چہرے (قدموں) میں قربان کرنا ہے۔" "قربان کرنا ہے؟۔" راجہ نے ہلک کر پوچھا۔

"ان راجہ اندھیال نے پنڈت سے کہا۔ "یہ خواہش میری نہیں ہے یہ دیوتاؤں کا انتخاب ہے۔ یہ رقاہ انہوں نے مانگی ہے۔"

"ہم لاہور میں مذکر لڑکیوں کی جان کی قربانی دے چکے ہیں۔"

"ادھر آپ نے دونوں اثر شکست کھائی۔" پنڈت نے کہا۔ "کیونکہ آپ کے بندوں نے ان لڑکیوں کو ناپاک کر کے ذبح کیا تھا۔.... مجھے غصہ۔" جس کشمیری کا اشارہ ملا تھا کہ قربانی اس لڑکی کے بچہ رقص میں بے مثال ہو جس میں بے مثال ہو، بوڑھی نہ ہونے لڑکیوں بھی نہ ہو، ادھر وہ جس کے پاس ہوا ہے اتنی عزیز ہو کہ کسی قیمت پر کسی کو دینے پر رضا مند نہ ہو سکے۔ میں بہت عرصے سے ایسی رقاہ کو ڈھونڈ رہا تھا۔ مجھے مل گئی ہے۔ میں ہندو دھرم کی فتح چاہتا ہوں میں نہیں دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کی فکر میں ہوں۔"

راجہ اندھیال بنگر گٹ کے پنڈت کی حکم عدولی سنیں کر سکتا تھا۔ پنڈت نے اس کے ساتھ سلطان محمود پر حملے کی اور ہندو تان سے مسلمانوں کو نکالنے کی دبی باتیں کیں جو وہ بہت دن پہلے دوسرے بہاراجوں سے کر چکا تھا۔ اسے بھی پنڈت نے وہی مشورہ دیا کہ مسلمانوں

کو پشاور سے آگے جہاں راجہ بھوپال نے شکست کھائی تھی، بلا کار واد اسے شکست دے کر لنگھان کے مسلہ کرہ میں گھس جاؤ۔ آگے غزنی ہے۔ غزنی کی سلطنت کو ہماری فوجوں سے بھانے والا کوئی نہ ہو گا۔

"بھیرہ اور لغمان کا کیا ہے گا؟۔" راجہ اندھیال نے پوچھا۔

"دو دونوں شہروں کی مسلمان فوج ہماری قیدی ہوگی۔" پنڈت نے ان سے آپہلے جائیں۔ راگ رنگ کو بھول کر گنجی تار کی کرس۔ تمام ریاستوں کی فوج آپ کے پاس لے کر پہنچ رہی ہے۔"

اگلے روز راجہ اندھیال ادھر گیا اور منہ میں پوچھا پٹ کر کے جائیں آگیا۔ سمرتی کو پنڈت رات کو ہی لے گیا تھا۔ راجہ اندھیال اسے دیکھ بھی نہ سکا۔

پنڈت رادھاکش سمرتی کو بہاڑی پر منہ میں لے گیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلی جا رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے ذبح کر کے اس کے خون سے پشہراری کے بٹ کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔ اسے جب پنڈت نے غلے کے ایک کمرے میں لے گیا جہاں فرش پر قالین اور قالین پر بستر بچھا ہوا تھا تو مرنے لے پنڈت سے پوچھا کہ اسے یہاں کیوں لایا گیا ہے۔

"کیا تمہیں ہمارے ساتھ آنا اچھا نہیں لگا؟۔" رات نے پوچھا اور کہا۔ "بھٹو تو سی۔" پنڈت مسکراتے لگا۔

سمرتی نے بیٹھ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آہستہ سے کھینچا۔ پنڈت اس کے پاس بیٹھ گیا۔ سمرتی نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے ہونٹوں پر ہنس آگیا۔ پنڈت کے جسم نے جھرجھری لی مرنے لگا۔ "بہاراج نے میرے رقص کی قدم سنیں کی.... ابھی آپ نے میرا رقص دیکھا ہے، آواز سنیں گی مگر آپ کو میرا جسم اچھا لگا ہے؟" "اے!۔" پنڈت نے سفید سے لہجے میں کہا۔ "تم تو کچھ اور ہی سمجھ بیٹھی ہو مجھے تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے بہت خالی رہی

ہے اور خالی ہی رہے گی۔

”کیوں؟“

”بچہ ہم تو عورت کو قریب سے دیکھتا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔ پنڈت نے کہا۔

”پھر آج یہ گناہ کیسے کر بیٹھے؟“

”ابھی جواب نہیں دے سکتا۔ پنڈت نے کہا۔ دل سے وہ دہم نکال دو جو تم نے

میرے ساتھ اس کرنے میں اکر پیدا کر لیا ہے۔ ہمیں تمہارے جسم کے ساتھ ذرا سی بھی دیکھی نہیں۔ ہم نے ابھی کچھ نہ پوچھا۔ ہم تمہیں دیوی کا درجہ دیں گے۔ تمہیں گنگا جل میں منائیں گے۔ تمہارے سارے باپ چھڑ جائیں گے۔“

سمرتی کی ہنسی نکل گئی۔ وہ کچھ دیر ہنسی ہی رہی اور پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ وہ بچوں کی طرح ہنسنے ہنسنے اس طرح لڑھک گئی کہ اُس کا سر پنڈت کی گود میں جا گیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور بہت ملائم تھے۔ بالوں میں ایسا عطر لگا گیا تھا جو مباراجوں کے لیے تیار کیا جاتا تھا اور مباراجے یہ اپنی خاص قسم کی عورتوں کو لگایا کرتے تھے۔ اس کی بڑ میں مدہوشی کا اثر تھا۔ اس اثر کے ساتھ سمرتی کے ریشمی بالوں اور عریاں کندھوں کے نس کا اثر شامل ہوا تو پنڈت کا جسم بڑی زور سے کانپا۔ اُس نے عورت کو اتنی قریب سے کبھی دیکھا بھی نہیں تھا مگر تہذیب کا ایک شاہکار اس کی گود میں آکر گرا تھا۔

”اٹھو نہ نکلی!۔ پنڈت نے اسے ہاتھ لگائے بغیر کہا۔ اٹھو اور بتاؤ کوئی نہ کیوں ہنس رہی ہو۔“

سمرتی کوئی شریف عورت نہیں تھی۔ جبوں سے کھیل جاتی تھیں۔ وہ اٹھنے کی بجائے پیٹھ کے بل ہو گئی اور سر پنڈت کی گود میں رہنے دیا۔ اس نے اوپر دیکھا اور بچوں کی خوشی سے بولی۔ ”آپ مجھے گنگا جل میں منا کر میرے باپ دھوڑا لیں گے؟“ نہیں... آپ نے غلط کہہ دیا۔ کہنا یوں چاہیے کہ میں گنگا میں اتروں گی تو گنگا کے باپ رہ جائیں گے۔“

پنڈت نے اُسے اٹھانے کی کوشش نہ کی۔ سمرتی ناگن کی طرح بل کھا کر اٹھی اور پنڈت کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولی۔ ”میں کچھ بھی نہیں آپ مجھے یہاں کیوں لاتے ہیں... مجھے پاک کرنے۔“ وہ اچانک سفید ہو گئی اور بولی میرے

باپ اس روز بھلیں گے جس روز ان تمام بچیوں کو آپ گنگا میں ڈبو دیں گے جنہوں نے میرے جسم کو کھلو نہ بنایا ہے۔ کیا آپ کا بھگوان ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا؟... اور پنڈت جی ہر راج امیر کوئی مذہب نہیں۔ میرا کوئی مذہب رہنے نہیں دیا گیا۔ مجھے تھوڑے دن جوئے پتہ چلا ہے کہ میرے اندر جو روح ہے وہ پاک ہے اور یہ روح اُس انسان کے انتقال میں میرے جسم کے تحریے میں تڑپ رہی ہے جو اسے سچا پیار دے گا۔“

”تم یہ بھی جانتی ہو گی کہ وہ کون ہے؟“

”وہ آپ بھی ہو سکتے ہیں۔“ سمرتی نے کہا۔ ”وہ کوئی آپ سے زیادہ بوڑھا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی کچھ سے زیادہ جوان بھی ہو سکتا ہے۔ وہ کوئی ریشمی بلور کوئی مولوی بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے وہ کسی کٹیا میں رہتا ہو۔ وہ کسی محل کا لاسی بھی ہو سکتا ہے۔ کیا آپ کے پاس گنگا جل میں دھلا ہوا پیار نہیں ہے؟“

پنڈت یوں چونکا جیسے اُسے کبھی سنے بڑے پیارے خواب سے بیدار کر دیا ہو۔ وہ جو دعویٰ کرتا تھا کہ اُس کی زندگی عورت سے خالی رہی ہے اور خالی رہے گی، سمرتی کے ریشمی بالوں میں الجھ گیا تھا، یا اُس کے جسم، یا اس کے سر آگئیں پچھریں، یا اس کی باتوں میں۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا۔ وہ کھیلنی سی ہنسی اس پر ادا و قد رے ہلکا کر بولا۔

”کیوں نہیں... ایک بچہ اسی سے تمہیں باپ نہیں پیار ملے گا۔“

”اگر آپ مجھے وہ پیار دے دیں جس کی میری روح پیاسی ہے تو میں آپ کے بتوں کے آگے وہ رقص کروں گی کہ یہ پتھر بھی تھکے گئیں گے اور آپ کے جس بت کے ہونٹوں کے ساتھ ہنسی لگی ہوئی ہے، اس ہنسی سے وہ نہ بھوٹ اٹھے گا جو آپ کو مدہوش کر دے گا۔ دُور دُور سے لوگ نگر کوٹ کی نہری کاڑھیک اُڑھیں دیکھنے آکر ہوں گے۔ لوگ کٹن بھگوان کی بجائے نگر کوٹ کی نہری کی پرارتھا کیا کریں گے۔“

پنڈت اٹھا اور یوں کمرے میں بیٹھنے لگا کہ اُس کا سر جھکا ہوا تھا۔ سمرتی اسے دیکھ رہی تھی۔ پنڈت کوٹا تھا۔ اسے دیکھا تھا اور شہلے لگتا تھا۔

”مباراج کے پاس صبح جاؤں گی؟“ سمرتی نے پوچھا۔

”اگر میں تمہیں مدارج انند پال سے ملنے کے لیے مانگ لوں تو کیا کہو گی؟“

راجہ انڈیال لاہور چلا گیا۔ اُس کے دل پر بوجھ سا تھا۔ سمرتی کے ساتھ اسے پیار تھا اور یہ پیار اُس کے فن کی بدولت تھا۔ بلکہ یہ فن کیا پیار تھا۔ دوسری کی بجائے ایک سوچیں کنواریاں قربان کرنے کو تیار تھا مگر بندت نے سمرتی کو ہی قربانی کے قابل سمجھا۔۔۔ راجہ زیادہ دل پریشان نہ رہ سکا کیونکہ دوسری ریاستوں کی فوجیں لاہور میں آنے لگی تھیں۔ ان میں قندھار اور اجیر کی فوجیں تھیں۔ کالجی کی فوج کو لاہور بھیجنے کی بجائے پشاور کی طرف روانہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے کمانڈر کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دیپائے سندھ پار کریں۔ اپنی طرف سے کئی رے سے دغیمہ زنی ہو جائیں۔

یہ ۸۰۰ کے سادون بھادوں کے دن تھے۔ دینا چڑھتے ہوئے تھے۔ فوجوں کی نقل و حرکت میں خاصی دشواری پیش آئی تھی۔ دریا پار کرنے بہت مشکل تھے۔ کشتیوں کے پل بنے تھے۔ سیلاب آجاتا اور پل ٹیکار ہو جاتے تھے لیکن اتنی بڑی فوج کو مجبورہ میدان جنگ کے قریب جم گا۔ کب پہنچانے کے لیے ہینسل جتنا وقت درکار تھا۔ دسواؤں ہوسا مان پہنچانا بھی آسان نہیں تھا۔ ہند کے راجے سلطان محمود کو اتنی ہمت نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ اپنی فوج کی کمی کو پورا کر لے۔

مورخ کہتے ہیں کہ لاہور فوجی کمپ بن گیا تھا۔ فوج کی کیفیت یہ تھی کہ اس کی
نفری بڑھتی جا رہی تھی۔ ایک لویا سٹوں کے دستے آ رہے تھے اور دوسرے یہ کہ غیر فوجی
ہندو جوان جو تیس زنی، تیرا اندازی اور گھڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ جوق بہ

ایک روز اُسے ویدیاؤں نے اطلاع دی کہ حضور کے قریب کالج کی فوج بیٹھے
گلاز دی ہے۔ اس پر اُسے اور زیادہ فکر پیدا ہوا۔ دو بجھا کہ ہندو تین محاذ کھولیں گے۔
بھڑہ اور عثمان کے محاصرے اور اُسے پشاور روکے رکھنے کے لیے ادھر بھی حملہ کریں
گئے۔ یہ سلطان کے بس کی بات نہیں تھی کہ تینوں محاذوں پر اڑنا اور فتح بھی حاصل کرتا۔
پھر ایک روز یوں ہوا کہ ہند کی متحدہ فوج سیلاب کی طرح جل پڑی۔ اس کا رخ
پشاور کی طرف تھا۔ لاہور اور گردنواج کے ہندوؤں نے فوجوں کو دریائے رادی

سلطان نے اُسی وقت بھیرہ، اتمان اور غزنی کو تاحد اس پیام کے ساتھ دھڑا دیئے
مرد خود بے ہوش دے سے ہر جگہ سے بٹا اور بھائیوں اور بیٹھدی بہت تیز ہو۔ سلطان کو
کی کیفیت یہ ہوگی کہ غنہ سائے رکھ کر اس میں غرق ہو جاتا اور اُسے کھلے پیئے اور سونے کی
بھی ہوش نہیں رہتی تھی۔ اُس کی انگلی لٹختے پر طبعی رشتی اور وہ لٹختے سائے میں گن رہتا۔

شعب ارغمانی ابھی سمرق کے گھر میں تھا جب راجہ انند پال نگر کوٹ سے لاہور
والیں آیا تھا۔ سر آئی خادمہ نے اُسے بتایا کہ راجہ تو آگیا ہے، سمرتی نہیں آئی۔ دو تین روز
بعد خادمہ نے بتایا کہ راجہ کی راجہ کے ساتھ گئی تھیں، وہ بتائی ہیں کہ راجہ کی نگر کوٹ
کا بندت سمرتی کو اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ وہ مند سے دایں نہیں آئی تھی۔ دوسرے
دن راجہ وہاں سے چل پڑا تھا۔

ارغمانی سوچنے لگا کہ سمرتی کیسے نہیں آئی۔ شاید نگر کوٹ کے بندت کو وہ اتنی اچھی
لگی ہو کہ اس نے اسے اپنے پاس رکھ لیا ہو۔ اس بندت کی فرمائش کو کوئی زیادہ مال نہیں سکتا تھا۔
بڑھاپا خادمہ کو سمرتی سے اتنا پیار تھا کہ دل دہان سے اُس کی وفادار تھی۔ اس نے
سمرتی کی خواہش کے مطابق ارغمانی کو قسمی راز کی طرح چھپا کر رکھا تھا اور ہر روز اُس
کے انجمنوں کا ہم سفر ہی کرتی تھی۔ رنج ٹھیک ہوتے جا رہے تھے۔ شعب ارغمانی گرفتاری سے
بیکار کیا تھا۔ اُسے بے باہر بھی لگتی تھی۔ اُس کا مسرت تھا۔ اُسے وہاں سے نکل جانا چاہیے تھا
مگر اُس کے لیے زبرد ایک جذباتی مسئلہ بن گئی تھی۔ اس نے شادی نہیں کی تھی۔ تو عورت
کو وہ اپنے خفیہ فرائض کی راہ میں رکاوٹ سمجھتا تھا۔ زبرد اس زندگی میں آئی تو وہ اپنے جذبات
کا غلام ہو گیا۔ وہ زبرد کو حاصل کرنے کی سوچ رہا تھا۔

اُس نے اپنے آپ کو یہ فریب بھی دیا کہ زبرد نے اُس کے ساتھ جوشہان کی تھی وہ
دھوکہ تھا، مگر اُس کا دل اس جواز کو قبول نہیں کرتا تھا۔ اُسے یہ خیال آجائے کہ زبرد نے
اُسے دل دہان سے غافلہ تسلیم کر لیا تھا اور یہ اُس کی محبت کا ثبوت ہے کہ اُس
نے اُسے گرفتار ہونے سے بچالیا تھا۔ مگر زبرد اُسے کہاں بل سکتی تھی؟
سمرتی کی خادمہ اُس کے اس راز سے واقف نہیں تھی، اس لیے وہ اس بڑھاپے

اس طرح پار کر دیا جیسے ہر ایک سپاہی کو کندھوں پر اٹھا کر پار کر دیا ہو۔ دریا میں طغیان
تھی کشتیوں کے دوئل بنائے گئے تھے۔ طغیان کشتیوں کو اچھالتی تھی لیکن لوگوں نے
رستے اپنے ہاتھوں اتنے موٹے اور اتنے مضبوط بنائے تھے کہ کشتیاں ایک دوسری
سے ٹک نہیں ہوتی تھیں۔ مسلسل تین دن اور تین راتیں فوج دیا پار کرتی رہی۔ زبرد سے
لدی ہوئی بیل گاڑیوں کو لوگ دھکیلتے تھے تاکہ بیل ٹھک نہ جائیں اور تر چلیں۔
جب یہ اطلاع سلطان محمود غزنوی کوئی کہ تمام فوج لاہور سے بٹاؤ کی سمت نکل آئی
ہے تو اُسے اس اطلاع پر یقین نہ آیا۔ اُس نے بھیرہ کو اپنے جاسوس مسافروں کے بھیجے
میں بھیجے یہ سکن نہیں تھا کہ ہند بھیرہ اور اتمان کو نظر انداز کئے رکھتے۔ بہت دنوں بعد اُس
کے جاسوسوں نے تصدیق کر دی کہ بھیرہ اور اتمان کی طرف ہندوؤں کی کوئی فوج نہیں اور
تمام افواج بٹاؤ کی سمت آ رہی ہیں۔

”دشمن کے لیے غزنی بھیرہ اور اتمان سے زیادہ کم ہے۔“ سلطان محمود نے اپنے
سالاروں و فوج سے کہا۔ ”میں یہ سمجھا ہوں کہ ہند کی متحدہ فوج بٹاؤ کے اس میلان میں آکر
رہے گی جس میں بے پال نے ہم سے شکست کھائی تھی۔ وہ اپنی تمام فوج اس لیے لاہور
ہی لا رہے ہیں کہ وہیں ٹپکتے ہوئے غزنی کی طرف نکل جائیں۔ اگر دشمن نے یہی سوچا ہے تو
میں یہ منصوبہ بنانے والوں کو تعریف کرتا ہوں۔ اتنی بڑی فوج کے زور پر وہ اتنا اچھا منصوبہ
بنا سکتے ہیں۔“

”اللہ کے علاوہ ہماری مدد کرنے والا دریا ہے۔ منہ ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے
کہ دشمن دریا عبور نہ کر سکے۔ اس کے لیے ہمیں ایسے جانیازوں کی ضرورت ہے کہ اگر دشمن رات
کو کشتیوں کا پل بنائے تو جانیاز جاکر رستے کاٹ دیں۔ دود مار تیر اندازوں کی بھی ضرورت
ہے۔ اگر پل سے گزرتے ہوئے کسی ایک ہاتھی کو دھکیں تیرکاری لگ گئے تو وہ پل سے
کسی کو گزند نہ نہیں دے گا۔“

لیکن اتنی بڑی فوج کو ان طریقوں سے نہیں روکا جاسکے گا۔ دشمن کی فوج اُس وقت
نیپال پہنچے گی جب سردیوں کا موسم شروع ہو چکا ہو گا اور دریا میں پانی کم ہو گا۔ ہم دشمن
کو دریا کے پار روکیں گے۔ ہمیں زندگی اور موت کا مکر کرنا پڑے گا۔

زور فکھ سمرتی مقامہ کے گھر سے نکلتی نہیں جانتی تھی شعیب ارغمان اُسے بہت دنوں بعد نظر آیا تھا۔ یہ تو اُسے یقین تھا کہ ارغمانی پڑا نہیں گیا اور وہ شہر سے نکل گیا ہے۔ لیکن اُسے یہ بھی یقین تھا کہ ارغمانی اب اُسے کبھی نہیں ملے گا۔ وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس تھا۔ لاجو میں اُسے پہچان لیا گیا تھا۔ اب اُسے کبھی بھی اُدھر نہیں آتا تھا۔ زور ارغمانی کی زندگی میں بڑا حسین دھوکہ بن کر آئی تھی اور یہ دھوکہ کامیاب تھا۔ اس دھوکے نے وہ قسم توڑ دی تھی جو ارغمانی نے قرآن پر اٹھ رکھ کر کھائی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے کسی جاسوس سا بھتی کارزار فاش نہیں کرے گا۔

اُس نے زور کے جن کے ظلم میں آکر اپنا راز فاش کر دیا لیکن یہ قرآن کا ہی کرشمہ تھا کہ زور ارغمانی کو پھانسنے کے لیے پھندہ بن کر آیا، کبھی جس میں وہ خود بھی پھنس گئی اور پھنسی بھی ایسی کہ ارغمانی کو اُس نے اس سے نکال دیا اور خود پھنسنے سے ہولناک ہو گئی۔ یہ اُس محبت کی بھرپور تھی جو اُسے کبھی سے نہیں ملی تھی جب اُسے ملی تو یہ چلا کہ اُس کی روح کیسے ظالم پیاس سے طعنی رہی ہے۔ ارغمانی اُسے سمرتی کے گھر میں چھپا ہوا مل گیا۔ سمرتی کی خادمہ زور کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔ ارغمانی اور زور نے تو زور کو خواب کا دھوکہ دیا لیکن وہ زیادہ دیر تک اکیٹھے زور کے کمرے میں سمرتی کی خادمہ زور کی سہیلی کو زیادہ دیر تک دوسرے کمرے میں رکھ نہیں سکتی تھی۔ ارغمانی نے اُسے کہا کہ وہ اُسے کل رات اس گھر سے باہر لے۔ وہ کمرے سے نکل گیا۔

زور اور اُس کے ساتھ آئی ہوئی لڑکی مل گئی۔ خادمہ نے ارغمانی سے پوچھا کہ وہ زور سے جو رہی جیسے کیوں ملا ہے۔ یہ ایک قدسی سوال تھا جو خادمہ کے ذہن میں پیدا ہوا۔ وہ ارغمانی کی ہنر مند تھی لیکن ارغمانی کے اصل راز سے وہ واقف نہیں تھی۔ اُسے سمرتی نے اتنا ہی بتایا تھا کہ ارغمانی کو چھپا کر رکھنا ہے اور اس کے زخموں کا علاج کرنا

یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زور فکھ کی ایک لڑکی کو تلاش کرے۔ ایک ہفتہ تک جگتی سمرتی کے گھر کے سامنے تکی۔ خادمہ دھڑکی گئی کہ سمرتی آئی ہے۔ لیکن اس میں سے دھڑکیاں اُتریں۔ ارغمانی اندر چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ اُس نے دھڑکی کو دیکھا تو اُسے ایسی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ ان دونوں میں ایک زور تھی۔ وہ سمرتی سے ملے آئی تھیں۔ خادمہ انہیں اندر لے آئی۔ ارغمانی دوسری لڑکی کی موجودگی میں نہیں مل سکتا تھا۔ وہ خادمہ کو آواز بھی نہیں دے سکتا تھا۔ سوچ سوچ کر اس نے ایک پھول لٹان فرار پر بھیج دیا۔ خادمہ نے آواز نہ کی تو دھڑکی گئی کہ برتن کھن کوڑ رہا ہے۔ "میں نے تمہیں بلانے کے لیے پھول لٹان بھیج دیا تھا۔ اُس نے خادمہ سے کہا۔" "ان میں زور فکھ کی ایک لڑکی ہے، اُسے اس طرح میرے پاس بھیج دو کہ دوسری کو پتہ نہ چلے۔"

"یہ سمرتی سے ملنے آئی ہیں۔" خادمہ نے کہا۔ "اُن میں معلوم نہیں تھا کہ سمرتی یہاں نہیں ہے۔ وہ جا رہی ہیں۔"

ارغمانی کے اصرار پر خادمہ مان گئی۔ وہ تجربہ کار عورت تھی۔ وہ دوسری لڑکی کو کمرے پہنچانے باہر لے گئی۔ ارغمانی زور کے سامنے آکر گھڑا ہوا۔ زور کی آنکھیں حیرت سے کھلی گئیں۔ وہ دھڑک رہا تھا۔ ارغمانی سے لپٹ گئی۔ بولی "تم ابھی یہی ہو؟ رخمی کیسے ہوئے ہو؟" "اگر دھوکہ دینا ہے تو بتاؤ۔ ارغمانی نے کہا۔ "میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔ تیرا رہے۔" "یہ رکھا ہوا ہوں۔ کہاں جلی سکتی ہو؟" "میں نہیں کیسے یقین دلاؤں کہ دھوکہ نہیں دلاؤں گی۔ زور نے کہا۔ "جہاں کہو ملوں گی۔" "جہاں آجاؤں؟"

"اندر نہیں باہر۔ ارغمانی نے کہا۔" میں اس باغیچے میں چھپا ہوا ہوں گا۔ ہو سکتا ہے کہ تمہیں اندر لے آؤں۔ اور یہ معلوم کرنے کے کوشش کرنا کہ سمرتی کمرے میں کیوں رہ گئی ہے۔ اُس نے پھر یہ احسان کیا ہے کہ مجھے پناہ دی ہے۔ اس چل چلا۔ وہ آ رہی ہے۔"

جاتا تھا وہ قید خانے میں پڑا تھا اور اس رقاصہ نے محبت اور آرزو کو اپنے سینے میں قید کر لیا تھا۔

یہ اُس کے مجروح جذبات کا درد تھا کہ اُس نے سمرتی کے کسے رازِ مفانی کو ایک راز کی طرح اپنے سینے میں ڈال لیا پھر سمرتی ہمارا بھائی پال کے ساتھ مگر کوٹ چلی گئی۔ اتنے دن گزر گئے تھے۔ اُس نے ارغوانی کو چھپا کر رکھا تھا اس وقت وہ درمل اُس محبت کو اپنے بید سے پہنچ رہی تھی جو سمرتی کے دل میں پیدا ہو گئی تھی یہ ارغوانی کی محبت تھی۔ اُس نے سمرتی کی غیر حاضری میں ارغوانی سے پوچھا کہ کس نے کہا کہ وہ کون ہے کہاں سے آیا ہے اور اُسے کہاں جانا ہے۔

اب زندہ اپنی ایک سہیلی کے ساتھ آئی اور ارغوانی نے اُس کے ساتھ علیحدگی میں بات کی تو قدرتی طور پر خادمہ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ وہ زندہ کس طرح جانتا ہے اور ان کے درمیان کیا راز و نیاز ہے۔ ارغوانی کا دماغ تیزی سے سوچنے لگا کہ خادمہ کو بتا دے کہ وہ سلطان محمود غزنوی کا جاسوس اور مفرد ہے!

سوچ سوچ کر اُس نے جواب دیا۔ ”زرد میری بیوی ہے۔“

”پھر یہ پردہ داری کیسی؟“ خادمہ نے پوچھا۔

”تم نے زرد کا جنم دیکھا ہے؟“ ارغوانی کو ایک جھوٹا ہنسی لگا اور بتائیں یہ بھی معلوم ہے کہ زرد کس باپ کی بیٹی ہے؟

”زرد سانپ کی بیٹی ہے۔“ خادمہ نے کہا۔ ”میں اس کے باپ کو جانتی ہوں۔ وہ بے اصول، بے ایمان، بے غیرت اور ذہریلا مسلمان ہے۔ وہ بیٹی کی جوانی اور اس کے جنم سے قبل بونے پر راج دربار کا خاص آدمی بنا ہوا ہے۔“

اور اس باپ کی بیٹی نے جوڑی چھپے میرے ساتھ شادی کر لی تھی۔ ارغوانی نے کہا۔ ”وہ میرے گھر آگئی۔“ اُس کے باپ کو یہ چل گیا۔ تین معلوم ہے کہ جاسوسی کے شکار میں یہاں انسانوں کی کڑھانہ کیسی بے دردی سے ہوئی تھی۔ لوگوں نے فانی و تینوں کی وجہ سے بھی ایک دوسرے کو کڑھایا تھا۔ زرد کے باپ نے ایک اوپنچے رتبے کے

ہے۔ خادمہ خود رقاصہ بن چکی تھی۔ اُس کے جسم کی ہلک ختم ہو گئی اور جب جوانی اُس کے سر میں مقیم سفید بال اور چہرے پر بوتھوں کے دائیں بائیں دو باریک کی گھریں چھوڑ کر رخصت ہو گئی تو راج محل میں اُس کی ضرورت ختم ہو گئی۔ اُس کی اداؤں سے سحر چوہا والوں اور اُس کے جسم کے ساتھ کھیلنے والوں کی نظریں پھر گئیں تو ایک احساسِ زہر کی طرح اُس کی رگ رگ میں بھریا۔ یہ احساس تنہائی کا تھا، کمپرسی کا تھا۔ اُس کے دل میں سچی محبت جاگ رہی تھی جس نے محبت کو جگایا تھا، اُسے ساری عمر کے لیے ہمارا بونے قید خانے میں بند کر دیا گیا تھا کیونکہ وہ سلطان تھا مگر اُس نے اپنی قوم سے بھی غدری کی تھی اور ہمارا بونے بھی دھوکہ دیا تھا یہ تو کسی کو پتہ نہ چل سکا کہ رقاصہ بھی اسی کو چاہتی ہے۔ پتہ چل جاتا تو وہ بھی قید خانے میں لگ سڑ رہی ہوتی۔

وہ کوئی ایسی بوڑھی تو نہیں ہوئی تھی۔ وہ چونکہ رقاصہ بن چکی تھی اس لیے اُس کے چہرے جسم میں پھرتی اور حرکات میں سفیدی تھی شاید اسی کا اثر تھا کہ وہ ذہنی لحاظ سے بھی پھرتی تھی۔ اُس نے جب دیکھا کہ اُس کا قص اب بوڑھا ہو گیا ہے اور اُس کی گھڑتی نے لے لی ہے تو وہ سمرتی کے گھر آگئی۔ سمرتی کے محلے میں اُس کے دل میں یہ عقابت نہیں تھی جو ناپے گانے والوں کے درمیان چوڑا کرتی ہے۔ سمرتی اُسے بہت اچھی لگی تھی۔ سمرتی رقاصہ بھی تھی سفید بھی۔ اُس کے جسم میں بھی جادو تھا، آواز میں بھی خادمہ جوں جوں پرلنی ہوئی گئی، اُس کے دل میں سمرتی کی محبت نکھرتی آئی، پھر وہ وقت آیا کہ سمرتی اس تمام کوجو اُس کی خلوسہ میں، ماں سمجھنے لگی۔ وہ جب قص کو خیر باد کہہ کر سمرتی کے گھر آئی تو سمرتی نے اُسے گلے لگایا اور پیشے کے لیے اپنے پاس رکھ لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پرانی رقاصہ نے اپنے آپ کو سمرتی کی خادمہ کا درجہ دے لیا۔

جب شعیب ارغوانی مفرد جاسوس کی حیثیت سے سمرتی کے باغیچے میں آچھا تو سمرتی کے کتے نے ارغوانی کو بڑی طرح زخمی کر دیا۔ سمرتی ارغوانی کو اندر لے گئی۔ اُس کے زخم دھوئے اور جب اُس نے خادمہ سے کہا کہ اس شخص کو ایک مقدس راز کی طرح چھپا کر رکھنا ہے تو خادمہ نے اُس سے پہلے نہ پوچھا کہ یہ راز کیلئے ہے اور اس راز کا تقدس کیا ہے۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ زخمی سمرتی کے دل میں اتر گیا ہے۔ اُسے اپنی محبت یاد آگئی تھی۔ اُس نے جسے

”کوشش کروں گی“ خادمہ نے کہا۔ میرے تو ہونیس سکنے کے مناراجہ کسی کو سمرتی تھے جس کے طور پر رہے آیا ہو۔ اس واقعہ سے وہ کمی قیمت پر دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔

”میں نے زرد سے کہا تھا کہ معلوم کرے۔“

زندہ نے معلوم کر لیا تھا۔ وہ رات کو آگئی۔ ارغمانی یاغیہ کی فیصل کے باہر اس جگہ انتظار کر رہا تھا۔ مال وہ فراہ کی رات آ کر چھپا تھا۔ بہت انتظار کے بعد زرد آئے۔ ایک ہی سارغمانی نے اسے بتایا کہ اس کے متعلق وہ خادمہ کو کچھ بتا چکا ہے۔ وہ زرد کو اندر لگایا۔ اور نے کتا کھول کر بیٹھے میں چھوڑ دیا۔

خاندان ارغمانی کو پہلی بچہ سرائی کرکٹر کوٹ کے بڑے پنڈت نے سمرتی کو ان کی قربانی کے لیے دیں رکھ لیا ہے۔ دوسری خبر یہ کہ سارا جادہ انڈیا کی فوج اور تین چار اور ریاستوں کی فوجیں جو لاہور میں جمع ہوئی تھیں، پشاور کی طرف کوچ کر گئی ہیں۔ ان کی فتح کے لیے پنڈت نے سمرتی کو دیوتاؤں کے قدموں میں قربان کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

اس وقت تک اس کا خون بہا جا چکا ہوگا۔ خاندان نے کہا۔

شاید ابھی زندہ ہو۔“ خادمہ نے کہا۔ جس رات کو قربانی کے لیے منتخب کرتے ہیں اسے فوراً ذبح نہیں کرتے بلکہ ہمیشہ پنڈت اسے غسل اور عبادت سے پاک کرتے رہتے ہیں۔ اسے لٹا کر دو دایاں کھلاتے ہیں حتیٰ کہ وہ خود گھسنے لگتی ہے کہ کچھ بڑی کے قدموں میں قربان کر دو۔“

”میںوں پر سنا اٹھاری ہو گیا۔“

”سمرتی کے کچھ برجوا احسان کیا ہے یہ ایسا معمول نہیں کہ میں اسے فراموش کروں۔“ ارغمانی نے کہا۔ ”میں گھر کو جاؤں گا اور معلوم کرے گی کہ کوشش کروں گا کہ وہ زندہ رہے۔“

”مگر کوٹ کا مندر اس مکان کی طرح نہیں کہ ایک کمرے سے آخری کمرے تک گھوم جاؤں گے۔“ خادمہ نے کہا۔ ”میں اس مندر میں گئی ہو۔“

اُدی کو یہ جھانر دے کر ساتھ لیا کہ وہ ندف کی شادی اس کے ساتھ کرنے کا اعلان ہونے لگا۔ ایک رات فوج کے تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر انہیں یہ بتایا کہ میں جاسوس ہوں اور میرے گھر چھاپہ ملا۔ یہ زرد بھی جس نے کچھ بچایا اور فرار میں مدد دی۔ اسے بروقت پتہ چل گیا تھا۔ میں گہری نیند سو رہا ہوا تھا۔ اس نے مجھے جگایا اور بتایا کہ میں کس خطرے میں آگیا ہوں۔ اس نے اپنے باپ اور اس کے ساتھیوں کو دھوکا دیا اور میرے لیے موقع پیدا کر دیا کہ میں نکل جاؤں۔ میں اوپر جا کر گھوڑے سے کودا اور بھاگ نکلا۔ وہ میرے تعاقب میں تھے۔ یہاں یاغیہ میں آچھا۔ وہ لوگ تو اس کے غلے گئے، متارے کئے، نے مجھے پکڑ لیا۔ ہتھاری مالکن کو میں نے یہ کہانی سنا لی تو اس کے دل میں جھم پیدا ہو گیا۔ کیا میں نہیں جاسوس نظر آتا ہوں؟

”نہیں۔“ خادمہ نے کہا۔ ”یہ زرد کے باپ کی انتہائی کارروائی ہے۔۔۔ تم اب کیا کرنا چاہتے ہو؟“

”میں اب لاہور میں نہیں رہ سکتا۔“ ارغمانی نے جواب دیا۔ ”اگر زرد کے باپ کے سامنے آگیا تو وہ مجھے گرفتار کر لے گا۔ میں زرد کو ساتھ لے کر پشاور چلا جاؤں گا۔“

”کیا وہ متارے ساتھ جانے کے لیے تیار ہے؟“

”بالکل تیار ہے۔“ شعیب ارغمانی نے جواب دیا۔ ”میں تمہیں اس راز میں بھی شریک کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔ زرد کل شام کے بعد چوری چھپے یہاں آ رہی ہے۔ میں نے یاغیہ میں ایک جھڑیلے کو کہا تھا کہ میں اب میں نے ہتھیار اس میں شریک کر لیا ہے۔ تو کیا تم زندہ کروں گی کہ زرد کو میں اندر لے آؤں، اس میں خطہ یہ ہوگا کہ اس کے تعاقب میں کوئی آگیا تو میں پکڑا جاؤں گا۔“

”تم اسے اندر لے آنا۔“ خادمہ نے کہا۔ ”میں کتا کھلا چھوڑ دوں گی۔ کوئی آگیا تو تم اسے آگے نہیں آئے دے گلا اتنے میں تم ادھر ادھر ہو سکتے ہو۔ زندہ کو چھپانے کی ضرورت نہیں۔ میں کہہ سکتی ہوں کہ سمرتی سے ملنے آئی تھی۔“

”کیا تم معلوم کر سکتی ہو کہ مبارک داپس آگیا ہے تو سمرتی کیوں نہیں آئی؟“ ارغمانی نے پوچھا۔

تھا، لیچھ اپن، جس کی آسمان نے نہ جانے کتنے پانی سردوں کا لوجھ اٹھا رکھا ہے۔ کشن بھگوان کا ایمان کر رہی ہے، وہ کشن بھگوان کے کردہ سے واقف نہیں ان بتوں کو بھتر کستی ہے۔

اُس نے ایک ہاتھ کا گھونر اپنے دوسرے ہاتھ کی پٹھلی میں مارا اور دانت میں لیے۔ اس لیچھ نے ہمارا شریر ناپاک کر دیا ہے۔۔۔ چھی چھی چھی۔۔۔ ہم جھوٹ نہیں کہتے کہ عورت کا جادو انسان کو حیوان بنا دیتا ہے۔ پنڈت بڑا بڑا لگا۔ وہ جو سوچ رہا تھا، وہ اس کی زبان پر انگلیہ خدا کو اپنی آواز سے بولنے لگا۔ اُسے پاک کرنا ہے بہت دن لگیں گے۔ پاک کر کے اس کے خون سے کشن مرادی کے پاؤں دھوئے جائیں گے۔ پنڈت کے ذہن اور دل پر سرتی کا جو ظلم جاری ہو گیا تھا وہ اتر گیا۔ وہ لیٹا اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔

پنڈت رادھا کشن معمول کے مطابق اُس وقت جاگ اٹھا جب سزا بھی تیار تک بھی وہ مندر کی لندی سے اٹھا اور بھجن گنگنا تا بوا سپاڑی کے قریب نیم دائرے میں سستی بول رہا تھا۔ جاہنجا۔ بن گنگا کو گنگا ندی بھی کما کرتے تھے۔ وہ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں جا کھڑا ہوا۔ ہاتھوں سے پانی کے پھینٹے اڑاتے اور بھجن گنگنا تے ہوئے پانی میں بیٹھ گیا۔ آج بھی یہی عہدہ ہے کہ گنگا پانی سارے باب دھو ڈالتا ہے۔ پنڈت پانی میں بیٹھ گیا۔ پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ اُس کا جسم سرد ہوا تو اُس نے محسوس کیا کہ رات اُس کا جسم جلتا رہا ہے۔ یہ آگ سرتی نے لگائی تھی۔ اُس نے تسلیم کر لیا کہ گزشتہ رات اُس کے وہ جذبات بیدار ہو گئے تھے جو وہ سمجھتا تھا کہ مر چکے ہیں۔

بھجن اور پانی اُسے ٹھکانے پہلے آئے اور وہ ہی پنڈت رادھا کشن بن گیا جس نے کسی متعقد عورت کو کہیں اپنے پادشہ بھی چھوئے نہیں دیئے تھے۔ رات اُسے سرتی پر جو غصہ آیا تھا وہ بھی ٹھنڈا ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ سرتی کو پانی بنا لیا ہے۔ وہ بچے پیار کی پیاسی ہے اُس نے کہا تھا۔ مجھے گنگا جاہل ہے دھلا ہوا پیار دے سکتے ہو۔

"نن، دے سکتا ہوں۔ پنڈت نے اپنے آپ سے کہا۔ میں اس رنگی کو گنگا

مسلے میں وہ پنڈت نہیں پتھر تھا۔ وہ اگر اٹھتا تو عورت خدا کی جڑ ہے اور عورت ایسا جادو ہے جو مریخ سوار ہوتا ہے تو وہ کسی کام کا نہیں رہتا اور وہ بدی کے سوا کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اسی نظریے کے تحت پنڈت رادھا کشن نوجوانی میں تاکر الدیا ہو گیا اور ہمالیہ کی اُن برف پوش دلیوں میں چلا گیا تھا جہاں سے گنگا نکلتا ہے۔ اُس نے وہاں پندرہ برس گزارے تھے اور اُس کا من سر گیا اور اُس کے جذبات ہمالیہ کی برف کی طرح سرد ہو گئے۔ تو وہ مگر کوٹ کے مندر میں آ گیا تھا۔ اب اُس کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔ پہلی رات وہ سرتی کو قربانی کے لیے منتخب کر کے اپنے ساتھ مگر کوٹ کے مندر میں لے گیا تو سرتی نے اُس کے ساتھ ایسی باتیں کیں جنہوں نے پنڈت کے وجود کا کوئی ایسا اثر چھڑ دیا جو پنڈت سمجھتا تھا کہ کبھی کا لوٹ چکا ہے۔ وہ سرتی کو کرے میں چھوڑ کر اور یہ کہہ کر چل گیا تھا کہ آرام سے سو جاؤ، ہم صبح آئیں گے اور گنگا کے کنارے چلیں گے۔

پنڈت اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُسے اپنے آپ پر اتنا زیادہ اختیار تھا کہ سونے کے لیے لیٹا تھا لیکن سرتی نے اُس کی آنکھ لگ جایا کرتی تھی۔ اُس کا ذہن کبھی بھٹکا نہیں تھا مگر اُس رات اُسے کوشش کے باوجود مندر میں آ رہی تھی۔ سرتی کی جنسی کا جل ترنگ اُس کے ذہن کے گہرے میں رچ رہا تھا۔ سرتی نے کون کی طرح ہنستے ہنستے سراس کی گود میں پھینک دیا تھا۔ سرتی کے ریشمی بالوں کے کسی کو وہ ابھی تک محسوس کر رہا تھا۔ اُس کا جو عورت کے لمس سے ہنسنے کا اشارہ تھا۔ وہ اس لمس سے ادھر عورت کے وجود کی بو اس سے آزاد ہونے کی کوشش کر رہا تھا مگر اسے آزادی کہیں نظر نہیں آ رہی تھی۔

اُسے سرتی کے الفاظ یاد آ رہے تھے جو اس معاملہ نے بڑے جذباتی لمحے میں کہے تھے۔ اگر آپ مجھے وہ بیادیں جس کی میری روح بیاہی ہے تو میں آپ کے بٹوں کے آگے وہ قبض کرنے کی کوریہ پتھر تھر کے لگیں گے۔ لوگ دُور دور سے مگر کوٹ کی رنگی کا رنگ دیکھنے آ کر رہیں گے۔ لوگ کشن بھگوان کی بجائے مگر کوٹ کی رنگی کی پرارتھا کیا کریں گے؟ پنڈت نے اُن بیلہ ہو گیا جیسے وہ بڑا ہی مندر سپنا دیکھ رہا تھا کہ کسی نے سوتی چھو کر اسے جگایا۔ وہ اس کا خون کھولنے لگا۔ غصے سے اس کی سانسیں دھونکی کی مانند ہونے لگیں۔ وہ اپنے بیٹے اٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ ایک رنگی! بیسلا!

ایک اور بت جس کا نام (دراچھہ)

کی بہت کوشش کی مگر دھند نہ چھٹی، البتہ چہرہ نکھر آیا۔ اس نے غور سے دیکھا۔ یہ چہرہ سرتی کا تھا۔

بیٹی، بہن، ماں۔ پنڈت کے وجود میں سویاں چھنے لگیں۔ اسے اپنا دُور بھٹند کی طرح کھوکھلا اور دیرانی محسوس ہونے لگا۔ اُس نے عمر کے لمبے لمبے بے شمار سال اس خلا کو تنوں اور موتیوں سے بھر کر نے میں گزار دیئے تھے مگر سرتی نے تمام بت اور مورتیاں اٹھا کر بن گنگا میں بہا دیں۔ پنڈت پھر کھوکھلا ہو گیا۔ اُسے قاصد کے روپ میں عورت کے سارے ہی روپ نظر آ گئے۔ نیکی بڑھنے لگی۔ وہ سرتی کو اٹھانے کو بے تاب ہونے لگا۔

وہ ذرا آگے بڑھا تو سرتی کی آنکھ کھل گئی۔ اُس نے پنڈت کو کھڑے دیکھا اور انگڑائی کی پنڈت نے خمی عورت کو کبھی انکڑائی لیتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ اُس کے جسم نے چہرہ نکھری لی۔ اُس پر کبھی ایسی کیفیت طاری ہونے لگی جس سے وہ مآشا تھا۔ اسے سرور سامحوس ہونے لگا اور اس پر خود فراموشی طاری ہو گئی۔

”دن بہت چڑھا آیا ہے۔“ سرتی نے کہا۔ ”آپ رات بھر اکیلا چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟“

”میں اکیلے ڈر آتا تھا؟“

”اُدھ؟“ سرتی نے ہنس کر کہا۔ ”ڈر کی کا، ڈر ایک احساس ہوتا ہے میرے تمام احساس میں چمکے ہیں عورت پرانے مرد سے ڈر کرتی ہے مگر پرانے مرد کے ہاتھوں میں کھینے والی عورت کے دل سے تمام ڈر نکل جایا کرتے ہیں جوٹ جاتے ہیں وہ باقی سفر نڈھ ہو کر طے کیا کرتے ہیں۔ مجھے اب کسی رہزن کا ڈر نہیں۔“

”لیکن اطمینان اور سکون کی ایسی نیند جیسی تندی ہے، وہی سو سکتا ہے جس کی روح مطمئن ہو۔ پنڈت نے کہا۔ ”ایک تنگی کی آتما اتنی شانت نہیں ہوتی چاہیے۔“

”میرے پاس صرف روح رہ گئی ہے۔ جسے آپ آتما کہتے ہیں۔“ سرتی نے کہا۔

”میرا جسم پرایا ہو گیا ہے روح میری ہے یہ شانت ہے، مطمئن ہے۔“

”لیکن کیسے؟“

ہل سے دھلا ہوا پیار دھلا گا۔ پھر میں کش میرا کیسے چرند میں اس کا خون جگر کہہ کر سکوں گا کہ میں نے ایسی عورت قربان کی ہے جسے میں نے پیار دیا تھا۔ یہ قربانی قبول ہو گیا جلدی قبول ہو گئی، غزنی، بلخ، بخارا اور سرخند بھی نہا بھلت میں شامل ہو جائیں گے۔ ہر دور کی گھنٹیاں محسوس غزنی کی مسجدوں میں بھی بجیں گی۔ ہندو دھرم کی فتح اور اسلام کی شکست ہو گی۔ وہ واپس آیا تو سفند کے عبادت گاہ دالے جسے میں چلا گیا وہاں ہندو مرد اور عورتیں عبادت میں مصروف تھیں۔ اُس نے گردی میں سے بن گھٹا کپالی اٹھا پر ڈال کر بت کے برتنوں پر پھرا اور اٹھ چور کر بت کے آگے بچہ کیا۔

اس صبح وہ کچھ زیادہ ہی دیر عبادت میں مصروف رہا۔ کچھ زیادہ ہی گھبرا گیا۔ وہ جب اس خود فراموشی سے بیدار ہوا تو دیکھا کہ وہ دہان اکیلا تھا۔ لوگ پوچھا پٹ کر کے جا چکے تھے۔ سورج طلوع ہو چکا تھا۔ اُسے یاد آ گیا کہ اسے سرتی کو بھی دریا پر لے جانا اور منلانا تھا۔ وہ اٹھا اور اُس کمرے میں چلا گیا جہاں وہ سرتی کو چھوڑ آیا تھا۔ اس نے آہستہ سے دروازہ کھولا۔ سرتی گہری نیند میں تھی۔ پنڈت اندر چلا گیا اور سرتی سے دہمیں قدم ڈر کر گیا جیسے اُسے کسی نے اس کی مرضی کے بغیر روک دیا ہو۔

سرتی نے فکری کی نیند سوئی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر محسوس ہونے کا سانس تھا جیسے وہ کوئی بڑا اچھا خواب دیکھ رہی ہو۔ اُس کے چند ایک بال کھڑک اس کے چہرے پر آگئے تھے۔ سرجھ نکل آیا تھا اور وہ ابھی تک سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت کو خیال آیا کہ گناہ انسان کو اطمینان نہیں دے سکتے۔ یہ عورت تو عبادت کی منکر ہے۔ کیا اس کی روح مطمئن ہے؟ کیا یہ روحان سکون ہے؟ کیا یہ ایسی نیند کی نیند سوئی ہوئی ہے؟

سرتی کو دیکھتے دیکھتے پنڈت رادھا کش کو بے چینی سی محسوس ہونے لگی جو تنگی کی صورت اختیار کر گئی۔ اُس کے سامنے سوئی ہوئی رفاقت معصوم سی بھی بن گئی۔ آنکھیں کھلیں تو سرتی اُسے اُس کے اپنے روپ میں نظر آئی جیسے اس عورت نے اُس کی ماں کی کوکھ سے جنم لیا ہو اور ان کی رگوں میں ایک ہی باپ کا خون رواں دواں ہو۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا اور

اُس کا دہن دُور پیچھے چلا گیا جب وہ اسی طرح بچوں کی طرح سویا کرتا تھا۔ اسے اپنی ماں کا چہرہ یاد آنے لگا مگر چہرہ دھند میں چھپا ہوا تھا۔ اس نے یاد دل کی دھند کو مٹانے

جاتا تھا، اُسے بتایا نہیں جاتا تھا۔ اُسے نشہ آور دوائیاں پلا پلا کر اُس کے ذہن کو مایوس کر دیا جاتا تھا اور اُس کے ذہن میں اپنی باتیں ڈال دی جاتی تھیں۔ پنڈت رادھا مکھن پر سرتی کا سحر طاری ہو گیا تھا جس کے اثر سے اُسے اپنے اوپر قابو اور اختیار نہیں رہا تھا۔

”آپ میرے جسم کی قربانی دینا چاہتے ہیں؟“ سرتی نے کہا۔
 ”لیکن یہ جسم میرا تو نہیں۔ اگر یہ میرا ہی ہے تو یہ کبھی کا قربان ہو چکا ہے۔ روح میری ہے۔ اس کی قربانی دوں مگر یہ آپ کے ہاتھ آئے گی نہیں..... کیا آپ نے کسی کی روح پر کبھی قبضہ کیا ہے؟ آپ کی روح پر کسی کا کبھی قبضہ ہوا ہے؟“

پنڈت اُسے احمقوں کی طرح دیکھ رہا تھا جیسے اُس کے لیے کچھ بھی نہ بڑا ہو۔
 ”آپ پیسے پیار سے آشنا نہیں؟“ سرتی نے کہا۔ میں جانتی ہوں۔ میں مندوں کے اندر کی دنیا کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہاں اس چیز کو اچھا سمجھتے ہیں جو نظر آئے اور جو چھپا جا سکے اسی لیے آپ لوگ اُس جھگڑا کو نہیں مانتے جو نظر نہیں آتا آپ نے نظر آنے والے خدا اپنے ہاتھوں سے بنالیے ہیں آپ جسم کی قربانی دیتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آپ نے ان ہتھوں کو خوش کر لیا ہے۔ اور اب یہ بُت آپ کی ہرملہ پروری کریں گے۔“

”تم مسلمان ہو اس لیے ایسی باتیں کر رہی ہو؟“

”میں کچھ بھی نہیں۔“ سرتی نے کہا۔ ”میرا کوئی مذہب نہیں میں ایک پیاسی روح ہوں۔ روح آپ کی بھی پیاسی ہے۔ آپ کی آنکھیں تیار ہی ہیں میں مردوں کی آنکھوں میں جھانک کر معلوم کر لیا کرتی ہوں کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔“ اُس نے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھا کر کہا۔ ”میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں نہیں جھجکیں نہیں میرے قریب آجائیں۔“ پنڈت بُت بنا رہا۔ سرتی سرک کر اُس کے قریب ہو گئی۔ سرتی نے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں قدام کر اُس کی آنکھوں میں ہاتھیں ڈال دیں۔ پنڈت کا جسم کانپا۔ اُس نے اپنا چہرہ سرتی کے ہاتھوں سے آزاد کر لیا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ جب بولنے لگا تو اُس کی

ہند مذہب کے ماننے ہوئے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ ”سرتی نے کہا۔ ”وہ ایک ہی رٹ لگانے رکھتے ہیں۔ پراگھٹا کرو، آتما شانت ہو جائے گی۔ دنیا کا بوجھ نہ ہو تو آتما شانت ہو جاتی ہے۔ منس کے ہر دے میں مراد کی آتما ہو تو آتما شانت ہو جاتی ہے۔ یہ سب باتیں ہیں پنڈت جی مہاراج! میں نے دوسروں کے گناہوں کا بوجھ اٹھالیا ہے تو میری آتما شانت ہو گئی ہے۔“

یہ سرتی کے لب دلچہ کی بے باکی تھی یا اس کے انداز میں خود اعتمادی تھی یا اس کے سراپا میں کوئی ایسا تاثر تھا کہ پنڈت کے پاؤں اکھڑ گئے۔ سرتی اُس پر غالب آنے لگی۔ اُس کے ذہن میں نیکی اور بدی کا مین اور پاپ کا، جزا اور سزا کا فلسفہ گڈ گڈ ہونے لگا۔ سرتی اُس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کے کندھے عریاں تھے۔ لمبوتری گردن عریاں تھی۔ اُس کے کبھرے کبھرے بال اُس کے کندھے اور گردن کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے۔ پنڈت نے تیگال کی اتنی لمبی عمر میں پہلی بار منسوں کی آواز سنی۔ آسان ہے کہ عورت ایک فتنہ ہے لیکن اس فتنے سے بچنا آسان کام نہیں۔ پنڈت کے اندر ایک کئی مکش شروع ہو گئی جو اُسے بریشان کرنے لگی۔ وہ اپنے آپ سے لڑنے لگھڑانے لگا۔

”آپ چپ کیوں بیٹھیں؟“ سرتی نے مسکرا کر پوچھا۔ ”آپ نے مجھے سارا جاندہ ہال سے لے لیا ہے مگر یہاں لا کر مجھے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ رات آپ نے کہا تھا کہ آپ مجھے پاک کرنا چاہتے ہیں کیا اسی لیے آپ مجھے یہاں لائے ہیں؟ مجھے پاک کر کے آپ کیسے کریں گے؟“
 پنڈت چونک کر بیدار ہو گیا اور اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”ہم ستیس دیوی کے چروں میں قربان کریں گے۔“

پنڈت نے ایسے لہجے میں کہا جسے یہ لسی سعادت ہو جو کسی کی کو نصیب ہوتی ہے۔ سرتی کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہ آئی نہ وہ چونکی نہ بدی۔ اس کی سکرابت بھی نہ غائب ہوئی۔ پنڈت خود چونک اٹھا۔ اُسے یہ راز فاش نہیں کرنا چاہئے تھا۔ جسے قربان کیا۔

ہے لڑکیوں نے اُسے بتایا کہ انہیں حکم ملا ہے کہ وہ اُس کے ساتھ کوئی فالتوبات نہ

کریں۔ اُنہیں اس نے سرتی سے پوچھا کہ وہ کون ہے۔
”میں نگر کوٹ کی لڑکی ہوں۔“ سرتی نے کہا۔ ”مجھے بڑے پنڈت جی مہاراج اس

مند کے لیے لائے ہیں میں یہاں ناچا اور گایا کروں گی۔“

”مہاراج نے کہا تھا کہ تمہارا سبب خیال رکھیں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”مہاراج نے کسی عورت کا اتنا خیال کبھی نہیں رکھا۔“ دوسری لڑکی نے کہا۔ ”وہ
عورتوں کے ساتھ بات نہیں کیا کرتے لیکن تمہارے متعلق وہ ایسی باتیں کرتے تھے جیسے

تم ان کی اپنی بیٹی باہن ہو۔“

”یہ مہاراج کی لوازش ہے۔“ سرتی نے کہا۔ ”وہ مجھے خود سارے مند کی سیر

کرائیں گے میں نے ایسے ہی پوچھا تھا کہ صد دروازہ کہاں ہے؟“

وہ اسی دروازے سے مندر میں آئی تھی لڑکیوں نے اسے صد دروازے تک

کارا تے تا تو وہ کچھ بھی نہ سمجھ سکی ہوائے اس کے کہ وہ کسی رہبر کے بغیر صد دروازے تک نہیں

پہنچ سکے گی۔ اگر وہ صد دروازے سے نکل بھی جائے تو مندر کے ارد گرد قلعہ بھٹا میں نے

لڑکیوں سے بہت کچھ پوچھا۔ انہوں نے کچھ اُسے بتایا کچھ نہ بتایا۔ پنڈت کے متعلق اسے

بتایا گیا کہ عورت کے نام سے بھی دیکتا ہے۔

لڑکیوں کو معلوم نہیں تھا کہ اس رکاوٹ کو قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ انہوں

نے اسے سنا لیا اور وہ کچھ سے پہلے خود لائی تھیں۔ یہ سارہی کی طرح کی ایک سفید چادر

تھی جو سر کی اوڑھنی کے طور پر بھی استعمال ہو سکتی تھی۔ سرتی کے ماتھے پر تنگ لگایا

گیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

پنڈت رادھا کشن کے کمرے میں دو پنڈت اُس کے پاس بیٹھے تھے۔ انہیں

معلوم تھا کہ سرتی کو قربانی کے لیے لایا گیا ہے۔ اسے قربانی کے لیے تیار کرنا انہی کا کام

تھا۔ وہ اپنا عمل شروع کرنا چاہتے تھے کچھ عرصہ پہلے اس علاقے میں قحط آگیا تھا

انہیں بات تھی کیونکہ پیادہ علاقہ ہونے کی وجہ سے یہاں بارش بہت جلدی تھی مگر

اُس سال بارش نہ جوی۔ پولش اور انسان بھوکے مرنے لگے۔ پنڈت رادھا کشن کے کہنے

زبان پہلا رہی تھی۔

”میں تمہارے لیے کپڑے کیسے بنائے پنڈت نے کہا۔“ تم نہالو کھانا بھی آجائے گا۔“

اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

سرتی کی ہنسی نکل گئی۔ اُسے شعیب ارستانی یاد آگیا۔ اُس نے شعیب ارستانی کو بتایا

تھا کہ کالج کے راج نے اُس کی موجودگی میں راجہ اندھیال سے کہا تھا کہ میں مسلمانوں کی جو

خوبصورت لڑکی دیکھتا ہوں اُسے رفاہہ یا فاضلہ بنا دیتا ہوں مسلمانوں کی نسل ختم کرنے

کا اور ان میں بدی پیدا کرنے کا یہی طریقہ ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ ہند میں جو مسلمان

رہ جائیں گے ان کا پیشہ راج گانا اور عصمت بنی رہ جائے گا۔“

سرتی کو یاد آیا کہ ارستانی نے اُسے کہا تھا کہ میں مسلمان بیٹیوں کی عصمت پر قربانی

ہو رہا ہوں۔ غریبے اتنی دُعا کر شہید ہونے والے تم جیسی بیٹیوں اور بہنوں کی عصمت

کی خاطر شہید ہوئے ہیں۔ ارستانی نے اسے کہا تھا۔ ”زندہ جاؤ اپنی روح کو بچاؤ۔“

سرتی نے اپنی روح کو بچا لیا۔ اُسے ارستانی یاد آیا تو اُس کے جذبات کی دنیا

میں ٹپل سی پیا ہو گئی۔ اُسے ارستانی کی باتیں یاد آئے لگیں۔ اُسے جب یہ خیال آیا کہ بھگوان

نرہنچل چکا ہو گا تو اُس نے دل میں کنگ کی محسوس کی۔ ارستانی پہلا مرد تھا جس نے

اس کی پناہ اور اس کی تہ میں ہوتے ہوئے بھی اسے دھکا دیا تھا۔

اس کے اندر ایک غم بیدار ہو گیا۔ ”میں ہندو مذہب کے بتوں کے قدموں میں قربان

نہیں ہوں گی۔“ وہ فرار کے راستے سوچنے لگی۔ ایسی صورت حال سے وہ کبھی دوچار

نہیں ہوتی تھی۔ وہ سپاہی نہیں تھی راجا وہ نہیں تھی۔ وہ شہزادی تھی۔ راجہ کے دل پر

اس نے راج کیا تھا بڑے بڑے جابر مرد اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ فرار اس

کے لیے آسان نہیں تھا۔ لیکن فرار کا ارادہ بخت تھا۔

وہ اٹھنے لگی تھی کہ دو لڑکیاں کمرے میں داخل ہوئیں۔ ایک نے کھانا اٹھا کر کھا

تھا اور دوسری کے ماتھے میں کپڑے تھے۔ وہ لڑکیاں تھیں خوبصورت نہیں تھیں۔

کو جیسے کوئی کم ہی نہیں تھا کہ اُسے ذبح کر دیا جائے گا۔ اُسے افسوس صرف یہ ہو رہا تھا کہ اُسے ہندوؤں نے بے مذہب کیا اور تقاضا کیا کہ ہندوؤں کی ہی فتح کے لیے تریان کی جاری رکھی جائے۔ اُسے پورا پورا یقین تھا کہ مٹی اور پتھر کے بت خدا نہیں ہیں اور فتح اور شکست ان کے ہاتھ میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اہو جو سچا اور واحد خدا ہے، اُس کے حکم کے مطابق انسانی جان کی قربانی بے گناہ کا قتل ہے۔ اور یہ چھوٹے مذہب کی رسم ہے۔

اُسے یاد تھا کہ چند سال پہلے لاہور میں راجہ جے پال کی فتح کے لئے ایک لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ راجہ ایسی شرمناک شکست کھا کر واپس آیا تھا کہ اُس نے چناؤ کھڑے ہو کر اپنے ہاتھوں چناؤ کو آگ لگا دی اور اپنے آپ کو جلا ڈالا تھا۔

سمرتی مرنے سے نہیں ڈرتی تھی لیکن وہ ہندوؤں کے بت کے قدموں میں نہیں مرنے کا چاہتی تھی۔ شعیب ارغوانی نے اُس کی روح کو بیدار کر دیا تھا، مگر وہاں سے فرار ممکن نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ہر لمحہ یہ خطرہ محسوس کرتی تھی کہ کوئی آئے گا اور اُسے گھسیٹ کر بت کے سامنے لے جائے گا اور اُس کی گردن پر چھری پھیر دی جائے گی۔ اُس نے کُن دیکھا تھا کہ پنڈت لوگ عورت کے معاملے میں پاکباز نہیں ہوتے، لیکن لڑکیوں نے اُسے بتایا تھا کہ پنڈت رادھا کشن پاکباز رہتے اور شکی ہے۔ ہر کسی کی زبان پر تھا کہ پنڈت رادھا کشن برہمن ہیں۔

اُسے یاد آیا کہ پہلی رات جب اُسے یہاں لایا گیا تھا تو اُسے شک ہوا تھا کہ پنڈت اُسے اپنے لیے لایا ہے۔ اُس نے اس شک کا اظہار کیا تو پنڈت نے کہا تھا۔
”جیسے تمہارا جسم ضرور اچھا لگا ہے مگر تم غلط سمجھ رہی ہو۔ ہماری زندگی عورت سے ہمیشہ خالی رہی ہے اور خالی ہی رہے گی۔ ہم تو عورت کو قریب سے دیکھنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔“

سمرتی کو یہ بھی خیال آیا تھا کہ اُس نے پنڈت کی آنکھوں میں بے چینی سی دیکھی ہے۔ وہ مردوں کی نظروں کو خوب پچھاتی تھی۔ اُسے اپنے حسن کے ظلم کا بھی احساس تھا۔ اُس نے سوچنا شروع کر دیا اور فرار کا ایک راستہ اُسے نظر آ گیا۔ اُس نے اپنے حسن اور

پیرائے لڑکی کی قربانی دی گئی تھی۔ چند روز زندہ رکھا گیا مگر اُسے جہاں مرنے کو رکھا گیا تھا اس لڑکی کو بھی رکھ کر اُسے قربانی کے لیے تیار کیا گیا تھا۔
”وہ کنواری کی کیا تھی۔“ پنڈت رادھا کشن نے سمرتی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے ہندوؤں سے کہا۔ ”یہ کنواری نہیں راجہ دہار کی شرمیلی ہے۔ کنواری تو ترنم کی مرنے کو پہلے تو ترنم کا بیڑے گا۔ قربانی اسی کی دی جائے گی لیکن بہت دن انتظار کرنا پڑے گا۔ یہ مسلمان ہے۔ اسے ذہنی طور پر پوجا بات پر آمادہ کرنا ہے۔ اس کے بعد اسے قربانی کے لیے تیار کیا جائے گا۔“

”آپ جانتے ہیں میرا راجہ وہیں کو تو ج کد گئی ہیں۔ ایک پنڈت لے گیا۔“
”قربانی لڑائی شروع ہونے سے پہلے ہو جانی چاہیے۔“

پنڈت رادھا کشن نے کہا۔ ”فوجوں کو میدان جنگ تک پہنچنے بہت دن لگیں گے جتنی فوج لگی ہے اس کے مقابلے میں محمود غزنوی کی فوج اتنی کے مقابلے میں لگی ہوئی ہے۔ اسے کل کربھاری فوجیں لڑائی کی طرف نکل جائیں گی۔ اس میں میں بہنیں سے زیادہ عورت گز جائے گا۔ وہ وقت ہو گا جب ہم قربانی دیں گے۔ اُس وقت تک یہ شرمیلی اس قابل ہو جائے گی کہ خود دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر کہے گی کہ میری گردن کاٹ دو۔“
دونوں پنڈت قائل نہیں ہو رہے تھے لیکن پنڈت رادھا کشن قربانی کو منظم کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ اُس نے آخر حکم کے لمحے میں فیصلہ دیا کہ اس عورت کی قربانی کے متعلق وہ کسی بات نہیں سے لگاؤ نہ کرے۔ یہ انتخاب اس کا ہے اور چونکہ اس نے یہ انتخاب دیوتاؤں کے اشارے پر کیا ہے اس لیے وہی بہتر جاتا ہے کہ قربانی کب دی جائے گی۔
پنڈت جب اُسے کھڑے کر چلے گئے تو پنڈت رادھا کشن گہری سوجھ میں کھو گیا۔

سمرتی حیران تھی کہ تین دن آدمی راتیں گدگدی ہیں، اُس کے کمرے میں پنڈت رادھا کشن نہیں آئے۔ وہ لڑکیاں اُس کے لیے کھانا لاتی رہیں اور اُس کی ہر ضرورت پوری کر دیتی رہیں۔ اُس نے انہیں کہا کہ وہ پنڈت جی میرا راجہ کو بھیجیں پنڈت پھر بھی نہ آیا۔ سمرتی

میں کھو گیا۔ وہ تو اس دیوی کے آگے یہ پڑھتا ہے کہ اُن گناہگاروں کی سب سے بڑی کوتاہی ہے کہ اُن کے گناہوں کی عبادت اور دعا میں وہ کمیوں نہیں تھی جو بدھ مت والوں کی تھی۔ اُسے مونوں کی مسکراہٹ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ سرتی کا چہرہ سن گیا اور مونوں کی مسکراہٹ سرتی کا تبسم بن گیا۔ پنڈت اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی زبان سے بھجن عادت کے مطابق پھلتے رہے جیسے ندی آہستہ آہستہ بہتی جا رہی ہو۔

ستمبر ۱۸۰۸ء (۳۹۹ ہجری) کے دن تھے بدھ مت کی فوج سیلاب کی طرح پشاور کی طرف بڑھی جا رہی تھی۔ رنار تیز نہیں کی جاسکتی تھی۔ یہ مختلف ریاستوں کی فوجیں تھیں۔ کالنج کی فوج حضرت کے مقام پر خیمہ زن ہو چکی تھی۔ لاہور سے جو فوجیں چلی تھیں ان میں اندھ پال کی فوج کے علاوہ ادھین، گوالیار اور تونج کی فوجیں تھیں۔ ان میں سے بعض کے دستے ابھی آ رہے تھے۔ جب کسی دستے کی آمد کی اطلاع ملتی تھی پوری فوج زک جاتی تھی۔ ان تمام افواج کی کمان راجہ اندھ پال کے بیٹے برہمن پال کو دی گئی تھی۔ وہ پوری فوج کو یکجا کر کے آگے بڑھنا بہتر سمجھتا تھا۔

رنار دست ہونے کی دوسری وجہ دیا تھے جو چڑھے ہوئے تھے۔ فوجیں تو دیا پار کر لیتی تھیں، رنار کی بل گاڑیاں اوصان کے مونوں کو دیا پار کرنا خاصا دشوار تھا۔ اس متحدہ فوج کی تعداد کم بھی سو درج نے نہیں لکھی۔ اتنا ہی پر چلنا ہے کہ تعداد لاکھوں میں تھی۔ اس کے مقابلے میں شاہرہ سلطان محمود غزنوی کے پاس جو فوج تھی، وہ ہزاروں میں تھی۔ ایک لاکھ بھی نہیں جتنی تھی۔ ہندوؤں کی اتنی زیادہ فوج کو سیلابی دریا پار کرنے کی کئی دن لگ رہے تھے۔ چھوٹی بڑی ندیاں بھی تھیں۔

رفتار دست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ سارے ملک میں مندروں کے ذریعے پر پیگنڈہ کیا گیا تھا کہ مسلمانوں کی فوج سارے ہند کو فتح کرنے کیلئے آ رہی ہے اور یہ فوج مندروں کو سمار کر کے مسجدیں تعمیر کرے گی، جو ان لڑکیوں کو اٹھالے جائے گی اور تمام ہندوؤں کو مسلمان کر لے گی۔ مسلمانوں کے خلاف ایسا خوفناک پروپیگنڈہ کیا گیا تھا کہ متحدہ فوج کے راستے میں لوگ آجاتے اور فوج کو روک لیتے تھے۔ وہ نقدی اور زیورات

کیا آپ اپنے اند کوئی تنگی سی محسوس کرتے ہیں؟
میں جل رہا ہوں لڑکی!۔ پنڈت نے پریشان ہو کر کہا مجھے اور نہ جلاؤ۔
سرتی نے اُس کی باتوں میں یہ تبدیلی دیکھی کہ وہ پہلے اپنے آپ کو ہم کرتا تھا اب نہیں کرتا تھا۔

”مجھے ذبح کرنے سے پہلے اس پیار کا ذائقہ چکھ لیں“۔ سرتی نے کہا۔
”میرا جسم ذبح ہو جائے گا، آپ کی روح قتل ہو جائے گی۔“
پنڈت اکھڑ گیا تھا۔ سوچ میں کھو گیا تھا کبھی سرتی کو دیکھتا کبھی سر جھکا کر

”مجھے کس مفاد پر مان کیا جائے گا؟“۔ سرتی نے پوچھا۔
پنڈت چونک کر زک گیا اور اس طرح بولا جیسے اُس کی زبان سے الفاظ پھسل آئے ہوں۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی نہیں۔“
”آج نہیں تو کل؟“۔ سرتی نے کہا۔

پنڈت نے آہ لی اور سرگوشی میں بولا۔ ”کل بہت دنوں بعد آئے گی۔ کرن جانے کل کیا ہو گا۔“

وہ تیزی سے گھوما اور کمرے سے نکل گیا۔ سرتی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ دو دروازے کو دیکھتی رہی جس میں سے پنڈت نکل گیا تھا لیکن اُس کی نظروں اُس کمرے تک نہ پہنچ سکیں جس میں پنڈت رہتا تھا۔ وہ اُس کمرے میں چلا گیا تھا۔ اُس نے دروازہ بند کر لیا اور بہت سے اٹھوں والی دیوی کی مورتی کے سامنے بیٹھ گیا۔ دیوی مسکرا رہی تھی۔ وہ جب سے بنی تھی مسکرا رہی تھی پنڈت نے پہلی بار اُس کی مسکراہٹ کو غور سے دیکھا۔ اُس کے سینے میں ایسی بے قراری تھی جسے وہ سمجھ نہیں سکتا تھا۔ اُس کا آخری سہارا یہ مورتی اور بت تھے۔ وہ بھجنوں کی زبان میں اپنے کو کھ سکھانے کے آگے بیان کیا کرتا تھا مگر آج اسے پتہ نہیں چل رہا تھا کہ اُس کے جسم میں یہ بے قراری کیسے آگئی ہے۔

اُس نے مونوں کی مسکراہٹ دیکھی اور وہ بھجن لگتا لگتا ہے اس مسکراہٹ

سلطان محمود غزنوی کو اپنی فوج کے جذبے، اپنے ایمان اور اپنے خلہ پر بھروسہ تھا۔ اُس نے اپنی فوج کے کچھ آدمی باہمی گزروں اور مزدوروں کے بھیس میں دہرائے سندھ کے کناروں پر بھیج دیئے اور کچھ چھاپہ مار حضوری بھیجے۔ اُن کے دسے یہ کام تھا کہ اس فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھیں اور اگر یہ فوج کٹھج کر کے دریا کے قریب آئے اور کشتیوں کا پُل بنائے تو پُل کے رستے کاٹ دیئے جائیں اور اگر ممکن ہو سکے تو کشتیوں میں سوراخ کر دیئے جائیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو کٹھج کا حکم دے دیا اور دہرائے سندھ کے کنارے پر آگیا۔ اُس نے فوج کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دو حصوں کو دریا کے پار وجودہ ایک کشتیوں میں پہنچا دیا۔ دو حصوں کو دریا کے دوسرے کنارے پر رکھا۔ کشتیوں کا مضبوط پُل بنا دیا گیا۔ دریا کے پشاور والے کنارے پر کوچ کے جو دو حصے تھے، ان میں سے ایک سوار دستوں پر مشتمل تھا۔ اُسے دریا کے کنارے پر چوکس ہو کر گھونٹے پھرتے رہنا تھا تاکہ دشمن کسی طرف سے دریا پار کرنے کی کوشش کرے تو اسے روکیں۔ یہ گھوڑ سوار تیر انداز تھے۔ دوسرا حصہ محفوظ رکھا تھا۔

اور پھر سلطان کو اطلاع ملی کہ دشمن دریا سے ہندوستان میں داخل ہو گیا۔ ہے یہ اس فوج کا آخری بڑا دھڑ تھا۔ سلطان تھوڑا سا وقت اور حال کر نام نہا تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اُسے کسی طرف سے گھٹک کی توقع تھی۔ اُس نے نشان اور خبر سے جو دستے منگوائے تھے، وہ اُس کے پاس آ گئے تھے۔ اُسے مزید وقت کی ضرورت اس لئے تھی کہ سردیوں کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ سلطان محمود کی خواہش یہ تھی کہ جنگ سردی کے شروع کے وقت شروع ہو اس کی فوج کے سپاہی خنڈ میں لڑ سکتے تھے۔ اُسے معلوم تھا کہ قنوج اور گوالیار وغیرہ کی فوج سردی میں نہیں لڑ سکے گی۔

مہینے سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا تھا۔ سمرتی کا کروہنڑادی کا کرہ بن چکا تھا۔ پنڈت رادھا کشن اُس کے پاس آتا اور ہاتھیں کرتا رہتا تھا۔ اگر کوئی اُسے اس کرے میں دیکھتا تو یقین نہ کرتا کہ یہ ان کا پنڈت رادھا کشن ہے۔ وہ سمرتی کی عمر کا آدمی معلوم ہوتا

پیش کرتے اور اناج اور جانوروں کے لئے دانا چارہ بھی دیتے اور جو جوان آدمی تیغ زنی اور گھوڑ سواری کی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، وہ فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔ ہندوؤں پر مذہب کے حوالے سے اسلام دشمنی کا جنون طاری کر دیا گیا تھا۔

اس طرح یہ فوج تعداد اور رسد کے لحاظ سے بڑھتی اور پھولتی جا رہی تھی۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے کہ ہندوستان نے ایک ہی محاذ پر اتنی زیادہ فوج نہ بھیج سکتی تھی نہ تاریخ نے اُس کے بعد کسی بھی دور میں دکھائی۔ تعداد، اتحاد اور ساز و سامان کے لحاظ سے یہ فوج تمام تر عالم اسلام کو تہ تیغ کرنے کا دعویٰ کر سکتی تھی۔ ہندوستان نے تو اس کے بعد اسلام کے خلاف اتنی بڑی فوج نہ بھیجی، البتہ صلیبی سلام کے خلاف اس سے بھی زیادہ فوج سلطان صلاح الدین ایوبی کے مقابلے میں لائے تھے۔ اس کے بعد سلطان ایوبی کے پوتے الکمال کو شکست دینے کے لئے صلیبی یورپ کے نو لکھوں فوج لائے تھے۔

ہندوؤں کی سندھ افواج بڑھی چلی جا رہی تھیں۔ فوجیوں پر اور شہریوں پر سی ایک دیوانگی طاری تھی۔ ”مسلمانوں کو کھل دو۔ اسلام کو ختم کر دو۔“ اور لوگ اپنا سب کچھ اپنی فوج پر بھجھا کر رہے تھے۔ سلطان محمود غزنوی کو پشاور میں اطلاعاتیں مل رہی تھیں کہ یہ لشکر کہاں تک پہنچا ہے اور وہاں تک اس کی تعداد میں کتنا اضافہ ہو چکا ہے۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہہ دیا تھا کہ دشمن کو دریا پار نہیں کرنے دیا جائے گا۔ اور لڑائی دریا کے پار لڑنی جائے گی۔ سالاروں نے اس خطرے کا اظہار کیا تھا کہ دشمن کی تعداد چونکہ نسبت زیادہ ہے اس لیے دریا کو اپنی پیچھے پیچھے رکھ کر لڑا جائے۔ ضرورت کے مطابق سپاہی بڑی تباہ کن ثابت ہوگی۔

سلطان محمود غزنوی نے انہیں بتلایا تھا کہ انہیں گھوم پھیر کر لڑنا پڑے گا۔ اس کے لیے کھلے میدان کی ضرورت ہے جو دریا کے پار ہے۔ دریا کے پشاور والے کنارے سے آگے علاقہ پہاڑی ہے جہاں چھاپہ مار جنگ نہیں لڑی جاسکے گی۔ دشمن کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ وہ کسی ایک دستے سردار کو بھی پشاور تک پہنچ جائے گا۔ اگر اس نے نہیں پیچھے وکیل دیا تو ہم محفوظ سے اُس کے لئے دریا پار کرنا محال کر دیں گے۔

میں آپ کے پاس نہیں ہوں۔ سمرتی نے کہا۔ آپ نے میرے جسم کے ساتھ کچھ
کا اظہار نہیں کیا۔ میری آتما اسی میں شانت ہو گئی ہے۔ کیا میں اب دیوتاؤں کے
چرنوں میں قربان ہونے کے لیے تیار ہو گئی ہوں؟

”ابھی نہیں۔ پنڈت رادھا کشن نے اداس سے لمحے میں کہا۔
”کیا میں ابھی تک ناپاک ہوں؟“

پنڈت اُسے دیکھا رہا۔ دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ سمرتی
آگے بڑھی اور اُس کا سراپے سینے سے لگایا۔ ساڑھی کے پلو سے اُس کے آنسو پونچھ
ڈالے۔ وہ اُس پر جھکی ہوئی تھی۔ اُس کے کھلے ہوئے نرم دلام ہال پنڈت کے
چہرے پر جا پڑے پنڈت نے ایک ہاتھ اٹھایا۔ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سمرتی کا ایک گال
پنڈت کے سر پر تھا۔ پنڈت کا کانپا ہوا ہاتھ سمرتی کے گھرے بالوں تک گیا اور اُس
نے اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ سمرتی گھبرا گئی۔ پنڈت نے اُسے بھیٹھی ٹھٹھی نظروں سے
دیکھا جیسے اُسے خواب سے بیدار کر دیا گیا ہو۔ وہ سمرتی کو جیسے پچانے کی کوشش کر رہا
تھا۔ جیسے وہ اُس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میرا ہاتھ کس نے اٹھا کر تمہارے بالوں پر رکھ
دیا تھا؟

قلعے کے دروازے کا گھڑیاں بجنے لگا۔ پنڈت رادھا کشن پوری طرح اپنے آپ میں
آگیا۔ یہ گھڑیاں اُس دقت بجا کر تھکا جب کوئی راجہ راجہ آیا کرتا تھا۔ پنڈت قلعے
کے دروازے پر جا کر اُس کا استقبال کیا کرتا تھا۔ اُس نے سمرتی سے کہا کہ کوئی
مہمان آیا ہے، اور وہ کمرے سے نکل گیا۔

راجہ اندیا پال کی بیوی کی سہیلی۔ یہ اندیا پال کے دوسرے بیٹے برہمن پال کی ماں
تھی۔ متحدہ افواج کی کان اسی برہمن پال کو دی گئی تھی، حالانکہ اندیا پال خود ساتھ تھا۔
اُس نے برہمن پال کی ماں کو بتایا تھا کہ راج محل کی سب سے اعلیٰ رتہ کا گورنر کوٹ
کے پنڈت نے انسانی قربانی کے منتخب کر لیا ہے اور اُس نے یقین دلایا ہے کہ

تھا۔ اُس نے سمرتی کے کمرے میں گلدے رکھوا دیئے اور ان پر لٹمی پگنگ پوش
بچھا دیئے تھے۔ بٹی کے دیئے کی جگہ فالوس لگوا دیئے تھے اور لڑکیاں ہر صبح کمرے
میں تازہ پھول رکھ جاتی تھیں۔

دوسرے پنڈتوں کا خیال تھا کہ اُن کا پنڈت سمرتی کو قربانی کے لیے تیار کر
رہا ہے۔ پنڈت رادھا کشن انہیں بتایا بھی یہی کرتا تھا کہ سمرتی قربانی کے لیے تیار ہے
لیکن سمرتی کے پاس ہمارے بھول جایا کرتا تھا کہ اُسے قربانی کے لیے پاک اور تیار
کرنا ہے۔ صرف سمرتی تھی جسے یقین تھا کہ اُسے قربانی کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔
پنڈت نے اُس کے جسم کو کبھی ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ البتہ اُس کے ہونٹ جو ہمیشہ سے
سکڑا ہونٹ سے محروم تھے اب مسکرانے لگے تھے۔ سمرتی کی بعض باتوں سے وہ شش بھی
پشتا تھا۔ سمرتی نے اُسے کئی بار کہا کہ وہ اُسے ایسی ذبح کر دے کہ کوئی موت کا انتظار
ادیتا نہ ہو۔ یس کر رہا پنڈت کا چہرہ اداس ہو جایا کرتا تھا۔

وہ پنڈت جو جتنا تھا کہ اُس نے اپنے آپ کو غورت سے محروم کر کے دیوتاؤں
کی خوشنودی حاصل کر لی ہے، اب اُس کی حالت یہ تھی کہ وہ جیسے دیوتاؤں کو ناراض
کر کے سمرتی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس نے اپنی زندگی میں جو
خلا پیدا کر لیا تھا، وہ سمرتی سے بڑھونے لگا تھا۔ پیاسے کو پانی ملا تو لے محسوس ہوا کہ
وہ پیاس سے جل رہا تھا۔ اُس نے سمرتی کو کبھی بیٹی کے روپ میں دیکھا، کبھی بہن کے روپ
میں اور کبھی اُسے اپنی ماں سمجھا۔ اس مندر میں سمرتی سے زیادہ خوبصورت لڑکیاں آیا
کرتی تھیں۔ پنڈت نے ان کے ساتھ کبھی بات نہیں کی تھی۔ انہیں دیکھ کر وہ لگا میں
پھیر کر رہتا تھا۔ سمرتی پہلی لڑکی تھی جس کی اُس نے باتیں نہیں اور جو اُس کی مرضی کے بغیر
اُس کے سینے سے لگ گئی تھی۔ اس قرب نے اور اس لمس نے پنڈت کے اندر وہ
منشکی بیدار کر دی ہے وہ اپنی عظمت کی علامت سمجھا کرتا تھا۔

”کیا تباری آتما اب بھی اُس پیار کی پیاسی ہے جو تم نے مجھ سے مانگا تھا؟“
ایک روز اُس نے سمرتی سے پوچھا۔

”آپ پہلے مرد ہیں جس نے مجھے اتنی باتیں اپنے پاس رکھا لیکن اس طرح رکھا ہے

فتح برہمن پال کی ہوگی۔

بدزسرتی کو قربان کر دیا جائے گا۔

راجا اندھ پال کی بیوی شاہی مہمان خانے میں چلی گئی۔ پنڈت رادھا کشن سرتی کے کمرے میں چلا گیا۔ سرتی نے نمسکر کر اس کا استقبال کیا۔ پنڈت کا چہرہ اُتر ہوا تھا۔ وہ سرتی کو دیکھتا رہا جب سرتی نے اُس سے پریشانی اور خاموشی کی وجہ پوچھی تو پنڈت نے کہا: میں صبح اتنی جلدی آؤ تھا جب ابھی اندھرا ہو گا۔ ہم دونوں بن گنگا چلیں گے۔ اوروہ کمرے سے نکل گیا۔

قلطے میں دو اپنٹ لٹھے اور تین گھوڑے ایک اونٹ پر ایک جوان لڑکی اور دوسرے پر ایک ادھیر غر غورت سوار تھی۔ گھوڑوں پر مرد سوار تھے۔ وہ ہندو معلوم ہوتے تھے۔ اُن کا طیل اور اُن کا لباس ہندوؤں جیسا تھا۔ ایک کتابھی اُن کے ساتھ تھلا ٹھی زمانے میں قافلہوں کے ساتھ رکھوالی والے کتے لازمی سمجھے جاتے تھے۔ یہ قافلہ لاہور سے چلا تھا اور اُس کی منزل نگر کوٹ تھی۔ راستے میں ان سے جس کسی نے پوچھا انہوں نے یہی بتایا کہ وہ پوجایاٹ کے لیے نگر کوٹ کے مندر میں جا رہے ہیں۔ اب یہ قافلہ نگر کوٹ کے قریب پہنچ گیا تھا۔ اس علاقے میں آکر وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ وہ نگر کوٹ کے بدیشی رادھا کشن کے درشن کرنے اور پادوں چھونے جا رہے ہیں۔ نگر کوٹ کے اراکین کے تمام لوگ پنڈت رادھا کشن کو اوتار مانتے تھے۔

اس قافلے نے نگر کوٹ سے تھوڑی سی دور آخری پڑاؤ کیا۔ رات وہ آگ جلا کر اس کے ارد گرد بیٹھے تو ان میں سے ایک آدمی نے کہا کہ مندر میں داخل ہو گئے اور اگر کسی کو ہم پر شک نہ ہو تو یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ سرتی کہاں ہے۔ اگر وہ قربان ہو چکی ہے تو میں اس مندر کے تمام ہندوؤں کو قتل کر کے یہاں سے نکلوں گا۔

یہ شعیب ارمنانی تھا جو ہندوؤں کے مذہب سے ان کے دم و رواج اور

مندروں کی زبان اور اصطلاحوں سے اچھی طرح واقف تھا۔ اُس نے لاہور سے اپنے دوست ساتھی ساتھ لے لیے تھے۔ زرد سرتی کے گھر میں آگئی تھی۔ سرتی کی خادمہ ساتھ

اس سے پہلے راجا اندھ پال کی دوسری بیوی نے اپنے بیٹے سکھ پال کو جو مسلمان ہو گیا تھا، سلطان کے خلاف اس امید پر باغی کیا تھا کہ وہ بھیرہ کو فتح کر کے سلطان محمود غزنوی کو قیدی بنا لائے گا اور باپ کی گدھی کا جہانیں بنے گا۔ ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ سکھ پال بھیرہ میں سلطان کا قیدی بن گیا اور سلطان نے اُسے عمر بھر کے لیے قید میں ڈال دیا تھا۔ اب اندھ پال کی دوسری بیوی کو ایسی ہی توقع تھی کہ اُس کا بیٹا پشادہ کو فتح کر کے غزنی کو بھی تہ تیغ کر لے گا اور اپنے باپ کی جگہ راج کرے گا۔ دیشنے کی فتح کے لیے بے تاب تھی وہ نگر کوٹ یہ معلوم کرنے آئی تھی کہ سرتی کی قربانی دی جا چکی ہے یا نہیں۔

پنڈت رادھا کشن نے اُسے بتایا کہ چونکہ سرتی رفاہ رہی ہے اور وہ مسلمانوں کے گھر میں پیدا ہوئی تھی، اس لیے اُسے پاک کرتے بہت دن لگ گئے ہیں۔ برہمن پال کی ماں نے اُسے کہہ کر اس سے پہلے بھی جوان لڑکیوں کی قربانی دی جا چکی ہے۔ کسی پرانا زیادہ عرصہ نہیں گیا گیا۔ اُس نے اصرار شروع کر دیا کہ سرتی کی قربانی جلدی دی جائے کیونکہ وہیں میدان جنگ کے قریب پہنچ گئی ہیں۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ اُسے بتایا گیا ہے کہ لڑکی کو ابھی بن گنگا تک بھی نہیں لے جایا گیا۔

پنڈت رادھا کشن کی حیثیت راجوں مہاراجوں سے بہت اونچی تھی اور اُسے تنگوان کا لیمبی سمجھا جاتا تھا۔ سکین انڈیا کی برہمن بے ایسے شک کا اظہار کر دیا جس سے پنڈت کی حیثیت زرا جھٹی رہ گئی۔ اُس نے کہا: سرتی کے جن اند اُس کے جسم میں ایک کشش ہے کہ جو اسے دیکھتا ہے دیکھتا ہی رہ جاتا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ اس کا یہی جادو نگر کوٹ کے مندر پر بھی چل گیا ہے اس کی قربانی تک یہیں رہوں گی۔

پنڈت رادھا کشن نے کچھ بھی نہ کہا۔ شک غلط نہیں تھا۔ اُس نے کہا کہ وہ کل صبح سرتی کو بن گنگا لے جا رہا ہے۔ یہی ایک کام رہ گیا تھا جو کل ہو جائے گا اور اس سے اگلے

اس لیے اُسے کوئی دشواری پیش نہیں آ رہی تھی۔ دشواری سمرتی کے لیے تھی جو دو گھنٹوں والی گھنٹی کی سواری کی علامت تھی۔ اُسے جو چیل پہنانے گئے تھے، اُن سے وہ چل بھی نہیں سکتی تھی۔ پہاڑی سے اُترتے اس کے باؤل بار بار پھلتے تھے۔ پنڈت اُسے سہارا دیتا تھا اور وہ سنبھل جاتی تھی۔ پھر سمرتی نے ایک بازو پنڈت کی کمر کے گرد لپیٹ دیا اور تڑپ لگی۔ پھر بھی اس سے اچھی طرح اُتر نہیں جاتا تھا۔ پنڈت نے بھی بے قابو ہو کر اپنا بازو اُس کے گرد لپیٹ لیا اور اُسے تقریباً اپنے اوپر گرا کر پہاڑی اُترنے لگا۔ موسم سرد تھا سمرتی اُس کے ساتھ جھک گئی۔ وہ پہاڑی سے اُتر آئے اور دریا کی طرف چل پڑے۔ مندر دُور اُپر رہ گیا تھا۔ نیچے نچل اور دیر انداز تھا۔ پنڈت نے سمرتی کو اپنے بازو سے آزاد نہ کیا۔ وہ اسی طرح ایک دوسرے کے ساتھ لگے ہوئے چلتے گئے۔ صبح کا اجالا ٹھہرنے میں ابھی بہت دیر باقی تھی۔ پنڈت سمرتی کو اس لیے اتنی جلدی لے آیا تھا کہ صبح کے وقت دیا پر لوگ آجاتے تھے۔ سمرتی کو چھپا کر رکھتا تھا۔

”کیا آپ مجھے آخری غسل کے لیے جا رہے ہیں؟“ سمرتی نے پوچھا۔

پنڈت نے اس کے سوا کوئی جواب نہ دیا کہ اپنے بازو کا گھیرا قاصد کے گرد اور زیادہ تنگ کر کے اُسے اس طرح اپنے ساتھ لگایا جیسے اُسے اپنے جسم میں جذب کر لینا چاہتا ہو۔

”آپ بولتے کیوں نہیں؟“ سمرتی نے کہا۔ ”مجھ سے آپ کیوں ڈرتے ہیں؟“ مجھے آج سنا رہی ہے تو مجھے بتا دیں۔“

”بتا دوں گا سمرتی! پنڈت نے اُسے اپنے آگے اس طرح کر لیا کہ دونوں کے سینے مل گئے۔“ میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہم دونوں قربان ہو رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے میں آج کا سورج نہیں دیکھ سکوں گا۔“ اُس کی آواز بھرا گئی۔ وہ منہ ہائیں ہوائی آواز میں بولا۔ ”ننگ کی آخری رات ہے۔ مجھے پیسا نہ مرنے دو۔ میں سمجھتا تھا کہ میں اپنا من بازو چکا ہوں۔ میں نہیں مر رہی۔ تم پر ہر روپ چڑھایا ہے۔ بیٹی کا بھی، بہن کا بھی، اماں کا بھی۔ صرف ایک روپ کو چھپانے کے لیے میں نے اپنے آپ کو بہت دھوکے دیئے ہیں۔ میں نے دیولوں کی مورتوں میں تمہاری سکر اٹھیں دیکھی ہیں۔ پانی منہ مانگے میں نہیں سمجھ سکتا

چلنے کو پہلے ہی تیار تھی شعیب ارمخانی اور اُس کے ساتھیوں نے سر ہنڈا کر ہنڈوؤں کی طرح سر کی جوڑیوں پر بویاں رکھ لی تھیں۔ دائرہاں صاف کر کے انگوٹھیں اس طرح بٹھالی تھیں کہ ہنڈوں پر چھریوں کی طرح پڑی ہوں۔ شعیب نے خاصہ اور ہنڈ کو بھی انہوں نے ہنڈوؤں کے چیلے میں چھپا لیا تھا۔ اُن دونوں کے چہرے چھپانے کا نہایت آسان اور کامیاب طریقہ یہ تھا کہ دونوں نے گھونگھٹ لٹکائے تھے۔ یہ ہنڈوؤں کا رواج تھا۔

اونٹوں اور گھوڑوں کا اختتام شعیب کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ یہ خواہش خادمہ کی تھی کہ وہ سکتے کو ساتھ لے چلیں کیونکہ پیچھے اُس کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ سمرتی کا لگا تھا جو اُس سے بہت پیار کرتا تھا۔ رات کو گھر کی رکھوالی کرتا اور سمرتی گھر میں جوتی تو اُس کے ساتھ کھلتا رہتا تھا۔ راستے میں بھی کھٹے کی ضرورت تھی۔

انہوں نے آخری بازو میں سمرتی کو مندر سے نکلانے کے اُن طریقوں پر غور کیا جو وہ سوچ کر آئے تھے۔ انہوں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ اُن کا زندہ واپس آنا محض ہے۔ خادمہ اور ہنڈ نے اپنے ذمے یہ کام لیا تھا کہ سمرتی اگر زندہ ہوئی تو اُس کا سراغ لگالیں گی۔ مندر کے بیویوں کو کہہ دے تھے، ہنڈ خانے میں بھی کمرے تھے اور اہلیاں اور بیٹھیاں تاکیک تھیں اس لیے سمرتی کو ان بھول بھلیوں سے نکلانے کے لیے جان آہیلی پر کھنے کی ضرورت تھی۔ خادمہ نے مردوں کو بتایا تھا کہ یہ بھول بھلیاں کیسی ہیں۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ مندر کے قلعوں میں فوج بھی رہتی تھی۔

ارمخانی اور اُس کے ساتھیوں نے فخر اور فخرنا طواریں پہنے ہوئے کمروں کے اندر بچھالیں اور یہ قافلہ رات کے آخری پہر گھر کوٹ کی طرف روانہ ہوا۔ خادمہ ہر بری کہہ رہی تھی۔ انہیں سحر کی تائیک میں مندر کے دروازے میں پہنچ جانا تھا۔

یہ وہ سحر تھی جب پنڈت راجا کشن نے سمرتی سے کہا تھا کہ اُسے بن گنگا میں نشان کیے لیے جانا ہے۔ پنڈت سمرتی کے کمرے میں گیلہ سمرتی گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ پنڈت نے اُسے جگایا اور کہا کہ وہ اُس کے ساتھ چلے۔ سمرتی خاموشی سے اُس کے ساتھ چل پڑی۔ وہ مندر سے نکلے۔ اُن کے لیے قلعے کا دروازہ کھل گیا۔ باہر اگر وہ پہاڑی سے اُترنے لگے پنڈت تو کئی برسوں سے اس پہاڑی سے اُتر اور چڑھ رہا تھا

کیوں! میں عورت کے وجود سے بہت بھگا ہوں مگر....“

”جھپ پتھر کے بھگوان کو مانتے ہیں۔“ سرتی نے کہا۔ ”میرے خدا کی عبادت کریں۔
میں کے سب باپ جبر جانتے گئے۔“

”مجھے باتوں میں نہ لگاؤ سرتی!۔“ پنڈت نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے
تمہاری نوح کو پیدا کیا ہے۔ اس کے فوض مجھے جسم کا خوار دے دو شاید یہ دل شکلی
زندگی کا آخری دن ہو۔ پھر اس جسم کو جلا دیا جائے گا میں جیسے جی چاہوں۔“

سرتی نے قہقہہ لگایا اور اچٹ کر اس سے الگ ہو گئی۔ بولی۔ ”یرا کش مرانی
تہا ہوتا تو تیری پیاس برسل کی پرارتھنا کو یوں پاب میں ڈوبنے نہ دیتا میں آزاد ہوں۔
میں جانتی تھی تو مجھے ایک دن اپنی نگاہوں سے دیکھنے کا جن سے مجھے پاپوں نے
دیکھا تھا میں نے تیرے اندر اس آگ کو اسی لئے بھڑکایا تھا کہ تو جلتا ہوا میرے
قدوں میں آگھرے اور میں تجھے بھوکے کتے کی طرح اپنے پیچھے پیچھے لگ میں لے
جاؤں اور آزاد ہو جاؤں.... میں آزاد ہوں.... میں آزاد ہوں۔“

وہ ایک طرف دوڑ پڑی لیکن ادب کی نیچ زمین پر وہ تیز دوڑ نہ کی۔ پنڈت نے
اُسے چند قدموں پر پکڑ لیا اور کہتا: ”پاگل نہ بنو سرتی! مجھ سے بھاگ کر کہاں جاؤ گی؟
کہاں بناؤ دھنڈل؟ میں بیتیں پکڑ لوں گا اور ذبح کروں گا۔ میں تم سے کوئی قسمی
چیز نہیں مانگ رہا۔“

سرتی نے اس کے منبر بڑی زور سے پتھر مارا اور بولی: ”میں دیا میں ڈوب
جاؤں گی۔ تیرے بتوں کی بھینٹ نہیں چڑھوں گی۔“

”تجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا سرتی!“ پنڈت نے کہا۔ ”بتوں کی تو میں نہ کر۔“
”مجھے میرا خدا پسائے گا۔“ سرتی نے کہا۔ ”میرا خدا اپنا ہوتا تویر ایک بھی بت
سلامت نہیں رہے گا۔“

پنڈت بھوکا بھیڑیا بن گیا تھا۔ اس کے وجود میں وہ مرد بیدار ہو گیا تھا جسے
وہ سمجھا تھا کہ ہالیس کے دامن میں مارا گیا ہے۔

تب اُسے ایک کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ یہ آواز قریب آ رہی تھی۔

جس وقت مندر کی پہاڑی سے دُور جا کر پنڈت کشن نے کک کر سرتی کو اپنے سینے
سے لگایا تھا، اُس وقت شیب ارمانی کا چھوٹا سا نافہ پڑی کے دامن میں اُس جگہ پہنچا تھا
جہاں سے مندر کا راستہ اوپر جاتا تھا۔ سرتی کی خادمہ اس جگہ سے واقف تھی۔ اُس نے گھونٹے
اور اونٹ میں چھوڑ دیئے تھے۔ سرتی کا کٹھن ہوا تھا وہ زمین کو سونگھ کر بے تابی سے
غزایا، پھر وہی ہی آواز میں بھونکا اور اُس طرف زمین کو سونگھتا ہل پڑا۔ حضرت پنڈت اندر سرتی
مسمے تھے۔ تانھے دامن نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ کتے تو ایسی حرکتیں کیا ہی کرتے
میں۔

کتا دوڑنے لگا اور اُس کی بھونکنے کی آواز بلند اور دُور ہونے لگی۔ خادمہ نے کہا کہ
”کتے کو کسی گیند یا بھیرے کی بو آگئی ہے۔ ان میں سے کوئی تصور میں نہیں لاسکتا تھا کہ
کتا مالک کی بو پر جا رہا ہے۔ اُسے سرتی سے جدا ہونے اور حال میں بیٹنے کی گند سے تھے۔
وہ سرتی کے ساتھ بچوں کی طرح کھیل کرنا تھا۔ اُس کے بستر میں گھس جایا کرتا تھا۔ سرتی اُس
کے ساتھ بچوں کی طرح پیار کیا کرتی تھی۔“

پنڈت نے جب کتے کے بھونکنے کی آواز سنی تو اُس نے پرواز کی۔ وہ بھوکے
بھیرے کی طرح سرتی پر ٹوٹ پڑا تھا اور سرتی اُس سے بچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پنڈت
نے اُسے گرایا اور اُس کی سادھی نوچنے لگا۔ اب سرتی بے بس ہو گئی تھی۔ ایک کتا اُس کے
گرد گھوم کر اپنا منہ اس کے منہ کے قریب لے گیا تو وہ سمجھی کر یہ بھیرا ہے یا مندر کا کتا
ہے۔ وہ کیسے یقین کر سکتی تھی کہ یہ اس کا اپنا کتا ہے۔ کتا اُس کا منہ چاٹنے لگا تو اُسے
کچھ شک ہوا۔ اُس کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”شری اکر لو۔“

کتے نے اگلی ہانگیں اٹھا کر بچے پنڈت کے جسم میں اتار دیئے اور اُس کا ایک
کندھا منہ میں لے لیا۔ اُس نے پنڈت کو بھینچا تو پنڈت چمک کر اٹھا۔ سرتی اُس کے نیچے
سے نکل آئی۔ کتے نے کندھے سے منہ اکھاڑ کر پنڈت کی ران دانتوں کے ٹکسنے میں لے
لی۔ پنڈت نے ایسا دوا دیا کہ کتا دُور دُور تک سالی دیلے پنڈت بھاگا تو کتے نے اُس کی

اُن کا منہ بڑھا دیا تھا۔ اُن کے تعاقب میں کوئی نہیں آ رہا تھا۔ کتے نے نہشت کے کدے اور ناگوں کے گوشت اکھاڑ دیا تھا۔ خون چستے کی طرح نکل رہا تھا۔ وہ مدد کے لئے چیخا چلا، تو کوئی نہ کوئی اُس کی مدد کو پہنچ سکتا تھا۔ ان بھروسے وہ مرنے نہیں سکتا تھا۔ گڑبڑ نے کسی کو مدد کے لیے نہ بلایا۔ اُس نے یہ بھی نہ کیا کہ اُس نے جو چاہا اپنے اوپر لے رکھی تھی، اسے بھار کر زمیں پر باندھ لیتا تاکہ خون نہ نکلتا اور وہ پیاز پر پڑے مندر میں جانے کی بجائے نگر کوٹ گاؤں میں چلا جاتا جو قریب ہی تھا۔

وہ کہیں بھی نہ گیا۔ اُس نے کچھ بھی نہ کیا۔ اُس نے زیر لب کہا: ”اچھا ہوا.... ایسے ہی ہوتا تھا، ہو گیا.... اچھا ہوا“۔ وہ اٹھا اور بن گنگا کی طرف چل پڑا۔ گنگا میرا پیپ نہیں دھو سکے گی.... اس پلک جہم کو آگ بھی پک نہیں کر سکے گی.... من پانی ہر جائے تو حق کو پاپ کرتے در نہیں ملتی.... میں پیدا ہوں۔ بچتا گیا۔ اور اُسے پکائی ہوئی کھانا کھانے کی خوش تیزی سے بہ رہا تھا۔ وہ چند قدم اور چلا اور عجز پڑا۔ اٹھا چلا اور بھر پڑا۔ ”نہاد را در.... مجھے گنگا جل تک پہنچنے دے“

وہ اٹھا تھا اور گرتا تھا۔ وہ پیٹ کے بل ریگنے لگے۔ صبح طلوع ہو رہی تھی گھنٹ کی آنکھوں کے آگے ابھیرا ہوا جا رہا تھا۔ اُسے بن گنگا کی لہروں کی آواز سنانا دینے لگی تھی۔ وہ اد تیزی سے ریگنے لگتا۔ اُسے سرنی کی آواز سنانی دی۔ ”مجھے میرا خدا بچائے گا تیرے بہت تباہ ہوں گے۔“ اُسے اپنی آواز سنانی دی۔ ”عورت ماں بہن بیٹی اور بیوی ہو سکتی ہے۔ اُسے کوئی اور دھوپ دے کر اس کے قریب جاؤ گے تو جل جاؤ گے۔ انجام بہت بُرا ہوگا۔“ وہ مندر میں ہی زٹ لگاے رکھا تھا مگر اس نے خود ہی پاپ کیا کہ سرنی کو وہ دھوپ دیا جو نہ ماں کا تھا، نہ بہن کا، بیٹی کا، بیوی کا۔

اُس کا خون بہہ رہا تھا۔ جسم خالی ہو رہا تھا۔ اور گناہ اُسے دس رہا تھا۔ وہ بن گنگا کے کنارے اس مقام تک ریگنا چلا پہنچ گیا جہاں پانی تنگ تھا اور پانی باہر بھی آ جاتا کرتا تھا۔ اُس پر غشی طاری ہو گئی۔ اُس نے بیہوش ہوتے ہوئے کہا میں پیاسا ہوں.... میں پاپ کا پیاسا تھا۔ بن گنگا کی ایک لہر کنارہ پھلانگ کر آئی اور بیہوش پنڈت کو اپنے ساتھ لے گئی۔

ابھی پھر کڑی سرنی نے چلا کر نہشت سے کہا: ”میں نے تجھے کھا تھا کہ مجھے میرا خدا بچائے گا۔ یہ میرا کتا ہے جو لاہور سے میری بوبک آیا ہے۔“

سرنی نے کتے کو کپڑا لیا۔ پنڈت بھاگ گیا۔ سرنی کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اُس کا کتا کہاں سے آ گیا ہے، کتا اُس کے قدموں میں لوٹ پوٹ ہوا تھا۔ سرنی کو قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ خوف سے کانپنے لگی کہ مندر کے فوجی پنڈت کی مدد کو آ رہے ہیں۔ اُس نے چھپنے کی کوشش کی لیکن اُسے ایک عورت کی آوازیں سنائی دیں۔ ”شری... شری...“ وہ کتے کو بلا رہی تھی۔ آواز سرنی کی خادمہ کی تھی۔ پنڈت کا راولا آتا تھا۔ اُس کا کہنا تھا کہ ابھی سرنی سنائی دیا تھا۔ ارمانی اور اُس کے ساتھیوں نے اُس کے ساتھ کتے کے بھونکنے اور بھونڈنے کی آوازیں بھی سنیں۔ ارمانی کو یاد آ گیا تھا کہ اس کتے نے اُسے بھی بھونچا اور بڑی طرح زخمی کر دیا تھا۔

وہ سب ددڑتے وہاں پہنچے تو سرنی نیم تاریکی میں ابھر اُدھر چھپنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے پہانے میں ذرا وقت محسوس ہوئی۔ سرنی نے جب ارمانی اسیا ہی غار کے پہاں لیا تو اُسے خواب کا دھوکہ ہوا۔ اُس نے بڑی تیزی سے انہیں بتایا کہ وہ اس جگہ تک کس طرح پہنچی ہے۔ ارمانی نے اُسے بتایا کہ وہ کس طرح نگر کوٹ آئے ہیں۔ زیادہ کرنا خطرناک تھا۔ سب وہیں واپس چلے گئے جہاں اونٹ اور گھوڑے کھڑے تھے۔ زرافہ سرنی کو ایک اونٹ پر بٹھایا گیا۔ خادمہ دوسرے اونٹ پر بیٹھی بروگھوڑوں پر سوار ہو گئے اور واپسی کا سفر شروع ہو گیا لیکن اُن کی منزل لاہور نہیں بھیرتی تھی۔ اب ان میں کوئی بھی لاہور نہیں جاسکتا تھا۔ سوائے ارمانی کے وہ ساتھیوں کے۔ لاہور میں ان پر کسی کو شک نہیں تھا کہ وہ ارمانی کے ساتھی ہیں۔

یہ تناظر اب ماکراتے سے بہت کڑھکوں اور یرانوں میں جا رہا تھا۔ سب سے بڑا خطرہ تعاقب کا تھا۔ انہوں نے حساب لگایا کہ پنڈت اوپر جائے گا۔ اطلاع دے گا کہ سرنی بھاگ گئی ہے۔ تعاقب میں آنے والے پہلوی سے سرنی کے اور چند وقت گزر جائے گا۔ اتنے وقت میں اونٹ اور گھوڑے انہیں بہت دور لے جائیں گے۔ اب اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔

مگر کوٹ کے بُت اُس ترنگی کی ماہ دیکھتے سب سے جس کے خون سے اُن کے پاؤں دھلنے لگے۔ مندر اپنے مبارشی پنڈت رادھا کشن کی راہ دیکھتا رہا۔ برہن بال کی لہلہ اُن کے انتظار میں باقی ہوئی ربی دن کے پہلے سپر پنڈت اور سمرتی کی تلاش کئے گئے ہوئے لوگ واپس آ گئے۔ انہوں نے اُس راتے پر خون ہی خون دیکھا جو راتے بن گنگا کو جاتا تھا اُس خون سے کئی کایاں بنیں تیس کے بہت گھوڑے دوڑائے گئے مگر کوئی گھوڑا پنڈت اور مگر کوٹ کی سنگت تک نہ پہنچ سکا۔ ہندوؤں کی عمدہ افواج کے سینا جاتی برہن بال کی ماں دیوی دیوتاؤں کے قبر سے اُڑنے لگی۔

قہر تو سلطان محمود غزنوی پر نازل ہو رہا تھا۔ ہندوستان کی اتنی زیادہ فوج کو وہ تصور میں بھی نہیں لاسکتا تھا۔ یہ افواج جس انداز سے آئی تھیں اُس سے اُن کے کئی دُشمن ہو گئے تھے۔ یہ راجا سلطان محمود سکیم بنیادیے گئے تھے۔ سلطان انہی سے غامد اٹھانے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ موہڑوں نے جن میں سے ایک اگر برسرِ دی۔ اسے ستمہ خاص طہر پر قابل ذکر ہے، ہندوستان کے اس لشکر کی ان خاموشیوں کا جائزہ تفصیل سے لیتے ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی عمدہ ہائی کمانڈ ایک آدمی کے تحت تھی اور یہ آدمی ہر ایک فوج کی فنی اور نفعیائی کیفیت سے ناواقف تھا۔ دوسرے یہ کہ ہائی کمانڈ پر افواج کے کمانڈر کو اکثر افسر تھا۔ اس لیے باہمی تعاون ناقص تھا۔ تیسرے یہ کہ فوج میں ہزار ہا شہری صرف اس لیے شامل کر لیے گئے تھے کہ اُن میں لڑنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ اسلام کے خلاف جذباتی تھے مگر انہوں نے میدانِ جنگ کبھی دیکھا نہیں تھا اور جو تھے یہ کہ ہندوؤں کو اپنی تعداد اور ساز و سامان پر بھروسہ تھا۔

ہندو لشکر کے مورال کو اتنی ہیست وہ بُت اور موتیاں دیتی تھیں جنہیں پنڈت فوجوں کے ساتھ رکھتے اور عبادت اور دعائیں مصروف رہتے تھے۔ مسلمانوں نے یہ مشاہدہ کیا تھا کہ شکست کی صورت میں سب سے پہلے یہ پنڈت بچوں اور موہڑیوں کو پھینک کر بھاگا رتے تھے۔ اُس کے مقابلے میں سلطان کو وہ شکست نفل پر بھروسہ تھا جو وہ ہر لڑائی سے

پہلے میدانِ جنگ میں نہڑا کرتا تھا۔ اُسے اپنی فکری فہم و فراست پر بھروسہ تھا، اور اُسے اپنے اس مقدر پر بھی بھروسہ تھا کہ اللہ کی خوشنودی کے لیے اللہ کی راہ میں لڑنا ہے اور یہ جنگ اُس کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں۔ اب بھی اُس نے اپنے سامنے ہندو لشکر کے پیڑ دیکھے تو اُس نے اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو آخری ہدایات دے کر کہا: ”میں رحیل اکرم صلعم نے تم گنا قوی دشمن کو شکست دی تھی میں اس روایت کو زہم کرنا ہے میں اپنی فوج سے دو چار باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

تھوڑی دیر بعد وہ اپنے گھوڑے پر سوار اپنی فوج سے خطاب کر رہا تھا۔ ”میں نہیں اس خوش منی میں مبتلا نہیں کروں گا کہ فتح تمہاری ہے۔ ہر ایک تمہارے ساتھ ہے۔ ایشوہیکو تم خدا کے ساتھ رہو اور دل میں یہ ایمان تازہ رکھو کہ اسلام کی باریک کاریاں گے اور اپنے بچے مذہب کے کسی دشمن کو زندہ نہیں رہنے دیں گے۔ تمہارے سامنے کھڑے پہاڑ کھڑے ہیں۔ اگر تم نے اپنے مقصد کے بجائے اپنی جان کو عزیز سمجھا تو تمہارے لیے تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہمیں ان پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے۔ اپنی اور اپنے دشمن کی تعداد کو بغور جاؤ۔ جنگ جذبے سے لڑی جاتی ہے۔ خدا تمہارے ساتھ ہے۔ خدا اُسے فتح دے گا جو اُس کا نام روشن کرنے کے لیے فتح کا عزم لے کر لڑتا ہے۔“

سلطان محمود غزنوی فوج کے درجنوں کو اپنی کان میں دریائے سندھ کے پنجاب والے کنارے پہلے گیا اور حضرو کے قریب خیمہ زن ہوا۔ اُس نے دیباؤں کی آنکھوں سے بھی ہندو لشکر کو دیکھا اور اپنی آنکھوں سے بھی۔ اُس نے اپنے سالاروں سے کہا کہ اب ہندو لڑنے کا جذبہ اور فتح کا عزم لے کر آئے ہیں جس بہت محتاط ہو کر لڑنا پڑے گا۔ اُس نے اپنے پلان میں رد و بدل کیا اور چند ایک چھاپہ مار پیش دیا کہ کنارے پر دھڑ بھلا بیٹے۔ وہ دیشا اور اور غزنی کے فلاح کے لیے دیا کلاہ اور استعمال کرنے کی سوچ چکا تھا۔

اُس نے دوسرا اقدام یہ کیا کہ اپنی خیمہ گاہ کے ارد گرد خندق کھدوا دی۔ اُس نے سرچہ بند جو کر لڑنا زیادہ سوزوں سمجھا۔ وہ کچھ اور انتظام بھی سوچ رہا تھا لیکن مزید

زخمی لاشوں کے کیسپ میں خوریز مسکر لڑا ہوا تھا خندق نے گھوڑوں کے لیے پانی بانگ بنادی تھی خوریز یہ تھا کہ دشمن مزید قتل سے حلقہ کرے گا اور ایک گھنٹے کے اندر جنگ کا فیصلہ دشمن کے حق میں ہو جائے گا سلطان کیسپ میں پھنس گیا تھا اور وہ سپاہیوں کی طرح لڑا تھا اس نے اپنے ٹروپس کو جس طرح ڈیپلائے کر رکھا تھا اُسے اس کا اثر ملنے لگا۔ وہ اس طرح کہ مشہور سالار عبداللہ الطائی چھ ہزار عربی نسل کے گھوڑوں کو تیار رکھے ہوئے تھا جو اس نے گھوڑوں کے خلاف استعمال نہ کیے۔

کچھ دیر بعد گھوڑوں کا صفیا شروع ہو گیا۔ دو کم بھی رہ گئے اور ٹھک بھی گئے تھے۔ خندق میں گرتے تو مسلمان تیرا تیرا زوں اور بلیم بازوں کا شکار ہو جاتے راجہ انند پال نے یہ مصدب حال دیکھی تو اس نے نہایت اعلیٰ فیصلہ کیا مسلمانوں کو سنبھلے کا موقع نہ دینے کے لیے اس نے حملے کا حکم دے دیا مسلمانوں کے کیسپ کی کیمپ کو وہ اچھی طرح سنیں سمجھ سکتا تھا وہاں اب گھڑ کٹ رہے تھے اور مسلمان کاٹ رہے تھے۔ راجہ انند پال نے فتح یقینی سمجھ کر اپنے ہاتھی کو آگے رکھا اپنا جھنڈا اور ادھنیا کیا اور بڑے بولنے کے لہزار سے حملہ کر دیا۔

سلطان کے سالار عبداللہ الطائی نے چھ ہزار گھوڑ سواروں سے اس پر حملہ کر دیا۔ اتنے بڑے لشکر کے سامنے چھ ہزار گھوڑ سوار کچھ بھی نہیں تھے لیکن مورخ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر ایک معجزہ رونما ہوا۔ وہ یوں کہ راجہ انند پال کے ہاتھی کی پیشانی میں درمیں تیرا تر گئے اور ایک پیرا کھ میں لگا برشاہی ہاتھی ٹراپی طاقتور اور بدست تھا اس نے اودھم مچا کر دیا اور ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگا۔ اس کی چنگھڑ سے دوسرے ہاتھی بھی ہٹ گئے۔ راجہ انند پال کا پرچم گر پڑا اور اس کے ہاتھی نے پیچھے مڑ کر حملے کی صفوں میں قیامت مچا کر دی۔ دوسرے ہاتھی بھی اس کی چنگھڑ سے ڈر کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ راجہ انند پال کی فوج بے سمجھ کر آگے سے مسلمانوں نے حملہ کر دیا ہے، پیچھے کو درمیں اور لے پیچھے کو بھاگتے دیکھ کر دوسری ریاستوں کی فوجیں علم اور سپہن کی زیر قود مکرپا ہوئے غائب۔

مستردہ ملی کمان بیکار ہو گئی۔ ہندو لشکر کے بے دل کی ایک وجہ موسم بھی تھا یہ ۱۳۱۱ء

آخر اس کے لیے نقصان نہ ثابت ہو رہی تھی کیونکہ دشمن کے لشکر میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا بھی ملک ہندوستان سے دے آ رہے تھے۔

سلطان سمجھ گیا کہ دشمن کی افواج ابھی منظم نہیں ہوئیں۔ انہیں ابھی حملے کی تربیت میں آنا تھا سلطان نے اللہ کے بھروسے اپنی فوج سے کام لیتے ہوئے ایک روز علی الصبح نماز کے فوراً بعد ایک ہزار گھوڑ سوار تیرا تیرا جو گھوم پھر کر تیرا تیرا کی کرنے کا ہتیر رکھتے تھے، دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیج دیئے۔ اس صورت حال میں اس نے بیل کاری بہتر نہیں اور جنگ کی ابتدا کر دی۔

تاریخ ۱۹ ربیع الثانی ۶۹۹ ہجری بمطابق ۳۱ دسمبر ۱۸۰۸ء عیسوی تھی۔ مشہور مورخ گریزی نے اس معرکے کا اکھول دیکھا حال یوں لکھا ہے کہ ایک ہزار تیرا تیرا زوں سے حلو کر کے محمود غزنوی نے پھروں کے چھتے کو چھپوایا۔ اس کے پلان کو دشمن نے یوں پرے پھینک دیا جیسے کوئی بے کار چیز کوڑے کرکٹ میں پھینک دی جاتی ہے۔ دشمن کی طرف سے ستر ہزار گھوڑوں نے ایک ہزار تیرا تیرا زوں پر بڑ بول دیا۔ گھڑ ایک لاکھ اور قتلہ تاجہ مندوئل کا حامی تھا بلکہ یہ قید اپنے آپ کو ہندوؤں کی نسل سے سمجھتا تھا۔ یہ لوگ جنگجو تھے۔ موسم کیسا ہی ہو میدان جنگ پھر لاہو ہوتا ہوا گیارہ سو سوار ہوا اور پانچاٹھ لاکھ ہونگے پائل اور جنگی سررا کرتے تھے۔

انہوں نے تیرا تیرا ز سواروں پر ایسا شدید بڑ بول کر کہ ایک ہزار گھوڑوں اور ایک ہزار سواروں کا کچھ پڑی نہ چلا کہ ان غائب ہو گئے جس گھنڑا کا قتل عام کر رہے تھے گھنڑوں نے اپنا بڑ بول دیا کہ سنیں، وہ دھم سے لگاتے اور جیسے جنگھار تے سلطان محمود کے کیسپ میں غائب ہو گئے کیسپ کے ارد گرد خندق تھی۔ وہ طرف آنے جانے کا راستہ تھا گھنڑا ان راستوں سے سیلاب کی طرح اندھیلے گئے سلطان محمود اس صورتحال کے لیے تیار نہیں تھا۔ گھوڑوں کی دیرینہ بغاوت غیر متوقع تھی لیکن احمد بھی بے شک ان کی تعداد میں ہزار تھی لیکن وہ ایسے کیسپ کے اند آ گئے تھے جو خندق سے گھرا ہوا تھا۔

مہم نام فرشتہ لکھتا ہے کہ چند منٹوں میں گھوڑوں کے ہاتھوں پانچ ہزار مسلمان شہید ہو گئے۔

تھا مگر اسے غزنی سے اطلاع ملی کہ غزنی کے علاقے میں محمد بنام کے ایک افغان نے دس ہزار فوج کے ساتھ اپنا کمپ بنالیا ہے۔ اور غوری اُس کے ساتھ شامل ہو رہے ہیں۔ یہ ایک اور خانہ جنگی کی ابتدا تھی سلطان محمود کو ۱۰۰۹ (۷۴۰ھ) میں غزنی جانا پڑا اور اُسے ایک اور خانہ جنگی لڑنی پڑی۔

کابل تھا جب قریبی سپاہیوں پر بربادی شروع ہو چکی تھی سلطان محمود اسی موسم میں غزنی کے لیے وقت حاصل کرتا رہا تھا۔ سلطان نے دشمن میں یہ جھگڑا دیکھی تو اُنہیں نے کھلے حملے اور تعاقب کا حکم دے دیا عبداللہ الطائی نے اپنے چھ ہزار گھوڑ سواروں سے اور دیگر سالار ارسلان جاوید نے دس ہزار سواروں اور پیادوں سے جن میں ترک، افغان اور غلجی تھے اہل کرکھل کر دیا دشمن اب لڑ نہیں رہا تھا، بھاگ رہا تھا۔

غزنی کے مطالبی پسالی میں دشمن کے بیس ہزار فوجی ہلاک ہو گئے جنہوں نے ہتھیار ڈال کر قیدی قبول کر لیا، ان کی تعداد بے حساب تھی۔ اس سے پہلے سلطان محمود نے کبھی تعاقب نہیں کیا تھا۔ اُنہیں لے دیا نئے سندھ کے دوسرے کنارے سے بھی فوج بلال اور دشمن کا تعاقب نہ چھوڑا۔

راستے میں اسے بتلایا گیا کہ نگر کوٹ کا مندر ہندو راجوں مارا جوں کا جگی مرکز بنا ہوا ہے جو ایک قلعے میں ہے سلطان نے اُدھر کا رخ کر لیا۔ نگر کوٹ کو راجا اندیاں کی یا کالجی کی فوج پھا سکتی تھی مگر دونوں میں بڑی طرح تیزتر ہو گئی تھیں سلطان نے نگر کوٹ کا محاصرہ کیا تو قلعے کی دیواروں سے تیر بربٹنے لگے قلعہ پہاڑی پر تھا اس لیے حملہ آوروں کی کامیابی محال تھی۔ تاہم تین دنوں کے محاصرے اور دھماکے پر مابڑ توڑ حملوں سے مصیبتیں نے ہتھیار ڈال دیئے۔

سلطان محمود مندر میں گیا تو اس نے پہلا کام یہ کیا کہ کُتوں اور موڑیوں کو پہاڑی کے اوپر سے نیچے گرایا۔ مندر سے بے بہار جواہرات برآمد ہوئے۔ سہت کر دوسو کے سکتے تھے۔ سونا منوں کے حساب سے تھا۔ چاندی کمی تو سن تھی۔ سیرے جواہرات بھی منوں کے حساب سے تھے۔ یہ وہ خزانہ تھا جو ہندوؤں نے سلطان محمود غزنوی کو شکست سے کر غزنی کو مہما بھارت میں شامل کرنے کے لیے جمع کر رکھا تھا۔

سلطان نے حمزدے نگر کوٹ تک کا علاقہ اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ راجا

پال اس کے چند دن بعد مر گیا۔

سلطان محمود غزنوی ہندوستان میں رہ کر اسلامی سلطنت کو منظم اور مستحکم کرنا چاہتا

چھینے تھے پچاس مائلی ہندو مہاراجوں نے پیش کیے تھے۔

وہ جتنی فوج اپنے ساتھ لایا تھا اتنی واپس نہیں لے جا رہا تھا۔ کچھ لغری یہاں ضرورت کے تحت چھوڑ چلا تھا اور بہت سی لغری ماری گئی تھی۔ اُس کی فوج کا کوئی ایک بھی سپاہی جنگی قیدی نہیں تھا کیونکہ وہ فاتح تھا، مگر اُس کے دو مہاراج اُس کے ساتھ نہیں تھے۔ یہ دونوں زندہ تھے اور اُس فوج کے ساتھ بھی نہیں تھے جسے سلطان محمود مگر کوٹ کے دفاع اور انتظام کے لیے بھیجے چھوڑ گیا تھا۔

ان میں ایک لغزخان تھا اور دوسرا سنگین۔ دونوں زبرد اور نڈر منہ جوان تھے۔ لغزخان پشاور اور لغمان کے درمیان کے علاقے کا رہنے والا تھا۔ پشاور آتا جاتا رہتا تھا اس لیے ہندوستان کی زبان کچھ سکتا تھا اور کچھ بول بھی سکتا تھا جب سلطان محمود کی فوج نے مگر کوٹ کا قلعہ سر کر لیا اور راہائی تقریباً ختم ہو گئی تھی، اُس وقت لغزخان قلعے سے باہر ایسی جگہ تھا جو سپاہی کی چوٹی پر تھی۔ قلعہ ٹوٹنے ہی اُس کے حبش کے سپاہی قلعے کے اندر جانے کو دھڑپڑے۔ لغزخان نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ گھوڑا عین وقت دھڑپڑا۔ لغزخان منہ بھل رہا۔ وہ پیچھے کو گرنے لگا اور گھوڑا اُس کے پیچھے سے یوں نکل گیا جیسے بدک گیا ہو۔

لغزخان ایسا گر کر لڑھکتا ہوا پہاڑی سے نیچے چلا گیا۔ وہ منہ بھل تو گیا لیکن چوٹی آئی آئی تھیں کہ کوشش کے باوجود اوپر نہ جاسکا۔ وہ پیچھے چلا گیا۔ اُس کا سر ہلکا رہا تھا اور دماغ مایوس ہو گیا تھا۔ ہندو فوج کے سپاہی ادھر ادھر بھاگے جا رہے تھے لغزخان اُن سے چھپتا پھر رہا تھا۔ ہندو اُسے دیکھ لیتے تو جان سے مار جاتے۔

وہ نیم عشی کی حالت میں کسی اور ہی سمت نکل گیا۔ اُسے سمت اور وقت کا کوئی احساس نہ رہا۔ وہ کبھی بیہوش ہوا، کبھی ہوش میں آیا اور جب بھی ہوش میں آیا وہ اُدھر چل پڑا۔ علاقہ جنگلات اور چٹان تھا۔ اُسے بالکل احساس نہیں تھا کہ کتنے دن گزر گئے ہیں یا کوئی دن گزرا بھی ہے یا نہیں۔ اُسے کسی نے جھنجھوڑا ہوا دھڑکا کر بیدار ہو گیا۔ اُس کا ہاتھ عادت کے مطابق اپنی تلوار کے مستبر پڑا اور اُس نے

مہرکہ انسان اور ابلیس کا

مگر کوٹ کے بُت توڑنے کے بعد سلطان محمود غزنوی غزنی کر جا رہا تھا کیونکہ اُس کی غیر حاضری میں غوریوں نے غزنی کو خیرے کر ڈال دیا تھا۔ یہ سلطان محمود کی بہت بڑی بے نصیبی تھی کہ وہ ہندوستان میں آتا تھا تو پیچھے کوئی نہ کوئی مسلمان حکمران غزنی پر چڑھ دیتا تھا۔ اُسے غزنی کو بچانے کے لیے واپس جانا پڑتا تھا، اس لیے وہ ہندوستان میں کسی بھی وقت آرام سے بیٹھ کر یہاں کے امور کی طرف توجہ نہ دے سکا۔ مستعجب تاریخ دانوں نے اُس کی اس بھوری پر پردہ ڈال کر اُس پر یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ ٹوٹ مار کے لیے آتا تھا اور وہ بُت اس لیے توڑتا تھا کہ بسوں کے اندر زرد جواہرات بھرے ہوتے تھے اور وہ ٹوٹ مار کر کے غزنی چلا جاتا تھا۔

اب کے وہ اس عزم کے ساتھ آیا تھا کہ ہندوستان کے راجوں مہاراجوں کے فوجی اتحاد کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کا اور کسی بڑے مندر میں کوئی بُت سلامت نہیں رہنے دے گا۔ چنانچہ اُس نے ہندوستان پر ہندوستان کی متحدہ فوجی طاقت کو کھینچا اور مگر کوٹ تک جا پہنچا جہاں کا مندر سارے ملک میں مشہور تھا۔ اُس نے مگر کوٹ کو فتح کیا ہی تھا کہ اُسے غزنی سے بلاوا آگیا کہ دس ہزار غوریوں نے غزنی کے قریب نیچے گاؤں کر ارد گرد خندق کھود لی ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے ساتھ دو ہزار ہندو قیدی لے جا رہا تھا لیکن یہ جنگی قیدی نہیں تھے۔ یہ اُس وقت کے رواج کے مطابق غلام تھے جو مہاراجا ہندوستان نے سلطان محمود کو ختم کرنے کے طور پر دیئے تھے۔ کچھ مائلی تو سلطان نے ہندو فوج سے

ایک اور بت عین پیدا ہوا (دور احمد)

۹۱

اور انگلیں اکیلا رہ گیا۔ وہ اپنے جیش کو ڈھونڈنے لگا۔ اس تلاش میں جیش اور جوانوں میں بھٹک گیا۔

وہ بھٹکتا رہا۔ دن گزرا۔ رات گزری۔ اگلے دن اور رات بھی گزر گئی اور وہ اُس جگہ جا پہنچا جہاں بُغراخان پڑا تھا۔ بُغراخان کو اُس نے پانی پلایا

تو دہلوری طرح ہوش میں آ گیا۔ انگلیں نے اُس کے منہ میں کھانے کے لیے کچھ ڈالا۔

سورج غروب ہو گیا بُغراخان کے جسم میں کھانے اور پانی سے جان آگئی تھی مگر وہ طے کے قابل نہیں رہا تھا۔

صبح طلوع ہوئی تو انگلیں کہیں سے مدد لانے کے لیے بائکر کوٹ کا راستہ اور سمت معلوم کرنے کے لیے کسی معاشی آدمی یا کسی گاؤں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اُسے بُغراخان نے بتا دیا تھا کہ تلوسر ہو چکا ہے۔ انگلیں کو اس خبر نے حوصلہ دیا۔ اُس کے دل سے یہ اندیشہ گھٹ گیا کہ وہ ہندوستانی فوج کے ہاتھ جڑھ جائے گا۔ چنانچہ وہ نذر ہو کر بلا جھگڑا تھا۔ بہت دیر کی تلاش کے بعد اُسے چھوٹا سا ایک گاؤں نظر آ گیا۔ وہ ادھر کو چل پڑا۔

جب گاؤں کے قریب پہنچا تو عورتیں اور بچے اُسے دیکھ کر گھروں کو بھاگ گئے۔ باب یہ گاؤں مسلمانوں کا محکم تھا۔ گاؤں والوں کو بہت غل چکا تھا کہ نگر کوٹ کے طلوع مسلمانوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور مسلمان بُت توڑ چکے ہیں۔ انگلیں کو دیکھ کر کچھ آدمی باہر آ گئے۔ وہ غریب سے دیکھتی تھیں۔ یہ دیکھ کر یہ مسلمان فوجی ہے، وہ غلاموں کی طرح دودھے آئے اور ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے۔ انگلیں نے چار آدمی ساتھ لیے اور بُغراخان تک پہنچا۔ اُس کی حالت اچھی نہیں تھی۔ اُس نے کوئی پھلوی زبان میں ان آدمیوں سے پوچھا کہ نگر کوٹ کا تلوسر کتنی دُور ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بہت دُور ہے اور پہاڑی پر رہنے کی وجہ سے فاصلہ زیادہ لبا اور تکلیف دہ ہے۔

تلوار نیام سے نکال لی۔ وہ اُنھ کھڑا ہوا تھا مگر پڑا چوٹوں کے علاوہ وہ بھوکا اور پیاسا بھی تھا اور ایک زخم ایسا تھا جس سے خون نکل رہا تھا۔

”ہوش میں آؤ خان“۔ اُسے اپنی زبان کی آواز سنائی دی۔ ”میں انگلیں ہوں۔ یہاں کیسے آ گئے؟“

بُغراخان نے بونے کی کوشش کی تو اُسے بہت چلا کہ وہ بول نہیں سکتا۔ اُس کا حلق خشک تھا اور زبان پیاس سے اکرانگی تھی۔ اُس نے منہ کھولا تو انگلیں سمجھ گیا کہ وہ پیاسا ہے۔ انگلیں نے اپنی پیٹھ کے ساتھ بندھی ہوئی پانی کی پھال کھولی اور اُس کے منہ سے لگا دی۔ بُغراخان اُس کا گہرا دست تھا۔

انگلیں بھی بُغراخان کی طرح ایک جیش کا کماندار تھا۔ وہ طلوع کے محاصرے میں شامل نہیں تھا۔ اُس کے جیش کو طلوع کی پہاڑی سے دُور اُس رستے پر بھیج دیا گیا تھا جس سے ہندو فوج کی کمک یا رستے کے آنے کی توقع تھی۔ انگلیں کے لیے یہ کام تھا کہ کمک کو راستے میں ہی اکھاڑے۔ اُس کا جیش تیر انداز تھا اور گھوم پھر کر تیر اندازی کا تربیت یافتہ تھا۔

اس جیش کو ایک ہفت مل گیا۔ یہ ہندوستانی فوج کا ایک سوار دستہ تھا جو نگر کوٹ کی طرف نہیں جا رہا تھا بلکہ ادھر سے آ رہا تھا۔ انگلیں کے تیر اندازوں نے اس سوار دستے پر تیر برسائے شروع کر دیئے مگر کچھ اور ہندوستانی بیلوہ سپاہی بھی اور طرف سے گزر رہے تھے۔ انہیں مسلمان تیر انداز نظر آ گئے۔ یہ ہندوستانی سوار اور پیادے دراصل نگر کوٹ سے بھاگے جا رہے تھے۔ راتے میں انگلیں کے جال میں آ گئے۔ سوار اور پیادے اپنی جانیں بچانے کے لیے لڑنے لگے۔ وہ اس علاقے سے واقف تھے۔ انہوں نے مسلمان تیر اندازوں کو گھیر لیا اور تیر اندازوں کے لیے شکل پیدا ہو گئی۔

انگلیں کے پاس نفیسی بہت کم تھی۔ یہ نفیسی لڑی تو بے فکری سے لیکن کچھ ماری گئی کچھ کھری۔ ہندوستانی سوار اور پیادے جو بچ گئے تھے، وہ نکل گئے

سے نیچے پھینکا تھا، انہوں نے مورتیاں اور بھگوت گیتا باہر پھینک کر اور میں نے مسلمانوں کو ان کے اوپر چلتے پھرتے دیکھا۔ تم نے اذان نہیں پڑھی جو ایک مسلمان سپاہی نے مندر کے اوپر کھڑے ہو کر دی تھی.... تم نے سنی ہوگی۔ تم نے اپنے مذہب کو، اپنی مذہبی کتابوں کو مسلمانوں کے پاؤں تلے دیکھا ہوگا۔ تم راجپوت ہوئے تو وہیں مر جاتے یہاں نہ آتے۔ بتیس اپنی جانیں زیادہ پیاری ہیں؟

”نہیں مباراج!“ ایک عہدیدار نے ہاتھ بندت کے ٹھٹھنے کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔ ہم بزدل نہیں۔“

”ہاتھ پیچھے رکھو۔ پنڈت نے نفرت سے کہا۔ تم بھی پیچھے ہو۔ جو سپاہی اپنے دھرم پر مرنا نہیں چاہتا اسے کئی میں رہنے کا کوئی حق نہیں۔ ہمارا حق صرف یہ ہے کہ جنگوں میں دھکیل دیتے جاؤ اور جانوروں کی طرح زندہ افسر کرو۔ تم نہیں جانتے کہ میں اتنی کمزوری کتنا دس کو دہاں سے کس طرح نکال کر لایا ہوں۔ ان کے چہروں اور ہاتھوں پر سیاہی ملی۔ انہیں مردوں کے کپڑے پہنائے اور نکال لایا۔“

اور وہ جو مندر میں رہ گئی ہیں، ان کے انجام سے تم واقف ہو گے۔“

”ہم انتقام لیں گے مباراج!“ دوسرے عہدیدار نے کہا۔

”اگر تم میں اتنی عزت ہوتی تو تھاری لاشیں مندر سے اٹھائی جاتیں۔“ پنڈت

نے کہا۔ ”اور تھاری آتماں اس آکاش پر ہوتیں مگر تم اپنے بیچہ شریر چھپاتے پھر رہے

ہو۔۔۔ اب غزنی کا یہ سلطان دیش کے دوسرے مندروں کا بھی یہی حال کرے گا۔

آج نگر کوٹ کی اینٹ سے اینٹ بھی، کل تھا خیرسک باری ہے تم جانتے ہو تھا خیرسک

ہمارے لیے اتنا ہی مقدس ہے جتنا مسلمانوں کے لیے مکہ اور مدینہ۔ کاش، آج میرے

اس بوڑھے جسم میں جوانی آجائے اور میں غزنی کے سلطان کو قتل کر دوں۔“

”اسی کلام کے لیے ہم یہاں رُکے ہوئے ہیں مباراج!“ ایک عہدیدار نے کہا۔

”ہم پیچھے ہوئے نہیں، رُکے ہوئے ہیں۔ ہم سپاہی نہیں عہدیدار ہیں جو ہم نکھتے

ہیں وہ سپاہی نہیں سمجھ سکتے اور عزت ہم میں ہے وہ کسی بھی دابے، کسی بھی مٹا بے

اور کسی بھی رائے میں نہیں۔“

گاؤں کے ان آدمیوں میں سے ایک نے انہیں خوش کرنے کے لیے کہا کہ بھگوت گیتا کو گاؤں میں لے کر آؤ اور اسے پڑھاؤ۔ تو اسے قلعے میں پہنچا دیں گے بھگوت خان نے انگلیں کو اپنی زبان میں بتایا کہ ان لوگوں نے کیا مشورہ دیا ہے۔

ان لوگوں نے یہ بھی کہا تھا کہ گاؤں میں زخموں اور چوڑوں کا علاج اور دوا اور شہد بھی ہے۔ انگلیں ایسا خطہ سول لینے کے حق میں نہیں تھا لیکن بھگوت خان قابلِ شہادت تکلیف میں تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ گاؤں کے لوگ ان کے حکوم تو ہو گئے ہیں لیکن وہ آخر دشمن ہیں اور ہلاک کر سکتے ہیں، اس نے انگلیں سے کہا کہ وہ پہلے گاؤں میں پہلے قلعے تک پہنچتے شاید وہ زندہ نہ رہے۔

انگلیں اپنے دشمن کو اچھی طرح جانتا تھا۔ ذہین آدمی تھا لیکن بھگوت خان کے ساتھ اس کی دوستی ایسی گہری اور جذباتی تھی کہ وہ خطروں کو بھول کر جذبات میں آگیا۔ اس نے گاؤں والوں سے کہا کہ بھگوت خان کو اٹھا کر گاؤں میں لے چلیں۔

انگلیں جب ان آدمیوں کو گاؤں سے لے گیا تھا تو تین آدمیوں نے ایک درخت تلے کھڑے ہو کر کھڑے کھڑے شرم کر دی تھی۔ ان میں سے ایک پنڈت تھا اور دوسرے دو فوجی تھے لیکن سپاہی نہیں تھے۔ بڑے عہدے کے افسر معلوم ہوتے تھے۔ تینوں نگر کوٹ سے بھاگے تھے۔ پنڈت اسی مندر میں ہوا کرتا تھا۔ فوجی عہدیداروں کو وہاں سے پہلے جانا چاہیے تھا کیونکہ ان کی فوج کچھ ماری گئی اور کچھ کٹ گئی تھی اور ان کے راجہ لے بہت سے سپاہی سلطان محمود کو غلاموں کے طور پر دے دیتے تھے۔ یہ

دونوں عہدیدار کھٹے اس گاؤں میں آئے تھے پنڈت پہلے ہی آچکا تھا۔ ان تینوں کو گاؤں والوں نے چھپایا تھا۔ تینوں بھڑکے ہوئے تھے اور شکست نے انہیں جذباتی بنادیا تھا۔ انہیں اس گاؤں سے بھی بھاگ جانا چاہیے تھا۔

”اگر تم تھاری طرح سپاہی ہوتا تو یوں میلان سے بھاگ کر یہاں نہ آچھتا۔“

پنڈت نے اپنے فوجی عہدیداروں سے کہا۔ تھاری رگوں میں راجپوت باب کا خون معلوم نہیں ہوتا.... اگر تم دیکھ لیتے کہ ان بچوں کے گھوڑے مندر میں کس طرح داخل ہوئے تھے، اگر تم دیکھ لیتے کہ کش مزاری کو انہوں نے کس طرح گھسیٹا اور پہاڑی کے اوپر

راز داری سے کہا۔ میں بھی یہی سوچ رہا ہوں کہ اس ایک آدمی کو کس طرح ختم کیا جاسکتا ہے۔ میرے ساتھ یہ جتین لڑکیاں ہیں، ان کا حشون دیکھو۔ میں سوچ رہا ہوں کہ یہ تھکے کے طور پر سلطان کو کس طرح پیش کی جاسکتی ہیں۔ یہ اُسے زہر دے سکتی ہیں۔“

”لیکن ہے۔“ ایک عہدیدار نے کہا۔ ”بھیس بنایا گیا ہے کہ یہ سلطان پھر مل ہے۔ عورت اور شراب کی بو سے بھی نفرت کرتا ہے۔ اسی لیے اس کی فوج جس علاقے کو فتح کرتی ہے، وہاں کسی عورت کی بے عزتی نہیں ہوتی۔ عورت کے جال میں سلطان محو کولانا ممکن نہیں۔ کوئی اور طریقہ سوچیں۔“

”ہمارے سارا جوں کو عورت اور شراب نے مارا ہے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”مسلمانوں کی فتح کا سبب یہ ہے کہ ان دونوں سے دل نہیں لگاتے۔۔۔ پھر بھی کچھ سوچنا پڑے گا، کچھ کرنا پڑے گا۔ میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔ میں نے جس کٹن بھگوان کی دن رات پوجا پاٹ کی ہے، اس کی توہین میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اس ویش پر تھرہ پڑا تو مجھ پر پڑے گا، تم پر پڑے گا۔“

مگر کوٹ کو فتح ہوئے سات آٹھ دن گزر گئے تھے۔ یہ مینوں خند کی پہاڑی سے دہنیے ایک گاؤں میں چھپے ہوئے تھے۔ دونوں عہدیدار بھی بدل کر دو دو بدلاؤ پر گئے تھے مگر سلطان محمود کے قتل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر بھی وہ مایوس نہیں تھے۔ پنڈت کی باتیں انہیں مایوس نہیں ہونے دیتی تھیں۔ وہ اب اس امید پر بیٹھے تھے کہ سلطان محمود اس علاقے کی سیر کے لیے باہر نکلے گا۔ انہوں نے دوکانیں اپنے پاس رکھ لی تھیں۔ یہ گھن جنگل تھا اور درختوں میں ڈھکی ہوئی اونچی نیچی چٹانیں بھی تھیں کہیں سے بھی چھپ کر تیر چلایا اور غائب ہوا جاسکتا تھا۔

اتنے ہیں انگلیں گاؤں میں چلا گیا اور دلوں سے چار آدمی لے آیا۔ دونوں عہدیدار نے اسے دیکھا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ غزنی کا یہ فوجی ان آدمیوں کو کسی جنگار کے لیے لے گیا ہے۔

”جانتے ہو کیوں؟“ پنڈت نے کہا۔ ”انہیں راج پیارا ہے۔ انہیں مندر سے نہیں کل سے پیار ہے۔ جس کے دل میں راج محل کا پیار ہو جاتا ہے، اُس کے دل سے مندر کی محبت مل جاتی ہے۔۔۔ سلطان محمود ایک آدمی ہے ایک انسان ہے۔ ادا تار نہیں، لیکن اس ایک انسان نے ہندو راج کو اپنے پاؤں تلے دبایا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ایک انسان کو ختم کر دیا جائے تو اس کی ساری فوج ہمارے قدموں میں بیٹھ جلتی گی۔“

”مگر اس ایک آدمی کو ختم کرنا آسان نہیں۔“ ایک عہدیدار نے کہا۔ ”آپ کو معلوم نہیں۔ میں درویشوں کے بھیس میں اُور گیا تھا۔ کلعے کے اندر بھی گیا تھا۔ مجھے کئی جگہ روکا گیا۔ مجھے اچھی طرح دیکھا گیا۔ میں نے ہر جگہ کہا کہ میں تاکا الدنیا درویش ہوں۔ صوفی ہوں اور سلطان کو مبارک دینے آیا ہوں مگر مجھے بہت ہی منت سماجت کے بعد سلطان کے محافظوں کے گناہدار تک جانے دیا گیا۔ گناہدار نے میری تلاشی لی اور میرے چنے کے اندر کمر کے ساتھ بندھا ہوا خنجر نکال کر کہا کہ درویش کو بھیا سے کیا کام؟ میں نے کہا کہ جس مذہب کا سلطان اتنی دُور سے بُت توڑنے کے لیے آیا ہے، اُس مذہب کے کسی پیر و کار کو خالی ہاتھ نہیں رہنا چاہیے۔ میں مسلمان ہوں اور بھیا مسلمان کا زور ہے۔۔۔ اُس نے مجھے خنجر لے لیا اور مجھے وہاں کے حوالے کر دیا۔ میں نے بڑی عذر سے دیکھا کہ غزنی کے سلطان تک پہنچنا ہی آسان نہیں، اسے قتل کس طرح کیا جاسکتا ہے۔ یہاں وہ ہر کسی کو شک کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میں مایوس ہو کر واپس آ گیا۔“

”ہم ابھی یہیں رہیں گے۔“ دوسرے عہدیدار نے کہا۔ ”ہم انتظار کر رہے ہیں کہ سلطان باہر نکلنا شروع کرے گا تو کیا اسے ترسے یا قریب جا کر خنجر سے قتل کیا جاسکتا ہے؟ ہم اپنی جانیں نہیں بچائیں گے ہمارا راج! اگر ہم دو آدمی اپنی جانیں قربان کر دیں تو۔۔۔“

”تو تم اگلے جنم میں اس ویش کے مارا جاؤ گے۔“ پنڈت نے کہا۔ ”ہر جنم اور راجوت بھی ہمارے قدموں میں مائے رگڑیں گے۔“ پنڈت نے

بہتر ہے۔ ایک عہدیدار نے کہا میں دیکھ چکے ہیں کہ ہم میں سے کوئی بھی اس تک نہیں پہنچ سکتا۔

”تم دونوں سن لو۔ پنڈت نے دونوں بزرگوں سے کہا۔ اس مسلمان کے زخم اور چوڑی اتنی جلدی ٹھیک نہ ہونے دینا۔ مجھے ابھی گھوڑا دے میں تھانیر جا رہا ہوں۔ گھوڑا ایسا دو جو مجھے بہت تیز لے جائے اور بہت تیز لائے۔“ دونوں بڑے چلے گئے تو اس نے عہدیداروں سے کہا۔ میں تمہیں لڑکیوں کو تھارے سپرد کر چلاؤں۔ میں انہیں اچھی طرح سمجھا دوں گا۔

انہوں نے تینوں لڑکیوں کو دیں بلایا اور پنڈت انہیں بتانے لگا کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ اتنے میں گھوڑا تیار ہو گیا۔ پنڈت گھوڑے پر سوار ہوا اور روانہ ہو گیا۔ صبح سویرے انگلیں کی آنکھ کھل تو دیکھا کہ بغراخان در دے آہستہ آہستہ کراہ رہا تھا۔ انگلیں بڑھے کو بلانے کے لیے باہر نکلا تو دو جوان لڑکیاں دروازے پر کھڑی تھیں۔ انگلیں کو دیکھ کر مسکرائیں۔ انگلیں ان کے من اور ان کی مسکراہٹوں سے جیسے کھڑ ہو گیا ہو۔ ایک لڑکی نے اسے کچھ کہا تو وہ خاموش کھڑا رہا کچھ بھی نہ بکھا سکا۔ اس نے مسکراتے ہوئے لڑکیاں اندر چلی گئیں جہاں بغراخان بڑا کراہ رہا تھا۔ ”بہت تکلیف ہے؟“ ایک لڑکی نے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ دوسری نے اس کا ایک ہاتھ اپنے ماتھے میں لے لیا بغراخان کی تو جیسے زبان بند ہو گئی ہو۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔

”یہ دونوں ہماری زبان نہیں سمجھتے۔“ ایک لڑکی نے دوسری سے کہا۔

”میں سمجھتا ہوں۔“ بغراخان نے کہا۔ ”میں تمہیں دیکھ کر اس لیے چپ ہو گیا تھا کہ اس جنگ میں تم جیسی لڑکیاں کہاں سے آگئی ہیں!.... تم اس گاؤں کی رہنے والی معلوم نہیں ہوتیں۔“

”ہم اسی جنگ میں پیدا ہوئی ہیں۔“ ایک لڑکی نے کہا۔ ”میں ان کوئی روگی، کوئی دھمی انسان آجائے تو ہم اس کا درد چوس لیا کرتی ہیں.... میں نے پوچھا تھا کہ بہت تکلیف میں ہو؟“

کچھ دیر بعد انہوں نے دیکھا کہ گاؤں کے آدمی واپس آ رہے تھے۔ ان کے ساتھ انگلیں تھا اور گاؤں کے ایک آدمی نے کبھی کو بیٹھ پر اٹھا رکھا تھا۔ عہدیداروں نے انگلیں کو پہچان لیا اور وہ چپ ہو گئے۔ انگلیں جب ان آدمیوں کے ساتھ گاؤں میں پہنچی تو گاؤں کے دوسرے لوگ بھی جمع ہو گئے۔ بغراخان کو چار پائی پر ڈال دیا گیا اور دو بڑے اس کے زخم اور چوڑی دیکھنے گئے۔ انہوں نے فوراً اس کا علاج شروع کر دیا۔

انگلیں کے کہنے پر بغراخان نے ان بزرگوں سے کہا۔ اگر گاؤں میں ہمارے ساتھ کسی نے کوئی گھڑی کی تو سارے گاؤں کو آگ لگا دی جائے گی اور بڑے سے بڑے تک کو زندہ جلا دیا جائے گا۔

”آپ ہمارے بادشاہ ہیں۔“ ایک بڑے نے کہا۔ ”سارا گاؤں آپ کی حاضری میں کھڑا ہے گا۔ گھڑی کی جرات کون کر سکتا ہے.... ہم نے اس سے زیان گہرے زخمیں اور زیادہ خطرناک چوڑی کا علاج چند دنوں میں کیا ہے۔ آپ پانی چھ دونوں تک چلنے پھرنے کے قابل ہو جائیں گے۔“

انگلیں اور بغراخان کے لیے ایک جمو پڑا حال کر کے اسے صاف کیا گیا۔ ان لوگوں کے پاس جو صاف سترے بستر تھے، وہ انہوں نے کچھ دیئے۔ رات غزنی کے دونوں گاؤں اس جمو پڑے میں سوئے ہوئے تھے۔ انگلیں نے بغراخان سے کہا تھا کہ وہ ان لوگوں کی رہنمائی میں قطعاً جاکر اپنی اور اس کی اطلاع کرتا ہے لیکن بغراخان نے اس خطرے کا اظہار کیا کہ وہ اکیلے گیا تو یہ لوگ اسے غائب کر سکتے ہیں یا زخموں میں زہریلی دوائی ڈال کر غراب بھی کر سکتے ہیں۔

وہ دونوں تو سو گئے تھے۔ ٹھکن سے ان کے جسم ٹوٹے ہوئے تھے۔ ان سے تھوڑی

ہی دور ایک اور جمو پڑے میں پنڈت، دونوں ہندو عہدیدار اور دونوں بڑے جموں نے بغراخان کی رہنمائی کی تھی، اکٹھے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ پنڈت کہہ رہا تھا۔ ”انہیں استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ہمارے پاس طریقے سوجھیں جن سے ایک بڑا انسان کو زندہ اور درندے کو بڑا بنا دیا جاسکتا ہے۔“

”سلطان کو اس کے اپنے آدمیوں کے ہاتھوں سے قتل کرایا جائے تو زیادہ

”در زیادہ ہے۔“ لہذا خان نے جواب دیا اور اُس نے اس لڑکی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جس نے اُس کا ہاتھ تھام رکھا تھا۔

”ٹھیک ہو جائے گا۔“ لڑکی نے کہا۔ ”میں تمہارے کھانے کے لیے کچھ لاتی ہوں۔“

وہ دونوں لڑکیاں باہر نکل گئیں۔

بغراخان نے کہا کہ اسے درمیں خاصا اتفاق ہوا ہے لیکن جھوٹے کے جانے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بغراخان کو معلوم تھا کہ وہ کس کی راہ دیکھ رہا ہے مگر رکبوں کی بجائے دونوں بول رہے اندر آئے۔ وہ تھے تو دیہاتی اور وہ جاہلی سے لگتے تھے لیکن ان کے انداز میں ایسی خود اعتمادی تھی جیسے وہ اپنے فن کے ماہر ہوں۔ دونوں نے بغراخان کی بنیاں کھولیں۔ زخم دیکھے۔ چوٹیں دکھیں اور دونوں نے متفقہ رائے دی کہ آٹھ دن اور لگیں گے۔

ایک اور عجیب پڑے میں دونوں ہندو عہدیدار بیٹھے تھے۔ انہوں نے قنصل کے ارکوں کو اسے پاس بٹھا رکھا تھا۔

”احتیاط ہے۔ ایک عہدیدار نے لڑکیوں سے کہا۔ دو دن تک اس سے زیادہ مقدار نہ ملانا، ورنہ انہیں شک ہو جائے گا۔ دودھ خود چھک لیا کرو۔ ذائقے میں ذرا اس بھی تبدیلی دیکھو تاہر مددہ ڈال دو اور اس میں شہد زیادہ ڈالو۔“

”تم انیس دودھ میں یہ چیز ملائے بغیر بھی ان پر نشہ طاری کر سکتی ہو۔“
 ”یہ خیال بھی رکھنا کہ تم پر ہی نشہ طاری نہ ہو جائے۔“ عہدیدار نے لڑکیوں سے
 کہا۔ ”دونوں خوبصورت جوان ہیں۔“

”ایسا کبھی نہیں ہوگا“ — ایک لڑکی نے کہا۔ ”یہ تو آپ نے ہمیں فرض ہی ایسا سونپ دیا ہے کہ ہم ان کے پاس چلی گئی تھیں ورنہ ہم تینوں میں سے کوئی بھی ان مسلمانوں کے قریب نہ جائے۔“

"شاید تمہیں اس سے بھی زیادہ آزمائش میں ڈالا جائے۔" دوسرے عہدیدار نے کہا۔ "اپنے دیس اور اپنے دھرم کی خاطر تمہیں قربانی دینی ہوگی۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ انیس پنڈت بدلتی جگہ سکے آئے تاکہ بیس جال میں الجھائے رکھو۔ پنڈت جی ایک آدمی کو ساتھ لے گئے تھے۔ ان کے لئے کھانا، پیرہن، پہاڑی اور داغوں پر قبضہ کرنے کا پھر جم ان کے پاس تھا۔ اُس نے پیادے کی طرف اشارہ کرنا سکے۔"

دہ داپس آئیں تو تین تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں منہ ہاتھ دھلانے کے لیے پانی تھا اور باقی دو نے کھانے پینے کا سامان اٹھا رکھا تھا۔ اس میں دودھ تھا جس میں شہد ملا ہوا تھا۔ لڑکی نے دونوں کے منہ ہاتھ دھلائے۔ انہوں نے دودھ پی لیا اور سوے ویرہ کھالیے لڑکیاں خلی برتن لے گئیں تو زادیر بعد پور لہان نے نغمہ لگایا۔ انگلیں نے پہلے تو اسے چونک کر دیکھا پھر وہ بھی ہنس پڑا۔ دونوں کو یادوں جیسا غل سے ہنسے بہت مت گزر گئی تھی۔ وہ پہلے حضور کے قریب ہڑامی خوریز ممر کر لے گئے جس میں انہیں کامیابی کی توقع نہیں تھی لیکن راجہ اندیال کے ہاتھ کی اسلحہ میں تیر نکلا تو اس نے قیامت پیا کر دی۔ ہمارا راجہ جھنڈا اسی ہاتھ پر تھا اٹھتی پتھپے کو بھاگتا تو جھنڈا رتن گنگی۔ جھنڈا دیکھ کر گھبرا کر ہندوستانی دستے گھبرا گئے اور اصل صورت حال معلوم کیے بغیر بھاگنے لگے۔

انگلین اور بلغاریا کے دوستوں کو حکم ملا تھا کہ دشمن کا تعاقب کر دینا چاہئے اور وہ تعاقب میں گئے۔ ان کے کئی عزیز دوست حضور کی جنگ میں مارے گئے تھے۔ وہ ہنسی اور کراہیوں سے محروم رہے۔ پھر انہیں نگر کوٹ سبکدوشی مقرر کرنی پڑی اور یہاں بھی لڑنا پڑا۔ جب موت ہنسنا کرتی ہے تو انسان رویا کرتے ہیں۔ یہ دونوں کمانڈر رونے والے نہیں تھے۔ وہ غزنی سے ندیوں، دریاؤں اور چٹانوں اور دشمن کی صفوں کو چہرے آتے تھے۔ اب جب اس جھوٹے میں بلغاریا نے ہتھیار ڈال دیے اور انگلیں کی ہنسی نکل گئی تو دونوں نے محسوس کیا کہ جنگ کے جہنم نے ان کے جذبات اور ہنسی کو جو س لیا ہے اور وہ ہنسنا کیلنا چاہتے ہیں۔

”تم نے مجھے بدبودار لاشوں اور خون کی بدبو سے اٹھا کر ایسی دنیا میں پہنچایا ہے جہاں مجھے یہ جھوٹا بھی محل لگتا ہے۔“ ایک روز بغراخان نے اپنی لڑکی سے کہا۔ ”جب تو تین تیس اس سے بھی زیادہ حسین دنیا میں پہنچا سکتی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”لیکن میں جو کچھ بھی کموں، تم کوئی اعتراض نہ کرنا۔“ اور وہ چلی گئی۔ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں مٹی کا ایک پیالہ تھا۔ اس نے پیالہ بغراکو دے کر کہا۔ ”بتو۔ یہ اس چٹل کے ایک درخت کے پھل کا رس ہے۔ یہ صرف اس خطے میں ہوتا ہے۔“

بغراخان نے پیالہ منہ سے لگایا۔ تین چار گھونٹ پئے ہوں گے کہ لڑکی نے پیالہ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ بولی۔ ”ایک ہی بار نہ بتو۔“ بغراخان نے اس ڈالنے کی کوئی چیز پہلے بھی نہیں پی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے سرد آنے لگا۔ اُس نے لپک کر لڑکی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ لیا اور متانہ سی آواز میں بولا۔ ”میں اب چل بھر سکتا ہوں لیکن تم نہیں؟“ دیکر رئیس جاؤں گا۔ اگر سلطان مجھے تم سے جدا کرے گا تو اُس کا بھی حکم نہیں مانوں گا۔“ ”تم نے مجھے شراب پی ہے؟“ لڑکی نے کہا۔ ”نہا ہے سلطان شراب نہیں پیا کرتے۔“

”میں شراب پر لعنت بھیجتا ہوں۔“ بغراخان نے کہا۔ ”تم جو تو مجھے شراب کی کیا ضرورت ہے۔“

”میں تیس شراب پی چکی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”پتہ بتاؤ کیا تم اس چیز کو حرام سمجھتے ہو؟“

وہ سنجیدہ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ لڑکی کا چہرہ اُس کی طرف بڑھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے لڑکی کا چہرہ پھیل چلا گیا اور پھر بغراخان بھول گیا کہ حرام کیا اور حلال کیا ہے۔ ”اسکین؟“ اُس نے اپنے دوست کو آواز دی۔ ”اسکین اسی جھوٹے کے دوسرے کمرے میں تھا۔ فوڈ آیا بغراخان نے کُے کہا۔ دیکھو یہ لڑکی کتنی اچھی چیز کو شراب کتنی ہے۔ لو، تم بھی بتو۔“ اُس نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسکین نے

سلطان محمود غزنوی کے دو کمانڈر ہندوؤں کے بڑے ہی حسین چال میں آگئے۔ دوسرے تیسرے دن وہ اپنا فائدہ حقیقت، اپنے غمخیزوں اور اپنے فرائض کو بھول چکے تھے۔ انہیں بتہ نہ چل سکا کہ انہیں دودھ میں سُندا اور شرب پلائی جا رہی ہے انہوں نے چونکہ کبھی شراب نہیں پی تھی اس لیے دودھ میں ملی ہوئی تھوڑی سی شراب بھی انہیں اتنا سا کمزور کر دیتی تھی کہ وہ ہنسنے پھیلنے لگتے تھے۔ اتنی حسین لڑکیوں نے ان پر اپنا نشہ بھی طاری کر رکھا تھا۔

دو تین دن اور گزرنے کو ایک لڑکی نے بغراخان کو اور دوسری نے اسکین کو کمانا شروع کر دیا کہ وہ انہیں اپنے ساتھ غزنی لے جائیں۔ دونوں کمانداروں نے یہ بھی پوچھنے یا دیکھنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ اتنی خوبصورت لڑکیاں کون سے بابوں کی بیٹیاں ہیں۔ اُس علاقے کے لوگوں کے رنگ تو بڑے صاف اور بعض کے گورے تھے لیکن یہ لڑکیاں اس علاقے کی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔

دونوں بوڑھے بغراخان کا علاج کر رہے تھے اور بغراخان چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا لیکن وہ اس گاؤں سے جانا نہیں چاہتا تھا۔ اسکین کا دل بھی اس جھوٹے کے جنت کا قیدی ہو گیا تھا۔ دونوں دوست لڑکیوں سے کسے لگے کہ وہ کبھی رات ان کے جھونپڑے میں گزاریں۔ لڑکیوں نے انہیں بتایا کہ ان کے ماں باپ انہیں جان سے مار دیں گے۔ وہ کتنی تھیں کہ والدین نے انہیں ان کی صرف بیمار داری کی اجازت دے رکھی ہے۔ یہ بول لڑکیاں ان کے جذبات کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ وہ سیدان جنگ کے ٹھکے ماندے سپاہیوں کے لیے شراب بنی ہوئی تھیں۔ وہ جس والہانہ انداز سے اظہار محبت کرتی تھیں، وہ ان کمانداروں کو دیوانہ بنا دیتا تھا۔ عیاں کندھوں پر پھرے لہراتے ریشمی بالوں کو جب وہ چھوٹے تھے تو ان کے چہروں پر کبھی سی طاری ہو جاتی تھی۔

تھوڑی ہی دیر اور یہ لڑکیاں بہت بڑا بہت خانہ اُجڑا لگاتھا اور دیوانہ ہو جاتیں۔ ان کے جذباتوں کے دھماکے ہندوؤں کے جیتے جاتے ہو جاتے۔

بہت اٹھایا اور منہ سے نکالیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد وہ بھی انہی آسمانوں میں اڑنے لگا جنہوں
نبراخان اڑ رہا تھا۔

انہوں نے اپنے آپ پر شراب حلال کر لی لیکن اسے وہ شراب نہیں کہتے تھے۔
 ایک روز دونوں لڑکیاں جھوپڑے میں آئیں تو انہوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے
 پاس بٹھایا۔ ایک لڑکی نے بڑا خان سے بات شروع کی۔

”تم نے ہم سے کبھی بھی نہیں پوچھا تھا کہ ہم کس کی بیٹیاں ہیں اور ہم کون ہیں۔“
 راکھ نے کہا۔ ”ہم اس گلاؤں کی رہنے والی نہیں۔ ہم دونوں کے باپ تاجر ہیں۔ یہاں
 فوج جب نگر کوٹ کی طرف آرہی تھی تو ہم اپنے باپوں کے ساتھ نگر کوٹ کے مندر میں
 بوجایات کے لیے آئی ہوئی تھیں۔ ہزاری فوج کی خبریں کر بھلے باپ ہیں والیں اپنے
 گھروں کو لے جانے کی بجائے اس گاؤں میں لے آئے۔ تیسری لڑکی میری قبریں
 رشتہ دار ہے۔ ہمارے باپوں نے اس گاؤں کے لوگوں سے کہا کہ مسلمانوں کی فوج آ
 رہی ہے اور اتنی جوان اور خوبصورت لڑکیوں کو ساتھ لے بھرنا ان کے لیے بہت
 خطرناک ہے۔ انہوں نے گاؤں والوں سے کہا کہ وہ ہم تینوں لڑکیوں کو یہاں چھپالیں۔
 جب غزوہ خلی جائے گا تو وہ ہمیں لے جائیں گے۔ وہ اب آگئے ہیں اور ہمیں ساتھ لے
 جائیں گے۔ اپنے دوست کو اپنی زبان میں کھانا کہہ دوں ہمارے ساتھ چلو۔ ہاں
 باپ تیس اپنے ساتھ لے جا لے پر راضی ہو جائیں گے۔“

بغیر اخلاص نے انگلیں سے بات کی تو اُس نے کہا کہ ہم فوج کے آدمی ہیں۔ اگر ہم بچنے گئے تو ہمیں قدار اور بیگڑا کہا جائے گا اور ہمارے سر قلم کر دیئے جائیں گے۔ اگر یہ لڑکیاں ہمارے ساتھ رہنا چاہتی ہیں تو ہم انہیں ساتھ رکھنے کا کوئی اور طریقہ اختیار کریں گے۔ انہیں ہمارے ساتھ چلنا چاہیئے۔

لڑکیاں مایوس ہو کر چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد دو آدمی آئے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ انہوں نے لڑکیوں کو اس گاؤں میں لانے کی وہی وجہ بتائی جو لڑکیاں بتا چکی تھیں۔ انہوں نے اپنا سکہ دیوں پیش کیا کہ وہ لڑکیوں کو رے خانے آئے ہیں لیکن راستے میں مسلمان فوجیوں کا خطرہ ہے۔ لڑکیاں اتنی خوبصورت

ہیں کہ جس کی نظر ڈگنی وہ اٹھا لے جائے گا۔ اس خطرے سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ بوزخان اور انگلیں ان کے ساتھ چلیں اور منزل پر پہنچا کر واپس آجائیں۔ ان کا انیس انسانا انعام لے گا جو وہ اپنے نصرت میں بھی نہیں لاسکتے۔

”ہم نہیں منزل پر پہنچا دیں گے۔“ بوزخان نے کہا۔ ”لیکن ہمارا انعام یہ لڑکیاں ہوں گی۔ اگر انہیں منظور نہیں تو تم جے جاؤ۔“

”اسنی کی خاطر تو میں نے اتنا خطرہ مول لیا تھا۔ ایک لڑکی کے بارے میں کیا۔“

”میں اپنی لڑکی کو تدارے حوالے نہیں کر سکتا۔“

”اور تم لڑکیوں کو یہاں سے نہیں لے جا سکتے۔“ بفرخان نے کہا۔

اُسی رات کا ذکر ہے۔ دونوں لڑکیاں بُغراخان اور انگلیسین کے پاس تھیں اور
 نہیں شراب پلا رہی تھیں۔ دونوں کے ذہن اپنے قابو سے نکل گئے۔ پھر جو بیڑے
 کا دروازہ کھلا اور ایک درویش صورت آدمی اندر آیا۔ اُس نے ہر سے بردار مٹی
 تھی اور سر کے بال لیے تھخے۔ اُس نے چوپین رکھا تھا۔ مٹی میں لبانغصا تھا جس
 کے سر پر کڑی کا سانپ بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں نے لے لیا۔ کھانا بہ تیزی سے انھیں اور
 درویش کے پاؤں چھوئے۔ ان دونوں نے بزرگ خان اور اُن میں دُبتا یا کہ یہ ایک جوگی ہے
 جو کبھی کبھی اُدھر سے گزرتا ہے۔ کبھی کو معلوم نہیں کہ یہ کہاں رہتا ہے اور اس کا مذہب
 کیا ہے۔ آنے والے وقت کی بات بتاتا ہے۔ جنگلوں کے سانپ اس کے یہاں ہیں۔
 راجے اور ہمارا ہے بھی اس کے آگے سمجھ کر تہیں، لیکن یہ خود جنگلوں میں کیسی بہت

”تم زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔“ جوگی نے لغزخان سے کہا۔ آتنی دور اویسے تم گئے اور بچ گئے۔ موت ابھی ٹلی نہیں۔ میرے قریب آؤ۔“

جوگی نے لغزخان کو اپنے سامنے بٹالیا اور حیران و ان قریب کر لیا۔ اُس نے ایک ہزار نکالا اور اس طرح اپنے اور لغزخان کے درمیان کیا کہ دیئے کی روشنی

ہوتا تھا۔ انسان اور شیطان کی جھڑپ، ایک آدمی کی یکفکش انسانی زندگی میں رد و قبول سے ہی شروع ہوئی تھی شیطان نے انسان کے آگے جہد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خدا نے انسان سے کہا تھا کہ شیطان کی بات نہ سنا مگر شیطان نے ایسے طلسماتی حربے استعمال کیے کہ انسان نے شیطان کے آگے جہد سے شروع کر دیے۔

اسلام ایک سما مذہب ہے جس کی بنیاد اخلاقیات پر رکھی گئی ہے مخالف قوتوں نے اسلام کو شکست دینے کے لیے بدی کی قوت استعمال کی۔ بدی میں وہ حسن اور کشیدگی جو انسان کی کمزوریوں کو ابھارتی اور روحانی قوت کو کمزور کرتی ہے، اسلام کو آتش پرست اور بت پرست سمجھے یہود و ہنود سمجھے اور انہوں نے اسلام کی اخلاقی قدروں کا توڑ نکال لیا۔ یہودیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں صلیبیوں نے اپنی بیٹیاں استعمال کیں۔ شراب اور زرد جو اہل بیت کو ہتھیار کے طور پر استعمال کیا کرتے اور اشیاء کا سارا لیا اور اخلاقیات کے علمبردار اس حال میں آکر کھیل ڈالتے چلے گئے۔

بغز افغان اور ہنگامی کے ذہنوں پر دبدبائی کی حسین لڑکوں اور شراب کا پیلے ہی قبضہ ہو چکا تھا۔ رنج ورنشہ خامی ہو چکا تھا جسم پر قبضہ مشکل نہ تھا۔ یہ جوگی ان شعبہ بازوں میں سے تھا جو تارک کے ہر دور میں ساری دنیا میں مشہور رہے ہیں۔ رستے کو بین بجاکر لالچی کی طرح کھڑا کر دینا ان کا کمال تھا۔ انسانوں کے عجم کو ہینا ناز کرنے میں یہ لوگ ماہر تھے۔ ماں کے ہاتھوں اُس کے دودھ پیتے بچے کو مودرنا ان کے باتیں مامعہ کا کام تھا۔

پنڈت اسی کو بلالانے کے لیے کہیں چلا گیا تھا۔ وہ دوتھے۔ پہلے انہوں نے یہ حربہ استعمال کیا تھا کہ یہ لڑکیوں کے باپ ہیں۔ لڑکیوں نے دونوں کمانداروں کو اپنے ساتھ چلے کو کہا لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ اس کے بعد انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ انہیں شعبہ بازی سے اپنا غلام بنالیا جائے۔

شراب اور لذت پرستی نے پہلے ہی زمین ہوا کر رکھی تھی۔ جوگی نے ان کے ذہنوں کو اپنے قبضے میں لے لیا۔

اس برزخ اور اس سے رنگ برنگی کرنیں بغز افغان کی آنکھوں میں بڑنی تھیں۔ یہ رنگ وکٹش اور برزخ رب تھے۔ جوگی نے بغز افغان سے کہا کہ آنکھیں کھل رکھو اور اس شیرے کو دیکھتے رہو۔

”اس میں نہیں ایک رنگ موت کا اور ایک زندگی کا نظر آئے۔“ جوگی نے کہا۔

”ہم دیکھیں گے کہ تارا رنگ کون سا ہے۔“

رنگ ایسے دلفریب تھے اور جوگی کی باتوں کا بھی اثر تھا۔ بغز افغان مدبوش سا ہونے لگا۔ اُس نے شراب بھی پی رکھی تھی۔ اُس کا شعور پہلے ہی مدبوش تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جوگی نے اپنی نظریں اُس کی آنکھوں میں جا رکھی ہیں۔ جوگی خود سی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”مجھے ایک بڑی حسین زندگی نظر آ رہی ہے۔ میں ہوں اور وہ ملکی ہے جسے میں چاہتا ہوں۔ میں اس زندگی کا بادشاہ ہوں۔“

جوگی نے ہیرناشیٹہ اوپر کیا۔ بغز افغان کی نظریں اُس پر جمی رہیں۔ جوگی ہیرے کو اپنی آنکھوں کے سامنے لے گیا۔ پھر بغز افغان کو محسوس ہی نہ ہوا کہ ہیرا درمیان سے ہٹ گیا ہے اور اُس کی نظریں جوگی کی آنکھوں میں جکڑی گئی ہیں اور جوگی کے الفاظ جن میں برستی کی تھی، آنکھوں کی ذہ اُس کے ذہن میں اترتے جا رہے ہیں۔ وہ ہینا ناز ہو چکا تھا۔

وہ ایسے لمحے میں ہونے لگا جیسے خواب میں بولی رہا ہو۔

”اے... یہی جنت ہے۔ مجھ سے یہ جنت کون نہیں چھین سکتا... میں غنی کا بادشاہ ہوں... میں قتل کروں گا... میری تلوار یہی ہے۔“

انگلین دیکھ رہا تھا گراسے ایک لفظ بھی پتے نہیں پڑ رہا تھا۔ جگہ نے اُسے اپنے سامنے بٹھالیا اور اُس پر بھی وہی عمل کیا اور وہ بھی ذرا سے وقت بعد بغز افغان کی طرح بولنے لگا۔

انسان جب اپنے کردار کو گناہوں کے دلفریب رنگوں میں رنگ لیتا ہے تو اسے ہینا ناز ہوتے دیر نہیں لگتی۔ کن ہوں کی محبت اور شراب کی سی کرشمہ سازی ہے کہ انسان کی روحانی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کی شخصیت مر جاتی ہے اور وہ جبین ہتھی کے قریب میں جلدی آجاتا ہے۔ یہ مل آج بھی ایسے ہی ہوتا ہے، صدیوں پہلے بھی ایسے ہی

کہ وہ جلدی واپس آنے کے لیے گیا ہے یا کہتے غرض بعد واپس آئے گا۔ اس صورت پر، ان دونوں آدمیوں کو کہاں رکھنا جسے پندت کی نگاہ میں بیکار تھا۔

”وہ آئے گا۔“ ہندو محمدیادوں نے کہا۔ وہ ضرور آئے گا۔ یہ آدمی ہمارے ہاتھ آپکے میں۔ انہیں ہم سنا کر لیتے ہیں۔ یہ ہمارے کام آئیں گے ہم انہیں مسلمانوں کی فوج کے پر سالاروں کے قتل کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔

ان کے متعلق فیصلہ کیا گیا کہ انہیں یہیں رکھا جائے، اور سلطان ٹھو کے قتل کے لیے تیار کیا جائے۔

سلطان محمود غزنوی غنی چلا گیا تھا غزنی کے مغرب میں غور کا پساری ملاہ تھا جس کا حکمران محمد بن سوری تھا۔ اُس نے دیکھا کہ سلطان محمود ہندوستان میں برسبر بیکار ہے تو اُس نے دس ہزار نفری کی فوج ساتھ لی، اور غزنی کے قریب بنجہ زن ہو گیا۔ اُس نے خیر کا کے ارد گرد خندق کھود لی۔ اس دفاع کے علاوہ اس فوج کو قدرت نے بھی دفاع میں رکھا تھا۔ وہ اس طرح کہ محمد بن سوری نے ایسی جگہ کیپ کیا تھا جس کے تین طرف پہاڑیاں تھیں۔ صرف ایک طرف ٹھوڑی سی جگہ خندق نہیں تھی اور اس طرف پہاڑی بھی نہیں تھی۔

اس طرح یہ کیپ تلے کی طرح ناقابل تسخیر ہو گیا تھا۔ اس سے سوریوں کی فوج یہ نامہ اٹھا لی تھی کہ اس کے پیش باہر اگر غزنی کی فوجی چڑکیوں پر ٹھون مارے اور اپنے کیپ میں چلے جاتے تھے۔ دو مرتبہ غزنی کی فوج کے ایک دستے نے ایک حیش کا تعاقب کیا اور دشمن کے کیپ تک جا پہنچا۔ آگے خندق تھی۔ اندر جانے کا جو کھڑا راستہ تھا، دھل سے تیر اندازوں نے تیر مل کا مینہ برسا دیا کچھ دیر غزنیوں نے یہیں کجا جواب تیروں سے دیا لیکن خندق آگے نہیں جانے دی تھی۔

دوبار ایسے ہی ہوا غزنی فوج پریشان ہو گئی۔ سوریوں کے ٹھون بڑھنے لگے۔ وہ غزنی فوج کی جگہ طاقت آہستہ آہستہ کمزور کر رہے تھے۔ سوزدن وقت پر انہیں غزنی پر حملہ کرنا تھا۔ غزنی والوں نے سلطان محمود کو خبردار کر دیا مناسب سمجھا۔ یہ خطوبہ بھی تھا کہ

صبح طلوع ہوئی تو یہ قافلہ نگر کوٹ سے بہت دُور نکل گیا تھا لغر خان اور السگین گھوڑوں پر سوار تھے۔ ساتھ دواؤں کے تھے۔ ان کی پاکیزگی میں لڑکیاں تھیں اور ایک میں پندت۔ وہ دونوں آدمی بھی ساتھ تھے جنہیں پندت ساتھ لے گیا تھا اور دونوں ہندو عمدیدار بھی ساتھ تھے۔ لغر خان اور السگین شہزادوں کی طرح گردنیں تھامنے ہوئے تھے۔ وہ ہنس رہے تھے اور جن کے وہ قیدی تھے انہیں وہ اپنا غلام کبھے ہوئے تھے۔

قافلہ چلتا رہا، رکتا رہا، لغر خان اور السگین کو کھانے اور دودھ میں کوئی شکرہ دوائی دی جاتی رہی اور وہ اپنے آپ سے، اپنے مذہب اور اپنے وطن سے بے خبر پٹتے چلے گئے۔

ادریہ قافلہ تھا میر پور گیا۔ تھا میراُس دُور میں بہت بڑا مندر تھا۔ نگر کوٹ سے بھی بڑے سڑکوں نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے لیے اُس کی حیثیت دی تھی جو مسلمانوں کے لیے کہ تھوڑی تھی۔ اس مندر کے تہ خانے بھی تھے۔ اس میں غلام گردنیں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ دھل کے بڑے پندت کو معلوم تھا کہ غزنی کی فوج کے دکانداروں کو نشے کے زیر اثر لایا جا رہا ہے اور ان کے ہاتھوں محمود غزنوی کو قتل کر لیا جائے گا کیونکہ محمود تک اُس کی اپنی فوج کا ہی کوئی آدمی پہنچ سکتا ہے۔

ان دونوں کے لیے مندر کے تہ خانے میں دو کمرے تیار کئے گئے تھے۔ انہیں کسی عمل کے کمرے بنا دیا گیا تھا۔ اندر ایسی خوشبو جوتھی تھی جو بدبو شہی اور سردو دھاری کر دیتی تھی۔ بہتر نرم و گداز تھے اور چھتوں کے ساتھ رنگین فانوس لگ رہے تھے۔ یہ دو کمرے اندر جب دھل پہنچے تو ان کا استقبال کرنے والے ان کے آگے ٹھک گئے اور انہیں اپنے اپنے کمرے میں لے گئے۔ ان کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے عورتیں آ گئیں۔ دو جوان انہیں تھیں۔

بڑے پندت نے انہیں لانے والوں کو الگ کر کے یہ خبر سنا لی کہ سلطان محمود غزنی چلا گیا ہے اور اپنی ٹھوڑی سی فوج نگر کوٹ میں چھوڑ گیا ہے۔ یہ بات انہیں چل سکا

محمد بن موری کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اپنی قوم سے بے وفائی کرنے والوں کا انجام اچھا نہیں ہوگا۔ سلطنت اسلامیہ کو یہاں تسلیم میں تقسیم کر کے حکمران بننے والوں کے تحت ہی تینیں زمین بھی نکل جایا کرتی ہے۔ قوم کو دھوکے میں رکھ کر لوگوں کو قوم سے الگ کرنا اور لڑانا ایسا گناہ ہے جس کی سزا خدا دے گا۔ لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے ہاتھ میں قرآن لے کر توت پر بیٹھے والوں کے لیے ان کے اپنے عمل جہنم بن جائے گے۔ اگر اپنی دنیا اور اپنی باقیات سٹورنا چاہتے ہو تو میرا ساتھ دو میرے ساتھ ہندوستان چلو۔ دہلی محمد بن قاسم کی سرزمین بیت خاندن بن گئی ہے۔ آؤ، دہلی چل کر مسجدوں کو آباد کرتے اور انسانوں کو ہر لحاظ سے تقسیم دکھاتے ہیں۔

سلطان محمود نے پیغام میں لکھا کہ میں تمہارے آگے درخواست پیش نہیں کر رہا۔ یہاں فوجی تہیں جس انجام تک پہنچائے گی، میں تہیں وہ انجام دکھا رہا ہوں۔ بھولان کا لڑتے ہیں جی میں بھیجے گا جہاں تاریخ رہتی دنیا تک ہم پر لعنت بھیجتی رہے گی۔

میں تہیں وہ دنوں کی بہت دیتا ہوں۔ میرے پاس آنا چاہو تو بھائیوں کی طرح آجاؤ۔ یہ نہ نہیں تو اپنی فوج واپس لے جاؤ۔

ایلی جب محمد بن موری کے پاس پہنچا تو اُس نے رعوت سے پیغام لپٹی کے ہاتھ سے چھپا اور بولا۔ صلح کا پیغام لائے ہو۔ ایلی خاموش کھڑا رہا۔

محمد بن موری نے پیغام پڑھا اور تہقہ لگا کر بولا۔ کیا تمہارے سلطان نے مجھے بھی اندھا بنانے کی رٹ بولی ہے؟ جاؤ، اُس بد صورت سے کہو کہ محمد بن موری تمہارے کہنے سے نہیں جائے گا۔ بہت ہے تو خود آؤ، ہم جانے کے لیے نہیں آئے۔

اُس نے گرج کر کہا۔ جاؤ، اور اُس غلام بن غلام سے کہو کہ آجاؤ اور غزنی کی سلطنت طشتری پر رکھ کر لانا۔

سلطان محمود غزنوی کو ان لوگوں سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی۔ غور کے یہ لوگ جگہ کم اور لڑے زیادہ تھے۔ سلطان محمود غزنوی کے والد سلطان بگٹین کے دور میں بھی بگٹین نے غزنوی کے علاقے میں ٹوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اب سلطان محمود انہیں فیصلہ کن

سلطان محمود کے دوسرے مسلمان دشمن سرزمینوں کی مدد کے لیے آسکتے تھے۔ سلطان محمود کو اطلاع اُس وقت مل جب وہ نگر کوٹ کا میاں کے ہوئے تھا۔ اس اطلاع پر وہ بھگٹین کا اسی غصے میں اُس نے نگر کوٹ پر غارت گاہی دے دیا۔ یہ غارت گاہی دیرانہ اور اتنی ہیبت انگ تھی کہ غلیے والوں نے مقابلہ ترک کر دیا اور تہقہ ڈال دیے۔ مندر کا صفیاء کر کے، بٹوں کو اور سے بچے چھین کر اُس نے فوج کو یوں تقسیم کیا کہ ایک حصہ اپنے ساتھ غزنی لے جانے کے لیے الگ کیا اور دوسرا نگر کوٹ میں رہنے دیا۔

اُس کا کونج بہت تیز ہو کر رہا تھا۔ اُس وقت کے دہلی کے غزنوی لوگوں کے مددگار سلطان محمود جتنا غصے میں تھا، اتنا غصے میں اسے بھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے دشمن کے عوام کو بھی پریشان نہیں کیا تھا۔ اُس کی لڑائی فوجوں کے ساتھ ہوتی تھی۔ اپنے حریفوں کے لیے وہ سراپا تہقہ گراہ کے غزنی کو جاتے ہوئے اُس نے اپنی فوج کو یہ حکم دیا کہ بڑا دست کم ہوں گے اس لیے سوار اپنے گھوڑوں کو کھیتوں میں سے گزائیں تاکہ گھوڑے چلتے چلتے فصل کھاتے چلیں۔ اسیٹوں، اونٹوں اور بیل گاڑیوں کے بیلوں کے لیے بھی یہی حکم دیا گیا۔ پادہ فوج کو حکم دیا گیا کہ راستے میں کوئی بھی بڑا گاؤں آئے، اُس کے لوگوں سے کہیں کہ خود چلائیں، آگاہی دہلی اور دہلیان پکاویں۔

مورے لکھتے ہیں کہ محمود غزنوی کی فوج جس راستے سے گزری، فصلوں کا صفایا کرتی تھی۔ راستے میں آنے والے دیہات میں اسیٹ نہ رہا۔ وہاں دیکھیں نہ رہا۔ بعض جگہوں پر فوج نے میوٹی ڈنکے اندکھا گئے۔ صرف غلیے ایک مورے جس نے سلطان محمود کے ان احکام کی وفاداری کی ہے۔ اُس نے لکھا ہے کہ سلطان کو سڑیوں پر بھی غصہ تھا لیکن زیادہ تر غصہ پنجاب کے راجہ اندھیاں پر تھا کیونکہ وہ باجگزار ہوئے جوئے ہندوستان کی یا سلطان کی فوجیں اکٹھی کر کے انہیں متحدہ کمان میں لے لیتا، اور غزنی پر حملے کے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ چنانچہ سلطان محمود نے اندھیاں کو نڈانے کے لیے حکم دیا تھا کہ پنجاب میں سے گزرتے ہوئے اس میں کچھ بھی نہ چھوڑا جائے۔

سوریں کی توقع کے خلاف سلطان محمود بہت جلدی غزنی پہنچ گیا۔ اُس نے اپنا اپنی

تصادف خوریز تھا۔ سلطان محمود آہستہ آہستہ پیچھے ہٹنے لگا۔ محمودی دربار اُس نے
اس حکم دیا جس نے اُس کے ہاتھ لگا کر دیا۔ سلطان نے چلا کر کہا۔ بھاگو بھاگو
سُوری کی کونڈہ میرے۔ ۷۔ اور وہ پیچھے کو بھاگ اُٹھا۔
اُس کی صفوں اور آوازیں سنائی دیں۔ بھاگو۔ سُوری آ رہے ہیں بھاگو۔
بر آوازیں سُوریوں نے بھی نہیں محمد بن سُوری دیکھ رہا تھا۔ اُس نے حکم دیا۔ تعاقب کرو۔
اپنی غزنی تک نہ پہنچنے دو۔ اور اُس نے یہ حکم بھی دیا۔ سلطان محمود کو زندہ میرے
سامنے لاؤ۔۔۔ غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دو۔

سُوری لشکر تعاقب میں فصل پڑا کیمپ خالی ہو گیا۔ کم و بیش تین میل دُور جا کر سلطان محمود
نے پانی روک دی اور دستوں کو جو پہلے دی ہوئی ہدایت کے مطابق ترتیب اور نظم سے
جھاگ رہے تھے، پیچھے ہٹنے کا حکم دیا۔ کمانڈروں کو اس چال کا پہلے سے علم تھا۔ سلطان نے
پچھے ہٹ کر اپنے لشکر میں آتے سُوریوں کا آگے سامنے کا مقابلہ کیا۔ سالار التمن تاش اور
سالار ارسلان جاذب اس چال کے منتظر تھے۔ ان میں سے ایک نے سُوریوں کے کیمپ
کا راستہ روک لیا، اور دوسرے نے پہلے سے حکم دیا۔ سورج غلی نے لکھا ہے۔ سیدھے
ہمارے سُوری سلطان محمود جیسے شاطر جنرل کے پھنسے میں آگئے اور اب جو لڑائی ہو رہی
تھی یہ غزنی کی فوج کے ہاتھوں سُوری فوج کا قتل عام تھا۔

سورج غروب ہونے سے پہلے سُوریوں کا سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ محمد بن بھی
جھاگ نہ سکا۔ اُسے ایک کھڈ میں سے پکڑا گیا جہاں دوہلے دو درباریوں کے ساتھ پھنسا بیٹھا
تھا۔ ابن مینوں کو سلطان محمود کے خیمے میں پیش کیا گیا۔

”مہمدا۔ سلطان محمود نے کہا۔ میں نے پرسوں جو تمہیں لکھا تھا وہ آج ایک حقیقت
بن کر تمہارے سامنے آ گیا ہے۔ بیٹیں شکست دے کر بھگے خوشی نہیں ہوئی۔ آج جن دونوں
فوجوں کا خون بہہ گیا ہے، انہیں کسی اور مقصد کے لیے لانا تھا۔ خدا کا یہ قانون میری کج سے
بلا ہے کہ گناہگار حکمرانوں کی مزار بے گناہ عیلا کو بھی ملتی ہے۔“

سلطان محمود لڑ رہا تھا کہ محمد بن سُوری کا پہلے مر ڈلا، پھر وہ گھنٹوں کے بل گرا

شکست دینے کا نتیجہ کر چکا تھا۔ پہلی بار تھی کہ سُوری دس ہزار فوج لے کر کراہور غزنی کی طرف
کے اندر خیمہ زن ہو گیا تھا۔ سلطان محمود نے اپنے دو جنرلوں التمن تاش اور ارسلان جاذب
سے کہا کہ وہ سُوری خاندان کو مرنے کے لیے ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

سلطان محمود نے بھیس بلا اور سُوریوں کا کیمپ دیکھنے چلا گیا۔ اُس نے دل ہی
دل میں سُوریوں کے دفاعی انتظامات کی تعریف کی اور سوچنے لگا کہ وہ ان کے اسی
کیمپ کو ان کا قبرستان کس طرح بنا سکتا ہے لیکن اُسے یہ کام آسان نظر نہیں آتا تھا۔
حصہ کے مقام پر سلطان نے اپنے دستوں کو بالکل اسی طرح کے کیمپ میں رکھا اور
کر خندق کھدوائی تھی۔ دشمن کی فیمس ہزار نفری نے کیمپ پر قبضہ بولا تھا تو نقصان دشمن
کا ہی ہوا تھا۔ سُوریوں کا اسی قسم کا دفاع دیکھ کر سلطان محمود پریشان ہو گیا۔ واپس آکر
اُس نے اپنے سالاروں کو تفصیل سے بتایا کہ دشمن خندق کے پیچھے ہے جہاں سے اُسے
لگان آسان نہیں ہو گا۔

راستہ بھر سورج بیمار ہوئی رہی اور رات کو ہی سلطان محمود نے فوج کو پیش قدمی کا
حکم دے دیا۔ فوج کو دشمن کے کیمپ سے کچھ دُور تیاری کی حالت میں رکنے کو کہلایا
سلطان خود بھی روانہ ہو گیا اور جاتے ہی اُس نے حملے کا حکم دے دیا۔ سُوری پُرلڑا
نے غزنی کی فوج کو قریب نہ آنے دیا۔ سلطان محمود نے اُس جگہ پر قبضہ کرنے کا حکم دیا جہاں
خندق نہیں تھی۔ کیمپ کے اندر باہر آنے جانے کا فراخ راستہ تھا مگر سُوریوں نے
باہر آ کر آگے سامنے کا سورج کی طرف سے لڑا کر غزنیوں کے پاؤں اکھڑنے لگے۔

سُوری آگے آتے، لڑتے اسی پیچھے ہٹ کر کیمپ میں چلے جاتے۔ ان پر کسی اور
طرف سے حملہ نہیں کیا جاسکتا تھا کیونکہ ہر طرف ہاڈیاں بھی تھیں اور خندق بھی۔ یہ پہرے
دقت سلطان محمود نے اپنے دونوں سالاروں کو ایک اور چال بتائی اور اس کے مطابق خود
بڑا بولا محمد بن سُوری نے دیکھ لیا کہ سلطان خود آ رہے۔ اُس وقت تک غزنی کی فوج کا
بہت نقصان ہو چکا تھا جس سے سُوریوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ محمد بن سُوری نے
سلطان محمود پر دھاوا بھانے کے لیے اُس کا ہڈ روکنے کو زیادہ نفری کے دو دستے باہر
بجھ دیے۔

وہ کا حوصلہ پست ہو چکا ہے۔ ہندوؤں کی یہ حالت ہے کہ گھٹائیں گرجتی اور جلتی ہیں تو وہ مندروں کو دہڑاتے ہیں یا اپنے گھروں میں رکھے ہوئے بتوں اور مورتیوں کے آگے ہاتھ جوڑ کر بیٹھ جاتے اور دروکران سے رجم مانگتے اور گناہوں سے توبہ کرتے ہیں۔

یہ صورت حال سلطان محمود کے لیے موزوں تھی۔ اُس نے پشاور پہنچ کر ہندوستان کو مدد ملے اور ایک دہلی بٹلا دیا۔ ایک بھڑو اور ملتان پیغام لے کر گیا اور دوسرا نگر کوٹ دیاں کے ملاروں کو (جن کے رتبے آج کے گورنروں جیسے تھے) یہ پیغام دیا گیا تھا کہ وہ فوج کا کچھ حصہ باہل تیار کی حالت میں رکھیں۔ پیغام میں انہیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ تھانوسر پر حملہ کیا جا رہا ہے۔

ایک کربخا کے راجہ اندھال کے پاس اس پیغام کے ساتھ بھیجا گیا کہ سلطان محمود کی فوج پنجاب میں سے گزرنے کی یہاں سے کے مطابق راجہ اندھال کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے کہ غزنی کی فوج بھناٹت گذر جائے اور اس کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ بنے۔ کوئی مزاحمت نہ کرے۔ اور یہ بھی کہ انہیں اب دوسری باتوں کی فوج کی کھانکے تھے فوج ربنڈے۔ اگر اُس نے ایسا کیا تو یہ سمجھا جائے گا کہ راجہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور پھر سلطان کو قحطی پہنچا ہے کہ وہ پہلے لاہور پر اور پھر پنجاب کے دوسرے دارالحکومت بھٹنڈہ پر حملہ کر کے دونوں شہروں کی اینٹ سے اینٹ بھاوے۔

راجہ نے پال نے اپنے ایک بھائی (جس کا نام تاریخ میں سنسکرت کی زبان میں دو ہزار سوا سلطان محمود غزنوی کے استقبال کے لیے بھیجے اور ساتھ ساتھ قاسم فرشتہ کی تحریر کے مطابق) یہ پیغام بھیج دیا۔ اور میرا سفر بھی۔ اسے میں آپ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پہنچ رہا ہوں کہ تھانوسر ہماری سب سے بڑی اور سب سے زیادہ مقدس عبادت گاہ ہے۔ اگر یہ فرض آپ پر آپ کے مذہب کی طرف سے عام ہوتا ہے کہ دوسروں کے مذہب کو ختم کریں تو آپ نگر کوٹ کی تباہی سے اپنا یہ فرض پورا کر چکے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ آپ تھانوسر کے متعلق اپنے ارادے بدل دیں میں اس کے عوض سالانہ خراج دیا کروں گا۔ یہاں تک کہ آپ کی فوج پر جو غرض ہو ہے اور واپس جانے کا جو غرض ہو گا، وہ میں ادا کروں گا۔ اس کے علاوہ میں آپ کو پیاسا ہاتھی

اور لڑاکا گیا۔ اسے سنبھالنے لگے تو دیکھا کہ اُس کی آنکھیں پھٹائی ہوئی تھیں۔ وہ مر گیا تھا۔ اُس کے ساتھ جو درباری تھے، انہوں نے بتایا کہ محمد بن سدی نے جو انگوٹھی پہن رکھی ہے، اس میں زہر ملا ہوا تھا۔ اُس نے جب دیکھا کہ فوج مان گئی ہے اور اُس کے اپنے نکل بھاگنے کی کوئی صورت نہیں رہی تو اس ساتھ لے کر یہ ایک کھڑ میں اُتر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے انگوٹھی سے ہیرا نکالا اور نکل لیا اور فوراً بعد اسے پکڑنے والے پہنچ گئے۔

یہ معرکہ ۱۰۱۰ (۱۱ مہری) کے موسم گرما میں لڑا گیا۔

سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان سے آئے چھ سات ہیبت گذر گئے تھے۔ اُسے اطلاع ملی تھی کہ دہلی سے تیس چالیس میل مغرب کی طرف تھانوسر میں بہت بڑا مندر ہے جس میں بہت سے بت ہیں۔ ان میں ایک بت جگ سو نام کا ہے جس کے متعلق ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اسی کی پرستش کی تھی۔ بعض مورتیوں نے اسے چکر سوامی کہا ہے اور یہ بھی کہ یہ دشمنوں کا بت تھا۔ اس قدر مقدس سمجھا جاتا تھا کہ دور دور سے ہندو اس کی پوجا کرنے کے لیے آتے اور وہی درجہ حاصل کرنے جو مسلمانوں میں حاجیوں کو حاصل ہوتا ہے۔

سلطان محمود ایک تو اپنے عقیدے کے زیر اثر تھانوسر کے مندر کو تباہ کرنا چاہتا تھا، دوسرے اس لیے اُس نے فوراً کوچ کا حکم دے دیا تھا کہ اُسے معلوم تھا کہ ہندوستان کے راجے مبارزے ابھی چھڑکی جگ اور نگر کوٹ کی لڑائی سے سنبھلے نہیں ہوں گے۔ اُسے اپنے جاسوسوں نے بتایا تھا کہ ہندوستانی ریاستوں کی فوجوں پر غزنی کی فوج کی دہشت طاری ہے اور ان کے حوصلے پست ہیں۔ حوصلہ پست ہونے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان کے خدائوں کے بت توڑ دیتے گئے تھے اور سلطان فوجی ان کے سامنے کھڑے نہ کر کے کھاتے رہتے تھے۔ کاسے ہندوؤں کی کوتاہی تھی۔

جاسوسوں نے یہ اطلاع غزنی پہنچادی تھی کہ ہندوستانی فوج کا یہ نہیں پوری

اور کچھ بیش قیمت ہیرے جواہرات بھی پیش کر دیں گے۔

بغراخان کے زخم اور چوٹیں ٹھیک ہو گئیں اور وہ بھل گئے دوزن کے قابل ہو گیا۔ انگلیں اور وہ مل بیٹھے اور گپ شپ لگاتے تھے۔ اپنے سزبانوں کے ساتھ صرف بغراخان بات کرتا تھا کیونکہ یہاں کی زبان وہی بکھتا تھا۔ دوزن نے تین چار دن خاموشی اختیار کئے رکھی۔ آخر انگلیں نے بغراخان سے کہا کہ وہ لڑکیاں کہاں ہیں۔ اگر وہ مل جائیں تو وہ یہاں رہیں گے ورنہ اپنی فوج میں چلے جائیں گے۔

ایک روز بغراخان نے اپنے ایک میزبان سے پوچھا کہ وہ لڑکیاں کہاں چلی گئی ہیں۔ یہ میزبان وہی تھا جو دوش یا جگ کے ہیرے میں انہیں پہنا کر لے لایا تھا۔ یہاں وہ اصل روپ میں تھا۔ اُس کے چہرے پر رازمی نہیں تھی اور اس کی آواز بھی بناوٹی نہیں تھی۔

”تم دیویوں کو اپنے پاس بلانا چاہتے ہو؟“ اس آدمی نے کہا۔ ”وہ انسان نہیں۔ تم چمکے کر کوٹ کے مندر کے بت توڑنے والوں میں نہیں تھے اور تم زخمی ہو گئے تھے، اس لیے یہ دیویاں انسانوں کے روپ میں تمہارے پاس پہنچ گئیں اور انہوں نے تمہاری تہذیب دہائی کی۔ وہ تمہارے ساتھ انسانوں کی طرح باتیں کرتی رہیں۔۔۔“

”تم نے اُن سے پیار مانگا تو انہوں نے تم سے پیار بھی کیا لیکن انہوں نے تمہیں بدی کی طرف نہیں جانے دیا۔ تم نے بڑی نیت بنا کر کی تو انہوں نے ہنس کھیل کر بندے دل سے بُرے خیال نکال دیئے۔ یہ اُن کا حکم تھا کہ تم دونوں کو فوج کی اتنی سخت زندگی سے، جگ و جبل اور قتل و غارت سے نکال کر شان زندگی میں رکھا جائے۔“

”نہیں۔۔۔“ بغراخان نے کہا۔ ”یہ غلط ہے۔ نہ ہر لحاظ سے انسان نہیں۔۔۔“ وہ انسان نہیں تھیں۔۔۔ اس آدمی نے بغراخان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں اور لب سے لب میں کہنے لگا۔ ”وہ انسان نہیں تھیں۔ تم اُن کے بچاری ہو۔ ہتھاری روج اُن کے قبضے میں ہے۔“

”اے!“ بغراخان نے خوابناک آواز میں کہا۔ ”میں اُن کا بچاری ہوں۔۔۔۔۔ میری مدد اُن کے قبضے میں ہے۔“

تمام فرشتے لکھا ہے کہ سلطان محمود نے اس پیغام کا یہ جواب دیا۔ ”میرے لیے خدا اور رسولِ مسلم کا حکم ہے کہ جہاں کہیں بُت پرستی جو دنیاں جانوں اور بتوں کو تباہ کر دے۔ میرے رسولِ مسلم کا نظریہ ہے کہ خدا اس کا اجر اگلے جہان میں دے گا۔ میں آپ سے بُت نہ توڑنے کا انعام قبول نہیں کر سکتا۔ میرے پاس کوئی جواز نہیں کہ تمہیں کابُت خاندانہ توڑوں۔“

کئی سوئش نے یہ نہیں بتایا کہ راجا اندھیا کو کس طرح پرہ چلا تھا کہ سلطان محمود تمہیں خبردار ہے۔ البتہ ان واقعات پر سب متفق ہیں کہ راجا اندھیا کے جواب میں سلطان نے اس کی پیش کش اور درخواست قبول نہ کی اور راجا اندھیا نے دکن، حیدرآباد، گجرات اور قنوج کے مہاراجوں کی طرف قاصد بھیج دیئے کہ غزنی کا سلطان محمود ہمای طرف سے کسی اشتعال کے بغیر ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے اور اس کا ارادہ تھا ہیرے کے دشنہ مندر کو تباہ کرنے کا ہے۔

تھا ہیرے میں سلطان محمود غزنوی کے قتل کا انتظام ہو چکا تھا۔

۱۰۱۱ء (۴۰۲ ہجری) کا سال تھا۔ سلطان کو نگر کوٹ سے شگئے ابھی ایک سال نہیں گزرا تھا۔ اُس کے دو کمانڈر بغراخان اور انگلیں جولایت ہو گئے تھے، ان کے گھروں کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ ان کے ماسے جانے کی کوئی شہادت نہیں ملے اس لیے یہ یقین ہے کہ وہ ہندوستانی فوج کے قیدی ہیں۔

وہ قیدی نہیں شہزادے تھے۔ اس عرصے میں اُن کی جیسے دھیں بھی مل جاتی تھیں۔ انہیں جب کوئی آواز اور چیز کھلا کر اور پہنا کر کر کے تھا ہیرے لایا گیا تھا تو دونوں کو الگ الگ کمرے دیئے گئے تھے اور اُن کی خدمت کے لیے غزنوی مقرر کی گئی تھیں۔ وہ آئے اُن دو جوان اور بے حد خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ تھے جو انہیں نگر کوٹ کے ایک گاؤں میں ملی تھیں۔ تھا ہیرے میں وہ اُن سے جدا کر دی گئی تھیں۔

نُزراخان کے ذہن پر یہ شہدہ باز قابض ہو چکا تھا۔ اب وہ عامل تھا اور بُزراخان کا ذہن پہلے ہی اُس کے اپنے قبضے سے نکل چکا تھا۔ یہ شراب کا اثر تھا جو وہ اور انگلیں خودی پیٹنے لگے تھے اور یہ اُس لاشہ آور دلالی کا بھی اثر تھا جو ان دونوں کو شراب میں اور کھانے میں کھلائی جاتی تھی۔

انگلیں کو دوسرے شہدہ باز نے اپنے زیر اثر لے رکھا تھا۔ اُن کی خدمت اور دیکھ بھال شہزادوں کی طرح ہوتی تھی۔ وہ جھوٹے گزرتے تھے، لوگ رکتے اور اُن کے آگے غائب جاتے تھے۔

دو تین بیٹے ان پر کسی عمل جاری رہا جب یقین ہو گیا کہ اُن کے ذہن اُن کے اپنے قبضے سے پوری طرح نکل گئے ہیں تو انہیں ایک رات کہا گیا کہ انہیں اُن کی دیوہوں نے بلایا ہے۔ دونوں کو مندر کے باغ میں لے جایا گیا۔ راستہ کی تلاشی تھی۔ باغ خوشنما تھا۔ انہیں ایک مندر پر بٹھادیا گیا۔ قندیلیں جل رہی تھیں۔ اُن کے سامنے پندرہ بیس دم دور دو گھرے رکھے تھے۔ ان پر چکڑا پکڑے پلٹے ہوئے تھے۔ قندیلوں کی روشنی میں یہ رنگوں کی طرح چمکتے تھے۔

ستار کے تار جھنجھانے لگے اور دھما دھما اور دھدھاکس رگٹ الاپنے لگے۔ ماحول پر ہلار سا ہو گیا۔ منبری کی نے سنا کی دینے لگی۔ منبری اور ستار کی سنگت نے ظہر ہٹا دی کر دیا اور اس ظہر میں دونوں لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ کوئی نہ دیکھ سکا کہ وہ پھولدار پلوؤں کے پیچھے سے نکلیں یا درختوں کے پیچھے سے۔ ان کے لباس اتنے باریک کپڑے کے تھے جن میں سے اُن کے جسم نکل آتے تھے۔ اُن کے سر میں پر اور دھنیاں نہیں تھیں۔ اور انہیں

اُن کے بال ہی تھے جو اُن کے شانوں پر اور کچھ آگے سینے پر پکھیرے ہوئے تھے۔ ہوا سے اُن میں لہریں اٹھتی تھیں۔

وہ جو پہلی بار انہیں سب نے ہاتھ جڑ دیتے اور سجدے میں پہلے گئے بُزراخان اور انگلیں نے نہ دیا۔ وہ سمجھ گیا۔ وہ بہت جو کر دیکھتے رہے۔ لڑکیاں یوں

نہایت آہستہ آہستہ چل رہی تھیں کہ اُن کے قدم اٹھتے نظر نہیں آتے تھے۔ سب سجدے سے اٹھے۔ لڑکیاں لوگروں کے پاس ٹک گئیں۔ انہوں نے دونوں بازو آگے کر کے ہاتھ پھیلا دیے اور ایک لڑکی ایک نوکرے میں اور دوسری دوسرے نوکرے میں کھڑی ہو گئی۔ وہ گھنٹوں تک نوکروں میں چھپ گئیں۔ پھر وہ آہستہ آہستہ اس میں بیٹھے انگلیں اور نوکروں میں غائب ہو گئیں۔

بڑے پنڈت نے بُزراخان اور انگلیں سے کہا کہ جادو اور نوکروں میں دیکھو۔ دونوں آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ وہ سکوڑتے۔ نوکروں سے تین چار قدم دُڑتے کہ نوکروں میں سے ایک ایک کبوتر اڑا اور رات کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ دونوں کمانداروں نے نوکروں میں جا کر دیکھا۔ نوکرے خالی تھے۔

”وہ دیویاں ہیں۔ ایک پنڈت نے آگے بڑھ کر انہیں کہا۔ صرف تھارے بیسے زندہ ٹوپ میں آئی تھیں۔ انہوں نے تم پر خاص کرم کیا ہے کہ آج ہم سب تھارے غلام ہیں اور تم ہمارے بادشاہ ہو۔ یاد رکھ کر کیا تھے، کہاں تھے، تھاری زمانگی کیا تھی۔ دیوہوں نے ہمیں اشارہ دیا ہے کہ وہ تھارے لیے ایسے بھی دو لڑکیاں بھیج دیں گی۔“ کیا یہ ہیں پھر بھی نظر آئیں گی؟“ بُزراخان نے پوچھا۔

”دیویاں دیوتا ہماری خواہشوں کے غلام نہیں ہوتے۔“ انہیں پنڈت نے کہا۔ ”تم پر یہ دونوں اس لیے خوش ہوئی تھیں کہ تم نے نگر کوٹ کے جوتوں کی توہین نہیں کی تھی اور تم جوتوں کی توہین کرنے والے سلطان کی فرج سے الگ ہو گئے تھے۔ یہ دیویاں بُت ہیں۔ دیکھنے میں بھتر ہیں۔ ہم تمہیں اُن بچہ روپ بھی دکھائیں گے۔“

وہ جب اپنے کمرے میں آئے تو انگلیں نے بُزراخان سے کہا: ”میں بتایا جاتا تھا کہ یہ رات ان لوگوں کا مذہب باطل ہے اور یہ جوتوں کی عبادت کرتے ہیں۔ ان کا تعلق بڑے رات عالم غیب سے معلوم ہوتا ہے۔ ہم کس کی عبادت کرتے ہیں؟“

ان دونوں کے ذہنوں میں شکوک پیدا ہو گئے تھے۔ وہ اُسے مہوہو کھنسنے لگے تھے۔ وہ دیکھ سکیں جو انہیں سحر کر دے اور جو اتنا حسین ہو کہ اُن کے جذبات میں ٹپل بچا ہے۔ انسان تڑپ وہیں سے ہوتا ہے جہاں وہ جاتا ہے اور وہ

”وہ یہاں سے خوبصورت لڑکیاں اور زرد جواہرت لٹے آیا کرتا ہے۔“ اُن کے ذہن میں ڈالا جانے لگا۔ کیا تم اُن بتوں کی توہین کر کے جو تم نے دیکھے ہیں؟ جن دیولوں نے تساری کا باہٹ دی ہے کیا تم انہیں توڑ پھوڑ کو گئے؟ اب تمہارے لیے یہ خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ سلطان محمود اگر یہاں آگیا اور اُس نے اُن بتوں کو توڑا تو اس کے ساتھ ہی تم دونوں کے جسم لیے آپ ہی کٹنے لگیں گے۔ بتوں کا ایک بازو نوٹے گا تو تمہارے جسموں سے ایک ایک بازو ٹپک ہو جائے گا۔ دیویاں مرا نہیں کریں۔ ہم بھی نہیں مر گے مگر تمہارے جسم کو جی اور لالچ جو جاتیں گے اور تم دیولوں میں بڑے بڑے رہو گے۔“

”کیا سلطان محمود یہاں بھی آئے گا؟“ لُہراخان نے پوچھا۔

”مشاید آجائے۔“

”آئے دو۔“ لُہراخان نے کہا۔ وہ زمین واپس نہیں جائے گا۔ چارپانچ بیسوں بعد اُن میں یہ تبدیلی آئی جیسے وہ کسی کمرے میں شعلے یا کسی نئے کے زیر اثر نہیں بلکہ اُن کی باتیں اور ان کی حرکتیں شعور کی معلوم ہوتی تھیں۔ وہ اب یوں نہیں چلتے تھے جیسے خواب میں چل رہے ہوں اور وہ یوں نہیں بولتے تھے جیسے نمندیں بول رہے ہوں۔ وہ اب مندر سے باہر بھی جاتے تھے اور داخل انسانوں کی طرح گھومتے پھرتے تھے۔

ایک روز دونوں باہر ایک باغ میں سیر کو گئے۔ انہیں آواز سنائی دی۔ انگلیں! انہوں نے چونک کر دیکھا۔ ایک چوکی جو بندھ گھٹا تھا، اُن کی طرف آ رہا تھا۔ اُس کے ماتھے پر رنگ سے آدم لکھا ہوا تھا۔ اُس کے سر پر بندھوں کی پٹیا تھی۔ اس نے قریب آ کر غزنی کی زبان میں کہا۔ ”تمہارے متعلق ہمیں بتایا نہیں گیا کہ آج وہ کہاں ہو؟“

”اے! انگلیں نے حیرت سے کہا۔ تم بےید ہو؟“

وہ ایک دوسرے کو جانتے تھے کبھی ایک ہی دستے میں تھے بعد کو جاسوسی کے لیے منتخب کر لیا گیا تھا۔ وہ باہر اور زمین چھا رہا تھا۔ وہ لُہراخان کو نہیں جانتا تھا۔ انگلیں نے اس کو بتایا کہ لُہراخان کون ہے مگر یہ نہ بتایا کہ وہ کس طرح یہاں آئے ہیں۔ بعد ہی کھتا

اُسی چیز کو جتنا کھتا ہے جو اُس کی جسمانی ضرورت پوری کرے اور اُسے جسمانی لذت پہنچا کرے۔ ایسے ہی انسان شعلہ بازی کو مجبور کہتے اور جھڈ پانی اور دغریب باتوں سے کھد جو جاتے ہیں۔ انسان جس قدر مہویت پرست اور جس قدر کم فہم ہوتا ہے، اتنی ہی جلدی سکھ رہتا ہے۔ جس دور میں انسان بیچارہزم سے واقف نہیں تھا، وہ اُس وقت بھی بیچارہزم کو کرنا تھا۔

”معلوم ہوتا ہے ان کے ملک میں جاوہر گری نہیں ہے۔“ پنڈت نے اپنے شعلہ باز سے کہا۔ ”وہ یہ دونوں اتنے حیران نہ ہوتے۔ ہمارے ہاں کسی کو کوڑے میں کھڑا کر کے غائب کر دینا معمول کی قسم کی شعلہ بازی ہے۔۔۔۔۔ انہیں کچھ اور کرب دکھاؤ۔ میں اب تہل ہوتا جا رہا ہوں کہ انہیں ہم استعمال کر سکیں گے۔ اگر ان کے ہاتھوں سلطان محمود کو قتل نہ کرایا جاسکا تو گڑگوٹ کے سالار اور دوسرے اہم آدمیوں کو قتل کرایا جاسکتا ہے۔“

”شعلہ بازی کے ساتھ بُونی نے بھی خوب اڑ دکھایا ہے۔“ اس فن کے ماہر نے کہا۔

”انہیں اب یہ لڑکیاں بتوں کے روپ میں دکھاؤ۔“

اور ایک رات انہیں یہ بُت بھی دکھا دیے گئے۔ مندر کی عبادت گاہ میں دو چوڑے تھے جن پر پھولدار کپڑے کپھے ہوئے تھے۔ ان پر یوں بان جل رہا تھا جس کا دھواں غیر معمولی دھواں لیکروں کی طرح اوپر اُٹھ رہا تھا اور بتوں کے گرد لپٹ لپٹ جاتا تھا۔ روشنی بتوں کے نیچے اور نیچے روشنی تھی۔ بُت پہلنے جاتے تھے۔ یہ وہی لڑکیاں تھیں۔ مادر زاد برسرِ جہول پر کھڑی تھیں۔ بے جان بُت لگی تھیں۔ اُن کی آنکھیں بند تھیں۔ پنڈت نے سب سے کہا کہ ماتھے پر گڑو۔ سب نے ماتھے پر گڑو لگا دیئے۔ لُہراخان اور انگلیں بھی سجدے میں چلے گئے۔

اُس رات کے بعد اُن کی اصلیت اور اُن کی قومیت ختم ہو گئی۔ اُن کی ہر ایک جسمانی ضرورت پوری کرنے کا انتظام کر دیا گیا۔ سحر کامل بھی جاری رہا، شعلہ بازی بھی ہوتی رہی اور سب اُن کے متعلق یقین ہو گیا کہ اب اُصیت اور حقیقت کی طرف اُن کی واپسی کا خطرہ ختم ہو گیا۔ تہند کے شعلہ بازوں نے اُن کے دماغوں میں سلطان محمود کے خلاف زہر بھرا

رہا کہ یہ دونوں جاسوسی کے لیے آئے ہیں۔

”سلطان بہت قریب آگیا ہے۔“ عبید نے کہا۔ ”تم نے کوئی خبر بھیجی ہے؟“
”تم نے کیا خبر بھیجی ہے؟“ انگلیں نے پوچھا۔

”بسیار خطرہ تو یہ ہے کہ پہلے کی طرح دوسرے ہمارا جوں کی توہیں بھی تھامیں کہ پکانے کے لیے جمع ہو جائیں گی۔“ عبید نے انہیں بتایا۔ ”مگر اب تک یہاں وہی فوج ہے جو پہلے سے یہاں موجود ہے۔“

انگلیں نے اسے بتایا کہ اُس نے بھڑا خان کے ساتھ مندر کے اند تک رسائی حاصل کر لی ہے اور وہ ہندوؤں کے ہندوؤں وغیرہ کو زیر اثر کیے ہوئے ہیں۔ انہوں نے عبید کو لندھیرے میں رکھا اور اسے پھر ہٹنے کے لیے کہہ کر مندر میں آگئے۔ عبید جب واپس جا رہا تھا تو اُسے ایک آدمی نے روک کر پوچھا کہ وہ کون ہے عبید نے اپنا کوئی ہندو نام بتایا۔ یہ آدمی انگلیں اور بھڑا خان کے ساتھ سائے کی طرح لگا رہتا تھا۔ وہ جہاں جاتے یہ انہیں پتہ چلے بغیر ان سے کچھ دور رہ کر ان پر نظر رکھتا تھا۔

عبید پر اسے شک ہوا کہ وہ ہندو نہیں، عبید نے اسے کہا کہ وہ بلا جبر سے آیا ہے اور اس کے ساتھ کچھ اور جگہ بھی ہیں اور انہوں نے جہاں میں ڈیرہ ڈال رکھا ہے۔ اس آدمی نے کہا کہ وہ ان کا ڈیرہ دیکھنا چاہتا ہے عبید نے اسے ساتھ لے گیا۔ جنگل میں واقعی چار یا پانچ جگہ اور سیاحی قسم کے آدمی موجود تھے گریہ آہی جو شک پر انہیں دیکھنے گیا تھا واپس آگیا۔ عبید اور اس کے ساتھیوں نے اسے پکار کر اس کے ہاتھ پاؤں ریتوں سے باندھ دیئے۔ خبر کی نوک اس کی شرت پر کھڑی اور پوچھا کہ اسے عبید پر کس طرح شک ہوا ہے۔

یہ ہندو پہلے تو کچھ بتانے سے گریز کر رہا تھا۔ اسے ایک درخت کے ساتھ اٹل انکا کہنے آگ جلا دی گئی۔ تھوڑی سی دیر میں ہندو کا مارا ٹھکانے آگیا اور اس نے چلا نا شروع کر دیا۔ اسے آواز کرتا گیا۔ اس نے انگلیں اور بھڑا خان کے تعلق ساری کہانی بیان کر دی اور بتایا کہ چونکہ وہ غزنی کی فوج کے کمانڈر ہیں اس لیے وہ سلطان محمود تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکیں گے۔ وہ سلطان کو بتائیں گے کہ وہ ہندوستان کی فوج کی قیادت سے فارغ ہوئے ہیں اور ان کے پاس برہمنی راز ہے جو صرف سلطان کو بتایا جائے گا۔ اس طرح وہ سلطان تک پہنچ کر

اُسے قتل کر دیں گے۔

اس آدمی کو انہوں نے رہا نہ کیا۔ جاسوس کا یہ گروہ جہاں ٹھہرا ہوا تھا، وہ گھسے جھل میں ایک ڈھل چھٹی جگہ تھی۔

بھڑا خان اور انگلیں جب مندر میں پہنچے تو وہاں کچھ گھبراہٹ اور بھگدڑ سی دیکھی۔ انہیں بتایا گیا کہ غزنی کی فوج آ رہی ہے اور اس کا رخ تھامیں کی طرف ہے۔ مندر کے بندت اور دیگر لوگ ہمارا بھڑا خان ہال اور دوسرے ہمارا جوں کی فوج کا انتظار کر رہے تھے مگر کوئی فوج آتی نظر نہیں آتی تھی۔

ان لوگوں کو معلوم نہ تھا کہ تمام راجوں ہمارا جوں کو اطلاع مل چکی ہے کہ سلطان محمود بھٹانیر پر حملہ کرنے آگیا ہے اور وہ اپنی فوجوں کو تیسری لاکھم دے چکے ہیں لیکن سلطان محمود کی ہشتادی سے یہ لوگ واقف نہیں تھے۔ وہ طوفان کی طرح آ رہا تھا۔ مندر صرف عبادت گاہ نہیں تھی یہ قلعہ تھا اور یہ فوجی ہیڈ کوارٹر بھی تھا جس پر ہندوؤں کا سایہ تھا۔ ان کے بھی جاسوس تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ سلطان محمود اگر اسی رفتار سے بڑھتا آتا تو وہ ایک دن اور رات میں پہنچ جائے گا۔

بھڑا خان اور انگلیں نے مندر میں یہ خبر سنائی مگر انہیں سلطان محمود کا ایک جاسوس ملا ہے اور اس کے ساتھ چند آدمی ہیں۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ کل صبح ان کی اُس سے پھر ملاقات ہوئی۔

مند میں جو فوجی تھے، انہوں نے ان دونوں سے کہا کہ وہ اس جاسوس سے ملیں اور اپنے آپ کو جاسوس ظاہر کر کے ان کا ٹھکانہ دیکھ لیں تاکہ انہیں پکڑ کر قتل کیا جاسکے۔ اس کے علاوہ ان دونوں کمانڈروں سے کہا گیا کہ وہ کل جاسوسوں کا ٹھکانہ معلوم کر کے اُدھر چلے جائیں جو مندر سے سلطان محمود کی فوج آ رہی ہے۔ یہ کہہ کر اس تک پہنچیں کہ وہ قید سے فارغ ہو کر آئے ہیں اور سلطان سے تنہائی میں ملنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اب تقریباً ایک سال کے عرصے میں بھڑا خان اور انگلیں بالکل ہی بدل گئے تھے اور یہ تبدیلی ہندوؤں کے عزائم کے مطابق تھی۔ دونوں سب جاتے ہوئے جالور بن چکے تھے۔

آگے جانے کی بجائے سب سے پہلے سلطان تھوڑی دیر میں پہنچ جائے گا۔
 سلطان محمود اپنے محافظوں کے ساتھ سیلاب کی طرح آگ آگھلا عیدہ راستے میں کھڑا
 ہو گیا۔ محافظ دہستے کا کمانڈر دودا بیک اس غیر کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کیا مگر آدھی
 قاتل اس نے بتایا کہ وہ کبوں راستے میں کھڑا ہو گیا ہے۔ اتنے میں سلطان محمود پہنچ گیا اور
 ملک کیا۔ عیدہ نے اسے ایک خبر تو یہ بتائی کہ تھانویس کے دفاع میں باہر سے کوئی فوج نہیں آئی
 اور قلعہ پر شہری بھی فوج کے ساتھ کھڑے ہو گئے ہیں۔

اور یہ دیکھ کر آپ کے قتل کے لیے تیار کیے گئے تھے۔ عیدہ نے سلطان محمود کو
 بتایا اور اس نے اس سے گرا لیا تھا وہ تفصیل سے سنایا۔

انہیں ساتھ رکھو۔ سلطان محمود نے کہا۔ انہیں کچھ کھانے کے لیے دیکھ پینے
 کے لیے بھوکے سے پریشان ہو جائیں تو بھی کچھ نہ دینا۔ اس طرح لڑتے اور دہائی کا اثر اتر
 جائے گا۔ پھر اس انہیں حقیقت دکھائیں گا۔
 وہ دونوں محکمہ کھڑے رہے اور سلطان محمود غزنوی آگے بڑھ گیا۔

سلطان محمود نے مدد حیات مل۔ تھانویس کے فوجی کمانڈر بھی دیکھ رہے تھے کہ غزنی کی فوج
 پہلے پہنچی ہے یا راجوں بہار جوں کی موخہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی برق رفتاری نے
 سب کو حیران کر دیا۔ اس کی کوشش بھی یہی تھی کہ ہندوستان کی فوجوں سے پہلے برف پر
 پیچھے رہ پہنچ گیا۔ اس نے دفاع کا جائزہ لیا اور محاصرے کی بجائے لیٹا کا حکم دے
 دیا۔ دیواروں کے اوپر پر دل کی ایسی پوچھا دیں ماریں کہ اوپر والے سر نہ اٹھا سکے۔ دلوں
 توڑ لیا گیا۔ ہندوؤں کی فوج میں بھگدڑ پانے کے لیے سلطان نے حکم دے دیا کہ سر کو ٹوٹ
 لیا جائے۔ ایسی قیامت پیاہولی کہ دفاع ٹوٹ گیا۔

مندے میں جا کر سلطان محمود نے تمام بہت باہر بھینک کر توڑ دیئے کا حکم دیا لیکن
 سب سے زیادہ مدد سب جس کی خاطر تھانویس سارے ملک کی عبادت گاہ بنائے
 تھا، جگ سوا تھا۔ اسے ہٹا دیا گیا جاتا تھا۔ سلطان نے حکم دیا کہ اس بہت کو سارے غزنی

ان کے ذہن اور ان کی روح میں ان کی اپنی نہیں رہی تھیں۔ عورت کے جس شراب اور حیوانی
 خیالات نے انہیں انسانیت کے ورے سے سچی گرا دیا تھا۔ انہیں کاؤں والی دونوں رکھیں
 کے دونوں بہت کئی بار دکھائے گئے تھے اور وہ ان کے بھاری بن گئے تھے۔ وہ کسی بھی وقت
 محسوس نہ کر سکے کہ یہ لڑکیاں زندہ ہیں اور انہیں دکھانے کے لیے جو بڑوں پر تھل کی طرح
 کھڑی کی جاتی ہیں۔ وہ انہیں اگر قیال ان کے قتل میں اس طرح جلانی جاتی ہیں کہ ان
 کے دھوئیں میں یہ نہیں جلتا تھا کہ لڑکیاں سانس لے رہی ہیں۔
 اب انہیں بتایا گیا کہ سلطان محمود انہیں کو توڑ لے آ گیا ہے تو دونوں اگلے گورہ
 ہو گئے۔

تھانویس کی فوج میں بھی بچ گئی۔ مندر کے دفاعی مورچے مضبوط ہونے لگے۔ مندر کے
 اندر باہر فوج بھاگتی دورانی نظر آتی تھی۔ شہر کے لوگوں پر خوف دہرا اس طاری تھا اور شہر کے
 لوگ تلواریں اور برچھے اٹھائے مندر کے دروازے پر جمع ہو رہے تھے اور فوجی انہیں تہمت تھے
 کہ انہیں کیا کرنا ہے۔ انہیں لڑائی کے لیے اور فوجی تقسیم کیا جا رہا تھا۔

اس ہنگامے میں انگلیں اور لڑنے والے اس باغ میں چلے گئے جہاں عیدہ ان کا منتظر
 تھا۔ ان دونوں نے عیدہ کو دو چھوٹے ٹوٹ کی اہم خبریں سنائیں اور اسے کہا کہ بے ٹھکانے
 پر لے چلے۔ عیدہ ان کے کہنے کے بغیر بھی انہیں اپنے ساتھ لے جانے آیا تھا۔ اسے ان
 دونوں کی اہمیت کا پتہ چل چکا تھا۔ وہ انہیں جھگڑ میں ساتھ لے گیا۔

وہ جہنم اپنے چھپنے کی جگہ پہنچے، تین جاڑا دیوؤں نے انہیں جکڑ لیا اور ریتوں سے
 باندھ دیا۔ خطرہ یہ تھا کہ ان دونوں کے ساتھ لڑائی آدھی ہو چکا جیسے کل تھا۔ یہ آدمی ان کے
 ٹھکانے کی نشاندہی کر سکتا تھا چنانچہ انہوں نے دھان سے غائب ہو جانے میں عافیت
 کھلی۔ کل والے ہند کو انہوں نے قتل کر دیا اور دو کمانڈروں کے ہاتھ بندھے رہنے
 دیئے، پاؤں کھول دیئے اور انہیں ساتھ لے کر جنگ میں چلے گئے۔

انہیں بہت دُعا جانا پڑا۔ چند میل گئے۔ ہل گئے کہ انہیں اپنی فوج کا ہر اول دست
 بل گیا۔ عیدہ نے اس کے کمانڈر کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ کمانڈر نے انہیں کہا کہ وہ

سانپ سونا اور انسان

محمد قاسم فرشتہ لکھتا ہے کہ ۴۰۲ھ (۱۰۱۱ء) کے آخر میں جب سلطان محمود غزنوی تھانیر کی فتح کے بعد واپس غزنی آیا تو ہندوستانی شہر معلوم ہوتا تھا کیونکہ غزنی کی فوج کی نفری اتنی نہیں تھی جتنی تعداد جنگی قیدیوں کی تھی۔ اس دور میں جنگی قیدیوں کو غلام کہا جاتا اور انہیں فوجیوں میں عہدوں کے مطابق تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ سلطان محمود جب بھی ہندوستان سے واپس آتا اسے کے ساتھ دو تین ہزار غلام ہوا کرتے تھے مگر اب کے اس کے ساتھ دولاکھ غلام تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ سب فوجی نہیں تھے۔

سلطان نے حکم دے رکھا تھا کہ ان غلاموں کے ساتھ ایسا سلوک نہ کیا جائے کہ اپنے آپ کو مارتے دم تک غلام اور مویشی سمجھتے رہیں۔ انہیں اسلامی طرز پر دباؤ سے روشناس کرایا جائے اور ان کی قسمت اس طرح بدل دی جائے کہ یہ اپنے گھر والوں اور عزیزوں اقداب کو بھی نہیں، اپنے مذہب کو بھی بھول جائیں اور خود کہیں کہ ہمیں مسلمان بنالیا جائے۔ اب غلاموں کی تعداد دولاکھ تھی اس لیے سلطان محمود نے اپنے اس حکم پر سختی سے عمل کرنے کو کہا کہ غلاموں کو انسان سمجھا جائے۔

مختار دوسٹ نے لکھا ہے کہ محمود غزنوی کی فوج میں ایک پوری رجسٹ ہندوؤں کی تھی جس کے افسر بھی ہندو تھے۔ ہندو افسروں کو مسلمان افسروں کی نسبت زیادہ مراعات دی گئی تھیں۔ اس رجسٹ کو ہندوستان میں لا کر کبھی نہیں لایا گیا تھا اسے ان لڑائیوں میں استعمال کیا جاتا رہا جو سلطان محمود کو اپنے دشمن سلطان مکرانوں کے خلاف لڑائی پڑی تھیں۔

لے جایا جائے۔ اس حملے کے بعد جنس سلطان واپس گیا تو یہ بُت اُس کے ساتھ تھا۔ اُس وقت کے ایک واقعہ پر راجہ محمد قندھاری کی تحریر کے مطابق اُس رات کو غزنی میں گھوڑے دوز کے میدان میں توڑا گیا اور بہت عرصے تک اُس کے ٹکڑے گھوڑوں کے قدموں تلے روندیادوسلے جاتے رہے اور انہیں اسی میدان کی مٹی میں مل گئے۔

مندر اور شہر کو پوری طرح اپنے قبضے میں لے کر سلطان محمود نے کہا کہ بغراخان اور انگلیں کو لایا جائے۔ انہیں اُس کے سامنے لے جایا گیا تو سلطان نے کہا کہ قیدیوں کو لاؤ۔ قیدیوں کی ایک قطار لائی گئی۔ اُس میں چند توتوں، شعبدہ بازوں اور لڑکیوں کی کافی تعداد تھی۔ سلطان نے اپنے دونوں کمانداروں کو کہا کہ ان لڑکیوں کو دیکھو اور اپنی دیویوں کو الگ کر لو۔ دونوں نے دیکھا کہ دو دونوں لڑکیاں وہاں موجود ہیں۔ سلطان نے شعبدہ بازوں سے کہا کہ ان لڑکیوں کو نوکروں میں غائب کر دو اور پھر انہیں حاضر کرو۔

نوکر سے منگوائے گئے۔ ایک شعبدہ باز نے لڑکیوں کو ان میں بٹھایا اور اُس نے خالی نوکر دکھا دیئے۔ اس کے بعد اُس نے اسی نوکر کوں میں سے لڑکیاں برآمد کر دیں۔

”یہ ہندوستان کا ایک عام شعبدہ ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اور ہندوؤں کا مذہب بہت بڑا شعبدہ ہے۔ یہ مذہب بھائی ضرورت تک محدود ہے۔ رُوح تک اس کی رسائی نہیں۔ لذت پرستی اس کا اصول ہے۔ میں نے نہ توڑ دیتے ہیں۔ انہیں کہو کہ مجھ پر قبر نازل کریں۔“

بغراخان اور انگلیں مٹ رہے تھے۔ اُن کے ذہنوں سے نشے کا اثر بھوک اور پیاس نے اُٹار دیا تھا۔ سلطان بول رہا تھا۔ اور اُس وقت مندر کے اوپر سے اذان کی بڑی آہی متھس بڑی بیدار سوز اور وجد آفریں صدا بلند ہوئی۔ سلطان خاموش ہو گیا۔ بغراخان اور انگلیں کے جسم کاپٹے اور اُن کے آنسو بہنے لگے۔

اذان ختم ہوا تو سلطان نے ان دونوں سے کہا۔ ”میں تمہیں سزا نہیں دوں گا مگر رہو۔ آزاد رہو۔ ہر سب کو بتا دو کہ دشمن تمہیں صرف لوٹا رہے ہیں۔ مار سکتا، اس کے پاس کچھ ادب بھیا رہی ہیں جو تمہاری رُوح کو کاٹ دیتے ہیں۔“

غزنی میں اس رات چراغاں ہوا۔ لوگ تاج زیبہ تھے۔ فوجی تاج زیبہ تھے۔ غزنی میں جیسے رات آئی ہی نہیں تھی۔ قلعہ میر کے مندر سے دشمنوں کا جو بت لایا گیا تھا اس کی نمائش سارے شہر میں کی گئی تھی۔ اس بت کو کھڑ دوز کے میدان میں لے جایا گیا۔ سارا شہر تماشا دیکھنے کو آتا تھا۔ ہندوستان کے جنگلی قیدیوں کو بھی میدان میں لے گئے تھے تاکہ وہ اپنے دیوتا کی اصلیت اپنی آنکھوں میں دیکھیں۔ بت کو توڑا گیا اور اس کے ٹکڑے میدان میں بکھیر دیے گئے۔ جنگلی قیدیوں سے (جو سب ہندو تھے) کہا گیا کہ یہ ان کا خدا نہیں تھا۔ یہ اُن کے مذہبی پیشواؤں کا فریب تھا۔ اگر یہ خدا ہوتا تو اس میں ذرا سی بھی خدائی طاقت ہوتی تو یہ ہم سب کو فنا کر دیتا۔

بھولے تو یہ ہم سب کو فنا کر دیتا۔
بکیر کے نعرے بلند ہوئے۔ ہندو قیدی خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔
رات غزنی میں جو رات اور جدوجہد چمک رہی تھی اس شہر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ سلطان کے محل میں بھی چراغاں تھا مگر سلطان محمود غزنوی و اس کا آدمی تھا جس کے چہرے پر ہوا کی تھی۔ وہ اس رات اور خوشیوں سے تعلق توڑے ہوئے اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دو آدمی بیٹھے تھے۔ یہ دونوں اُس کے جاسوسی اور فوجی خبری کے نکلنے کے افسر تھے۔ وہ سلطان کو بتا رہے تھے کہ غزنی کے ارگرد کی مسلمان ریاستوں میں کیا ہو رہا ہے۔ سلطان کا سب سے بڑا دشمن ملک خان تھا۔ وہ سلطان کی غیر حاضری سے خائف تھا۔ اُنھاتے ہوئے غزنی پر فوج کشی کر چکا تھا اور اسے بڑی ہی شرمناک شکست سے دوچار کرنا پڑا تھا۔ اُس کی فکر خراسان پر تھی۔

”ایک خان وہ سانپ ہے جو جب تک زہم بے ڈننے سے بار نہیں آئے گا“
— سلطان محمود کو انٹیلی جنس رپورٹ دی جا رہی تھی۔ یہ اہلایں سلطان کے وہ جاسوس لائے تھے جو ایک ملک خان کے فوجی مناف میں موجود تھے۔ ”آپ کی غیر حاضری میں ایک ملک خان نے اپنے بھائی طوغان خان اور قادر خان عالی قدر کو کسایا کہ دونوں اس کے ساتھ اہتمام کر لیں اور پندل مل کر خراسان پر حملہ کریں مگر دونوں نے آپ کے خوف سے اس کا اہتمام نہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ایک ملک خان نے اپنی فوج کے ساتھ اپنے بھائی طوغان خان کے ملائے

اور طوغان خان کے ارادے کیا ہیں؟“ سلطان محمود نے پوچھا۔

”وہ آپ کی طرف مائل ہے۔“ دوسرے آدمی نے جواب دیا۔ ”ہمارے جو آدمی طوغان خان کے دربار میں ہیں انہوں نے بتا ہے کہ اُسے جب پتہ چلا کہ ایک ملک خان نے اُس کے ملائے پر فوج کشی کی کوشش کی تھی اور برہناری نے اُسے آگے نہیں آنے دیا تو طوغان خان نے ایک ملک خان کو پیام بھیجا کہ اُس نے دوبارہ ایسی کوشش کی تو وہ سلطان محمود کے ساتھ اہتمام کرے گا۔“

”کیا مجھے طوغان پر بھروسہ کرنا چاہیے؟“

”سلطان عالی مقام!“ اُسے جواب ملا۔ ”کئی کے دل کی بات خدا سے سوا کون جانتا ہے۔ ظاہر تو یہی ہوتا ہے کہ طوغان خان آپ کا اہتمامی ہے۔“

”اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک خان جیسے بڑھپنت انسان سے محفوظ رہنے کے لیے ہماری مدد چاہتا ہے۔“ سلطان نے کہا۔ ”میں اُس کی مدد کرنے سے گریز نہیں کروں گا لیکن اُس کے ساتھ میری ملاقات ہونی چاہیے۔ یہ لوگ میرے پاؤں کی زنجیریں بن گئے ہیں۔“ طوغان خان کو میرا پیغام خفیہ طریقے سے دو کر میں اُسے دنا چاہتا ہوں۔ نہ وہ میرے پاس آئے نہ میں اُس کے مل جاؤں گا۔ غزنی سے باہر جتنی دُور اور جہاں بھی وہ ملنا چاہے مجھے بتا دے۔“

یہ وجہ تھی کہ سلطان محمود اس تھا۔ غزنی کی طور اُس کے سر پر لنگ رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سانپوں کے سر کو ہٹانا لازمی ہو گیا ہے۔

طوغان خان نے سلطان محمود سے اپنے میں پس پیش نہ کی۔ وہ چار روز بعد غزنی کے مصافحہ میں ایک جگہ پہنچ گیا۔ وہ جگہ خوشنما تھی۔ ایک چمڑ تھا جس کے ارد گرد گھنے پیر خدود پورے اور گھاس تھی۔ سلطان محمود طوغان خان سے گفتگو کر رہا تھا۔

ہا نہیں جو ایک ملائے کا مکران بھی ہے اور وہ توسیع پسند ہے۔
 ”طوغان خان!۔ سلطان محمود نے غصے سے کاہنتی بولی آواز میں کہا ”خليفة وقت
 پر ہوا مٹانے سے پہلے سوج لو کہ الزام غلط ہوا تو میں اپنی فوج سے تساری اس چھوٹی
 سی ریاست کو کچل ڈالوں گا۔“

طوغان خان ہنس پڑا۔ اُس کی ہنسی میں طنز تھی۔ بولا۔ ”جب انسان پر طاقت کا
 ٹھنڈا سوار ہو جاتا ہے۔ تو وہ اپنی خواہشوں کو بھی دانشمندانہ اقدام کہتا ہے اور ان کے
 خلاف کچھ نہ گوارا نہیں کرتا۔ سلطان! دماغ کو اس ٹھنڈے سے آزاد کریں۔ میں خلیفہ کے
 خلاف بات کر کے آپ سے کیا حاصل کر سکتا ہوں؟.... میری نیت کو سمجھنے کی کوشش
 کریں۔ آپ کے خلاف یہاں کا کون سا مکران نہیں لڑا؟ صرف میں ہوں یا دوسرے؟ سلطان خان۔
 ہمارے لئے لڑنے کی وجہ نہیں تھی کہ ہم کمزور تھے۔ ہم مل کر آپ کے خلاف ایک طاقت بن
 گئے تھے مگر میں اور قادر خان ہمیشہ خلافت کے خلاف رہے اور ہندوستان پر آپ کے
 حملوں اور کامیابیوں کے حامی رہے۔ آپ کو معلوم نہیں کہ ایک خان مجھے آپ کے خلاف
 اکٹا چکا ہے، اور میرے انکار پر....“

”مبارے ملائے پر فوج کٹی کر چکا ہے۔“ سلطان محمود نے اُس کی بات پوری کر دی
 جو اُسے اپنے جاسوس بتا چکے تھے۔ اور طوغان برہنہ باری نے اُسے آگے نہیں بڑھنے
 دیا۔ اپنے دربار کی اور اپنی ذاتی زندگی کی بھی کوئی بات مجھ سے پوچھ لو۔“

”اگر آپ کے جاسوس میری زندگی میں بھی وجود ہیں تو آپ کو میری نیت پر شک
 نہیں ہونا چاہیے۔“ طوغان خان نے کہا۔ ”اگر آپ کو شک ہے تو آپ کے جاسوس
 اور خبریاں کوئی کام نہیں کر رہے صرف تنخواہ لے رہے ہیں۔“

”کہو کیا کتنا چاہتے ہو۔“

”خليفة وقت القادر باللہ عباسی اقتدار پر مست اور توسیع پسند ہے۔“ طوغان خان
 نے کہا۔ ”کیا آپ دیکھ نہیں رہے کہ خراسان کا آدھا حصہ اُس کی ریاست ہے؟ اہلبائی
 خراسان آپ کا ہے؟.... خليفة آپ کے خراسان پر بھی قابض ہونا چاہتا ہے، اور
 اس مقصد کے لیے وہ ایک خان کو استعمال کر رہا ہے۔ اُسے شہر دے رہا ہے۔ اُس

”کیا یہ صحیح ہے کہ آپ میرے ساتھ اتحاد کرنا چاہتے ہیں؟۔“ سلطان نے طوغان
 خان سے پوچھا۔

”میں نے آپ کے پاس اپنا سفیر بھیجنے کا امدد کر رکھا تھا۔“ طوغان خان نے
 جواب دیا۔ ”اُس سے پہلے آپ کا پیغام آگیا اور میں چلا آیا۔ میں آپ کے ساتھ
 اتحاد کرنا چاہتا ہوں۔“

”اپنی ریاست کی حفاظت کے لیے یا اس لیے کہ یہ ٹھکانا حکم ہے کہ مسلمانوں
 کو مستعمر ہونا چاہیے؟۔“ سلطان نے کہا۔ ”اگر آپ کو اپنی ریاست کی حفاظت درکار
 ہے تو میں اتحاد سے صاف انکار کروں گا۔ میں صرف خلافت بغداد کے ہم پر اتحاد کر رہا
 ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ سلطان مکران اپنی ریاستوں کو قائم رکھیں لیکن خلافت کو اپنا مرکز
 سمجھیں۔ اگر اسلام کو کفار سے بچائے رکھنا ہے تو خلافت کے تحت اتحاد ضروری ہے۔“
 طوغان خان کے ہونٹوں پر ایسی سکراہٹ آگئی جس میں سُررت کم، لال زیادہ تھا۔
 ”سلطان مجھ کو میں بہت دانشمند سمجھتا تھا۔“ طوغان خان نے کہا۔ ”لیکن معلوم ہوتا
 ہے آپ میں صرف جلی دانش اور حکمت ہے.... اور معلوم ہوتا ہے کہ آپ پر مذہب
 کا جنون طاری ہے۔ اور آپ جذبات کے غلبے میں ہیں۔“

”آپ کی کیا چاہتے ہیں طوغان خان؟ سلطان محمود نے پوچھا۔

”جس خلیفہ کو آپ اسلام کی مرکزیت اور عظمت کی علامت بنائے ہوئے ہیں
 وہ اقتدار کا اتنا ہی بھوکا ہے جتنا میرا بھائی ایک خان اور دوسرے والی اور مکران
 جو غزنی اور خراسان پر قابض ہونے کی خاطر آپ سے برابر بیکار رہتے ہیں۔“

”کیا آپ خليفة بغداد القادر باللہ عباسی کی بات کر رہے ہیں؟۔“ محمود غزنوی نے
 پوچھا۔

”میں جانتا ہوں آپ کو لہجہ نہیں آئے گا۔“ طوغان خان نے کہا۔ ”میں کچھ عمر
 پہلے بھی آپ کو اس خطرے سے خبردار کرنا چاہتا تھا لیکن ایک تو اپنے بھائی ایک بھائی
 کے در سے ناموش رہا اور دوسرا خدشہ سی ٹھکانا کہ آپ کو لہجہ نہیں آئے گا اور آپ میری
 نیت پر شک کریں گے میں بھی آپ کی طرح خلافت کا مستعد ہوں لیکن اس خلیفہ

وہ اُس دور کے ایک ولی ابوالحسن خرقانی کا مرید تھا۔ خرقانی دور دراز کی مسافت جتنی دور رہتے تھے۔ سلطان محمود کبھی کبھی جایا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ وہاں اُس کی روح کو روشنی ملتی ہے۔ اب وہ اس قدر پریشان تھا کہ اُس کی سوچنے کی صلاحیت ہی جیسے منطوق ہو گئی ہو۔ مسئلہ ہی کچھ ایسا پیدا ہو گیا تھا۔ خلیفہ کو تو وہ اسلام کی عظمت کی مقدس علامت سمجھتا تھا مگر القادر باللہ عباسی خلافت کی سرپا تو جین تھا کبھی اُسے طوغان پر غصہ آتا کبھی خلیفہ پر۔ اُسے یقین آ گیا تھا کہ طوغان خان نے جھوٹ نہیں بولا۔ یہ اُس کے لئے روحانی اذیت تھی۔ اُسے رہ رہ کر پیر و مرشد کا خیال آ رہا تھا۔

وہ اُسی روز ابوالحسن خرقانی سے ملنے کو روانہ ہو گیا۔ علی الصبح کا چلا ہوا دوسرے دن سورج غروب ہونے کے بعد منزل پر پہنچا۔ اُس نے خرقانی کے ہاتھ تھام کر انکھوں سے لگا۔ اور بولا۔ ”روح عذاب میں ہے۔ کوئی راستہ دکھائیے۔“

”کیا ہندوستان سے شکست کھا کر آئے ہو؟“ ابوالحسن خرقانی نے پوچھا۔

”آپ کی دعا سے ہندوستان سے میں کبھی شکست کھا کر نہیں آؤں گا۔“ سلطان محمود نے کہا۔

”خارج سلطان جب بھی شکست کھاتے ہیں، اپنے بھائیوں کے ہاتھوں کھاتے ہیں۔“

”میں اُن بھائیوں سے بے خبر نہیں سلطان محمود!۔“ ابوالحسن خرقانی نے کہا۔ لیکن خدا ترانے ساتھ ہے۔“

”آپ بے خبر نہیں ہوں گے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”لیکن آپ یہ سچ ماننے پر آمادہ نہیں ہو سکیں گے کہ خلیفہ القادر باللہ عباسی میرے خلاف خانہ جنگی کو جو ارادے رکھتا ہے۔ بات سمجھ ایک خان کے بھائی طوغان خان نے بتائی ہے۔“

خرقانی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ کہنے لگے۔ ”میں اس سے بھی بے خبر نہیں۔ مجھے جب خلیفہ کی نیت کا پتہ چلا اُس وقت تم ہندوستان میں تھے۔ تم نہ آتے تو میں خود تیس بلکہ اس خطرے سے آگاہ کرتا۔“

”تو کیا میں یقین کر لوں کہ طوغان خان نے خلیفہ کے تعلق جو اکٹھا کیا ہے وہ غلط نہیں؟“

۔۔۔ سلطان محمود نے کہا۔ ”کیا میں دھوکے میں رہا ہوں کہ خلیفہ رسول مقبول صلم کا خلیفہ

نے ایک خان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ آپ کے خراسانی علاقے پر فوج کشی کرے تو خلیفہ اُسے دس ہزار مال اور جنگی سامان اور گھوڑوں کی مدد سے مگر فوج نہیں دے گا۔ ہذا آپ کو پتہ چل جائے گا۔ اگر خلیفہ کو تو میں یا اُمت رسول کے اتحاد اور وفادار کا خیال ہے تو وہ خلافت کی طاقت اور اختیارات کو ایک خان کے خلاف کیوں نہیں بھول کر تاراج کرتا؟ وہ آپ کی پٹہ ٹھونک رہا ہے کہ آپ ہندوستان پر حملے جاری رکھیں۔ اُس کا مقصد یہ ہے کہ آپ غزنی سے دور رہیں اور آپ کی جنگی طاقت ہندوستان میں گھسی رہے۔ خلیفہ اُس دن کے انتظار میں ہے جس دن اُسے اطلاع ملے گی کہ سلطان محمود ہندوستان میں مارا گیا ہے یا پکڑا گیا یا شکست کھا کر کہیں بھاگ رہا ہے۔ امیر عبدالملک، فائق، بیکھوزن

ابوالقاسم بھوی اور دارا بن قوس آپ کے دشمن ہیں۔ ان سب کو آپ کے خلاف ممتد کرنے والا خلیفہ القادر باللہ عباسی ہے۔ خانہ جنگیوں کے پیچھے غلو کا ہاتھ ہے۔“

محمود غزنی کی آنکھوں میں ٹھون اُتر آیا۔ جس گدھی کو وہ مقدس سمجھتا تھا وہی اُس کی دشمن نسل۔

”اگر آپ کو ثبوت چاہیے تو میں یہاں کہوں گا۔“ طوغان خان نے کہا۔ ”سب سے بڑا ثبوت تو یہ ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں۔ میرا سرفراپ کے ہاں پہنچ جائے گا۔ میری فوجی طاقت کچھ زیادہ نہیں، لیکن میرا ایمان مضبوط ہے۔ ایک خان نے میرے علاقے پر فوج کشی کی تو خدا نے میری مدد کی۔ برہنہ کی کے طوغان نے اُسے پہا کر دیا۔ وہ ایمان فروش ہے۔“

”جس قوم کا خلیفہ ہی ایمان فروش ہو جائے، وہ قوم ڈاکوؤں اور لٹیروں کا گروہ بن جایا کرتی ہے۔“ سلطان محمود نے کہا۔

مشہور مؤرخ محمد قاسم فرشتہ اور البردنی لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو آنا بول برادشا کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ وہ جب طوغان خان سے مل کر واپس غزنی آیا تو اُس کا چہرہ اُترا ہوا اور اُس پر خاموشی طاری تھی۔ اُس کے ہاتھوں سے اُس کی بے چینی ظاہر ہوا، تھی۔ وزیر کے پوچھنے پر بھی اُس نے نہ بتایا کہ طوغان خان کے ساتھ ایسی کیا بات ہوئی ہے جس کا رد عمل اتنا شدید ہے۔

ہوتا ہے؟

”وہ خلافت گزری مرگئے ہیں جو صحیح معنوں میں خلفائے رسول تھے۔“
 ابوالحسن خرقانی نے کہا: ”اُن کے بعد جو آئے اور جو آئیں گے، وہ اپنے نفس کے
 خلیفہ تھے، اپنے نفس کے خلیفہ ہوں گے۔ موجودہ خلیفہ ایک ریاست کا حکمران بھی ہے۔
 سمرقند کا دلی بھی وہی ہے۔ اس کا سب سے پہلا اور اس کے لیے سب سے زیادہ
 اہم سفادیہ ہے کہ اُس کی بادشاہی محفوظ رہے۔ موجودہ خلیفہ تو دو قدم آگے بڑھ گیا
 ہے۔ وہ اپنی ریاست کی توسیع کی کوشش میں ہے۔ وہ اُس حکمران کو اپنا دوست بنانا
 ہے جو سب سے زیادہ طاقتور ہو۔ کیا تم جانتے ہو کہ تیسارے باپ کے دور
 میں القادح باللہ عباسی نے قرامطیوں کے ساتھ درپردہ دوستانہ گمان رکھا تھا، صرف
 اس لیے کہ قرامطی ایک طاقت بن گئے تھے۔ اس کے بعد جب تم اپنے ایمان اور اپنے
 غزم کے غلی بوجے پر ایک بڑی جنگی طاقت بن گئے اور جب تو نے غزنی پر ہندوؤں
 کے دو حصے روک کر انہیں اُن کے ملک میں جا کر شکست دی، اور جب تم نے قرامطیوں
 کی حکومت ختم کر کے اُن کے مائل نظریے کو بھی ختم کر دیا تو ابی خلیفہ نے تمہیں امین
 السلط اور یحییٰ الدولت کے خطاب عطا کر دیئے اور تمہیں اپنا مرید اور معتقد بنالیا۔
 اُسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ تم نے ہندوستان میں جا کر بت توڑے اور اسلام رائج
 کیا۔ اسے دراصل تمہاری طاقت سے خطرہ ہے۔ اس خطرے کا علاج دو یہ کر رہا ہے
 ظاہری طور پر تمہارا دوست بنا ہوا ہے۔ اور درپردہ تمہاری طاقت ختم کرنے کے لئے
 خانہ جنگی کو ہوا دے رہا ہے۔“

”کیا ایک خلیفہ کو ایسا کرنا چاہیئے؟“

”تم نے خلیفہ کو بڑا رہے ہو۔ ابوالحسن خرقانی نے کہا: ”میں تو اسے خلیفہ سمجھتا ہی
 نہیں، نہ یہ شریعت کی رو سے خلیفہ ہے، خلیفہ کے لیے زہد و تقویٰ بنیادی شرط ہے۔ دوسری
 شرط یہ ہے کہ قوم میں وہ اپنے دوست اور دشمن بنانے والا نہ ہو۔ دوسری شرط یہ
 ہے کہ اُسے کوئی دنیاوی لالچ نہ ہو۔ اس شرط کی رو سے وہ آدمی خلیفہ ہو ہی نہیں سکتا
 جس کی اپنی ریاست ہو، حکمران خلیفہ ذاتی دیکھیوں اور تعقیبات کے بغیر رہ نہیں سکتا۔“

”کیا ہم اس خلیفہ کو گدھی سے بلند نہیں سکتے؟“

”نہیں۔“ ابوالحسن خرقانی نے جواب دیا۔ ”خلافت ایک خاندان کی میراث
 بن گئی ہے، اور خلافت اب اسلام کی غفلت نہیں، ذاتی اقتدار کی گدھی بن گئی ہے۔
 امت رسول صلعم کا شیرازہ بکھرنے کا باعث یہی ہے کہ خلافت کا مطلب اقتدار بن گیا ہے۔
 یہ شخصی حکومت بن گئی ہے۔ اب یہ خلیفہ ایسا ہی ہو گا اور قوم کا اتحاد اور وقار ریزہ
 ریزہ ہوتا رہے گا۔ خلیفہ اجماع میں قرآن لے کر آئیں گے۔ اپنے دوست اور اپنے
 دشمن بنائیں گے۔ قوم کے لئے جسم دھوکہ بنے رہیں گے۔ قوم میں پھوٹ ڈالتے
 رہیں گے۔ اپنے خوشامدی اور مدح سرا پیدا کرتے رہیں گے، اور قوم عربی اور عجمی،
 غزنوی اور مصری بنتی جائے گی۔ مسلمان مذہب کو بھی فکری اہم ہوں گے دیکھیں گے
 خلیفہ جو بھی آئے گا وہ امر کل بھی ہو گا۔“

”پھر میرا لائحہ عمل کیا ہوتا چاہئے؟“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں خلیفہ کا
 خوشامدی نہیں بنوں گا۔“

”خلیفہ کو جتنا دو تم اُس کی نیت سے واقف ہو چکے ہو۔ ابوالحسن خرقانی نے
 کہا: ”محمود! انسان جب ایمان فروشی پر آتا ہے تو اسے ایمان والے امین اور جمونے
 لگتے ہیں، ہندوستان میں اپنے امیر، حاکم اور سالار چھوڑ آئے ہونگے، ڈر ہے کہ وہ
 اپنے نفس کے دھوکے میں آجائیں گے۔ انسان میں دو کمزوریاں بہت ہی خطرناک ہیں۔
 یہ کمزوریاں اہلس کی طاقت ہیں۔ ایک جنسی لذت اور دوسری زہر پرستی۔ ہندوستان شیعہ
 بازوں اور توہم پرستوں کی سرزمین ہے۔ وہاں کا ظلم بڑا ہی خطرناک ہے۔ مجھے ڈر
 ہے کہ تم ہندوستان کے مفتوحہ ملاقوں کا انتظام جن حکام کے سپرد کر آئے ہو، وہاں
 فحش نہ ہو جائیں۔ تیسارے لیے بہت خطرہ ہے۔ تیسارے لیے بڑی کڑی آزمائش
 ہے۔ گھبرانے جانا۔“

”تو میں خلیفہ کے کان کھول دوں؟“

”حق کی بات کہنے سے نہ ڈرو۔“ خرقانی نے کہا۔ ”میں بھی اس کے ساتھ بات
 کرنے کی کوشش کروں گا۔“

۱۔ واپس اگر سلطان محمود غزنوی نے خلیفہ بغداد القادر باللہ عباسی کے نام پیغام کھویا،
 "خراسان کے بیشتر علاقے پر آپ نے قبضہ کر رکھا ہے۔ اس میں بہت سا غنیمت
 سلطنت غزنی کا ہے۔ میں آپ کو فتنہ بنا کر بھیج رہا ہوں۔ میں نے جن علاقوں پر نشان
 لگائے ہیں، وہاں سے اپنے امرا اور اپنی فوج نکال لیں۔ خلیفہ کو تو کسی خطے کا حاکم
 ہونا ہی نہیں چاہیے مگر میں جانتا ہوں کہ آپ میری بات قبول نہیں کریں گے۔
 میں احترام خلافت کی وجہ سے خاموش رہا۔ اب جبکہ میری آنکھوں سے برے
 آنکھ پکے ہیں میں بہتر سمجھتا ہوں کہ آپ صلح و صفائی سے نشان زدہ علاقے مجھے دے
 دیں۔ میں امید رکھوں گا کہ آپ زبے کا خیال رکھتے ہوئے آپ پس و پیش نہیں
 کریں گے۔"

مورخین محمد قاسم فرشتہ، البرونی اور گردیزی میں اس واقعہ کو تفصیل سے یوں بیان
 کیا ہے کہ خلیفہ عبدالقادر باللہ عباسی سلطان محمود کی جنگ طاقت سے اچھی طرح واقف
 تھا اور وہ سلطان کی قدرت سے بھی آگاہ تھا کہ سلطان جو کرنے پر آمادہ ہے وہ کر
 گزتا ہے۔ خلیفہ کو یہ بھی معلوم تھا کہ سلطنت غزنی کے لوگ سلطان محمود کے معتقد ہو گئے
 ہیں چنانچہ خلیفہ نے اس کے پیغام کے جواب میں خراسان کے وہ صوبے جن کا مطالبہ
 سلطان نے کیا تھا اس سلطان کو دے دیئے اور وہاں سے اپنے امرا اور فوج نکال
 لی۔

مورخین کے مطابق سلطان محمود مطمئن ہونے کی بجائے طیش میں آگیا۔ اس نے
 محسوس کیا کہ خلیفہ نے اتنی جلدی اختیار کرنا دینے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ
 دباؤ اندیش میں اور شاطر ہے۔ سلطان نے بغداد ایک اور قاصد اس پیغام کے ساتھ خلیفہ
 کو بھیجا کہ سر قند پر آپ کا قبضہ ہوا ہے۔ یہ شہر مجھے واپس کریں۔ اس پیغام کے جواب
 میں خلیفہ نے اپنے امیر کو جس کا درجہ سپہ سالار تھا، سلطان کے پاس بھیجا۔ امیر نے سلطان
 کو یہ پیغام دیا کہ خلیفہ کسی قیمت پر سر قند سے دستبردار نہیں ہو گا، اور خلیفہ نے یہ بھی کہا
 ہے کہ اگر آپ اپنے اس مطالبے پر زور دیں گے تو خلیفہ آپ کو ساری قوم کے سامنے

ذیل در سو کر دے گا۔

"خلیفہ سے جا کے کہو کہ تم یہ چاہتے ہو کہ میں ایک ہزار جنگی ہاتھیوں کے ساتھ
 دارالحکومت بغداد میں آؤں؟" — سلطان محمود نے قہر آلود آواز میں کہا —
 "اگر خلیفہ کی یہی خواہش ہے تو اسے کہہ دینا کہ اس کے دارالحکومت کی اینٹ سے
 اینٹ بجا دوں گا اور لمبہ ہاتھیوں پر لا کر غزنی لے آؤں گا۔"

ایک انگریز مؤرخ سراج ایچ۔ جو درتھ نے چند سو برس مورخین کے حوالے
 سے لکھا ہے کہ خلیفہ سلطان محمود کی اس دھمکی سے بہت بیٹایا۔ اس کا ترجمہ اتنا بلند تھا کہ
 وہ سلطان محمود کو مجبور کر سکتا تھا کہ وہ قہر خلافت سے اس بدتریزی کی معافی مانگے مگر
 خلیفہ کی کچھ کمزوریاں ایسی تھیں کہ اس نے دھمکی کا جواب دھمکی سے نہ دیا بلکہ ایسا
 ڈھیلا سا جواب دیا کہ سلطان محمود نے سمرقند شہر میں اپنی فوج داخل کر کے اسے اپنی
 سلطنت میں شامل کر لیا۔

۱۱۱۲ء آدھا گزر چکا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے سلطان محمود مطمئن تھا۔ پنجاب کا
 ہراجا انند پال ابھی زندہ تھا مگر اس کا ذہن مار دیا گیا تھا۔ وہ سلطان کا باج گزار تھا۔
 سلطان کو ہندوستان سے اطلاعات مل رہی تھیں کہ وہاں کے راجوں مہاراجوں کی
 سرگرمیاں اور عزائم کیا ہیں۔ اسے اطلاع ملی کہ انند پال مر گیا ہے اور اس کی جگہ راج
 دربار کی کئی پر اس کا بیٹا راجن پال بیٹھا ہے۔

تھامس کے بت دشنو یو کی یہ توہین کہ سلطان محمود اسے غزنی اٹھالے گیا تھا،
 ہندوؤں کے لئے نام صرف ناقابل برداشت تھی بلکہ دہشت ناک زیادہ تھی۔ ہندو
 دیوتاؤں کے قہر خضر تھے۔ پنڈت قہر قہر کا پ رہے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بت
 انسان کی پیدائش کے ساتھ ہی وجود میں آیا تھا اور اولین انسانوں نے اس کی پرستش
 کی تھی۔ یہ بت اب غزنی نے گھوڑ دوڑ کے میدان میں ٹوٹا پڑا تھا، اور اس کے
 ٹکڑوں کو گھوڑے اور دوڑ کے مقابلے کے رکھ بیٹھ رہے تھے۔ سب اسے
 ہندوستان کے مندروں کی گھنٹیاں جع دشا کہتی تھیں۔ بہت سے پنڈت گنگا گندے

کرتے ہیں:-

جواں سال ترلوچن پال آگے آیا۔ اپنے باپ کی چٹا کے شعلوں کو دیکھا، پھر سب کی طرف دیکھا۔

”آپ میں کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اپنے عہد پر سے کیے ہیں؟۔ ترلوچن پال نے کہا۔“ آپ نے اسلام کے آگے لاشوں کا بند پیلے کیوں نہ اندھا؟ جب سلطان تھاغیر کی طرف بٹھ رہے تھے، اُس وقت آپ سب کہاں تھے؟ ان کی مسجدوں کو منہ اور سیاں کے مسلمانوں کو ہندو بنالینا کئی مشکل نہیں لیکن راجپوت خون پر وار نہیں کیا کرتے۔ آپ میرے باپ کی تعریف کر رہے ہیں لیکن ہر لڑائی میں۔ باہر کو اپنے علاقے میں لڑائی پڑی۔ آپ میں سے کون ہے جس نے ہمیں اپنی فوج کی کم نوا، اس لئے دی تھی کٹاے ہم پٹار اور لرغان کے درمیان روکے رکھیں؟۔ آپ کے پاس صرف الفاظ ہیں۔ آپ خطرے کے وقت اپنی فوجیں ہمیں اس لئے دے دیتے ہیں۔ خانا محمد غزنوی کو ہم اپنے علاقے میں روکے رکھیں اور آپ کی راجدھانیاں محفوظ رہیں۔

• سارا جہاں ایک سارا جہاں لے پوچھا۔ آپ کتنا کیا چاہتے ہیں؟
”میں کتنا یہ چاہتا ہوں کہ میں اپنی ریاست کو محفوظ رکھوں، کیلئے مسلمانوں کو اپنا دوست سمجھوں گا۔ ترلوچن پال نے کہا۔ محمد نے حکم دیا کہ وہ مسلمانوں کا مگر سیاں کے مسلمانوں پر ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔“

”تو کیا آپ محمد کے باجگزار رہیں گے؟۔ سارا جہاں قہقہہ سے پوچھا۔

”ہاں!۔ ترلوچن پال نے جواب دیا۔ میں آج دیتا رہوں گا۔“

”کیا آپ کو معلوم ہے کہ سیاں کے مان غزنی کے سلطان کے وفادار اور جاسوس ہیں؟۔ سارا جہاں نے کہا۔

”کیا آپ کو معلوم نہیں کہ غزنی کی فوج میں ہزاروں ہندوؤں کا بھی دستہ ہے؟۔ ترلوچن پال نے کہا۔ ان میں سے کتنے ہیں جو دہاں سے فرار ہو آئے ہیں، ان کے پاس گھوڑے ہیں، ہتھیار اور لاشیں ہیں۔ وہاں وہ آگاہ ہیں۔ وہ دہاں سے بھاگ کیوں نہیں آتے؟۔ سیاں کے بہت سے مسلمان ہمارے وفادار ہیں۔“

چلے گئے تھے اور پانی میں کھڑے ہو کر ہری کشن اور بھوان سے بخشش مانگ رہے تھے۔ آندھی آتی یا بجلی چمکتی تو ہندو ہاتھ جوڑ کر دعائیں بڑوانے لگتے تھے۔ اپنے باپ جے پال کے بعد مہاراجا اند پال اٹھا تو مطہراق سے تھا اور اُس نے سلطان محمود کو دہاں میں میدانوں میں لگا کر بھی تھا مگر ہر بار اُس نے شکست کھائی اور ہار ہوا۔ سلطان سے دہاں کا اعلان کیا اور اُسے دھوکا بھی دیا۔ آخر دم چھوڑ گیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ اُس کی موت کا باعث پے در پے شکستوں کا غم تھا۔ تھاغیر کے منہ کی سیاہی کے بعد وہ اس غم سے جانبر نہ ہو سکا اور اُس کے بیٹے ترلوچن پال نے گدگدی سنبھالی۔

اند پال کی موت پر ہندوستان کے چھوٹے بڑے راجے، مہاراجے اور رائے، مہاراجہ میں آئے ہوئے تھے۔ اُس کی لاش چنار پر چل رہی تھی۔ قہقہہ کے راجہ نے ہندو آواز سے کہا۔ ”آج وہ شخص چل کر آگاہ ہو گیا ہے جس کی ساری عمر مندروں کی حفاظت میں اسلام کے خلاف لڑتے گزری۔ یہ واحد شخص تھا جس نے اپنے علاقے سے باہر جا کر محمد غزنوی سے ٹکرائی۔ یہ ہم سب کی بڑی اور اپنے مذہب سے غداری ہے کہ ہمارے مندروں میں مسلمان اذانیں دے رہے ہیں۔ آؤ، اند پال کے جلتے ہوئے جسم کے شعلوں کی بخشش میں عہد کریں کہ ہمیں اپنے منہ کی آبرو بکال کرنی ہے اور سیاں کی مسجدوں کو منہ بنانا ہے۔“

”میں عہد کرتا ہوں۔“ کالجہر کے راجہ نے کہا۔ ”کہ دشمنوں کی توہین کا انتقام غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجا کر لوں گا۔“

ہر ایک راجہ اور مہاراجہ نے رینڈت اور ریشی نے چلی ہوئی چٹا کے قریب ہو کر عہد کیا کہ اسلام کے بڑے ہوتے سیلاب کے آگے اپنی فوج کی لاشوں کا بند باندھ گا۔ یہ الفاظ ہر ایک نے کہے کہ وہ مسجدوں کو منہ اور مسلمانوں کو ہندو اور غزنی کو مہاراجہ کی راجدھانی بنائے گا۔ اند پال کا جانشین ترلوچن پال یہ چھ کھڑا آئو سبھا رہا تھا۔

”راجہ ترلوچن پال کو بھی جواب سارا جہاں میں کچھ کتنا چاہیے۔“ ایک ریشی نے کہا۔ ”اب سارا جہاں کو غم کا بوجھ آتا رہ چکا چاہیے۔ راجپوت آئو نہیں خون بہلا

مکڑیوں کی تڑاخ تڑاخ سبب تک ہو گئی۔ اور تروچن پال جو دراصل بنڈل سنس بلکہ امن پسند اور حقیقت میں تعقل پسند اور شعلوں میں نڈب گیا۔ اس کی حیثیت ایک راجا کے کی رہ گئی۔ بھیم پال مذکر اس وقت کے پنجاب کا راجہ بن گیا۔

اُسی رات راج محل میں تمام راجوں، مہاراجوں اور پندتوں کی کانفرنس ہوئی۔ اس میں تروچن پال نہیں تھا۔ اس کا بھائی بھیم پال گنگو کی قیادت کر رہا تھا۔ سب سے بڑے پندت نے جو پرنسپل کی کرکٹام مسجد میں سہار کر دی جائیں اور مسلمانوں کو مجبور کر دیا جائے کہ غزنی چلے جائیں یا ہندو بن جائیں۔

”سیاں میں اپنے بھائی تروچن پال کی اس بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ ہم سنسوں پر ہر گز نہیں اٹھائیں گے۔“ بھیم پال نے کہا۔ ”تم دشمن نہیں دوست پیدا کریں گے۔“ مسجدوں کو ہم نے گرا بھی دیا تو کیا ہو گا مسلمان جہاں کھڑا ہو کر نماز پڑھا ہے، وہی اس کی مسجد ہوتی ہے۔ ہمیں سلطان محمود جیسے طاقتور جنگجو سے لڑنا ہے۔ میں ہندوستان کی تاریخ میں اپنے نام کے ساتھ یہ یاد نہیں چھوڑنا چاہتا کہ بھیم پال نے غزنی کے سلطان سے شکست کھائی اور سنسے مسلمانوں سے انتقام لیا۔“

”ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ جس طرح ہماری عبادت گاہیں تباہ ہوئی ہیں اس کا راز ضرور پڑے گا کہ ہندو اسلام کی طرف راغب ہونے لگیں گے۔“ ایک پندت نے کہا۔ ”لوگ دیوتاؤں کے قمر سے ڈر رہے ہیں مگر ابھی تک قمر نہیں آیا۔ ہم خود قبریں کھدائی کی فرج پر گرنا ہے یہی ایک طریقہ ہے جس سے ہم ثابت کر سکتے ہیں کہ جنیس مسلمان بت کہتے ہیں۔ یہ ہمارے دیوتا ہیں اور ان کی توہین کرنے والا زہ سنس رہ سکتا۔ کسی نے یہ بھی مشورہ دیا کہ جن تعلقوں پر مسلمانوں کا قبضہ ہے، انہیں محاصرے میں لے لیا جائے، اگر وہ مہاراجوں نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ محمد غزنوی اپنی پوری جنگی طاقت سے آجائے گا۔ اس کے لیے ہمیں تیزی کی ضرورت ہے۔ ہمیں تیاری کے لیے وقت چاہیے، پھر ہم ٹھو کو ہندوستان میں ٹھیسٹ کر کبھی بڑی ہی مشکل جگہ لائیں گے اور پھر

ایک جوان سال خوبصورت عورت عورتوں کے جوم میں سے نکلا، کر تروچن پال کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ اُس نے تروچن پال کی نیام سے تلوار کھینچی لی اور تلوار بلند کر کے بولی۔ تم سب جانتے ہو کہ میں اس شخص کی بیوی ہوں جو مسلمانوں کو اپنا دوست کہہ رہا ہے۔ یہ مجھے اٹھا کر اپنے باپ کی چٹائی پھینک دے۔ چاہے تم مجھے اسی تلوار سے کاٹ دے، میں اعلان کرتی ہوں کہ میں راجپوت کی بیٹی ہوں۔ میرا باپ مسلمانوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا ہے۔ میں اپنے مذہب کی توہین کا اور اپنے باپ کے خون کا انتقام لوں گی۔ آج سے میں نے اپنے اس خاوند کے ساتھ اپنا جسمانی تعلق توڑ دیا ہے۔ یہ بُر دل ہے جو غزنی کے سلطان کا ہاتھ بٹھکانے کا اعلان کر رہا ہے۔“

تروچن پال اُس کی طرف دیکھا مگر ایک اور جوان سال آدمی تلوار سونت کر دونوں کے درمیان آ گیا۔ وہ بھیم پال تھا۔ تروچن پال کا چھوٹا بھائی۔ تمام تاریخ نویسوں نے اس کا نام بھیم پال مذکر لکھا ہے اور کہا ہے کہ وہ غیر معمولی طور پر غزنی بے خوف اور دلیر تھا۔

”خبردار تروچن پال!۔“ اُس نے کہا۔ ”سیاں سنس کوئی ایک بھی ایسا سنس بیٹے کا جو تباہی ساتھ دے گا۔ اگر اس محنت پر تم نے ہاتھ اٹھایا تو میں بھول جادوں کا کہ تم اس کے خاوند اور میرے بھائی ہو۔ میں ہوں اپنے باپ کی گدھی کا دلشد اس گدھی پر وہ بیٹھ سکتا ہے جو اس کی توہین کا انتقام لینے کے قابل ہو گا۔“ اُس نے سب کی طرف دیکھا اور تلوار بلند کر کے پوچھا۔ اگر میں غزنی کے سلطان کو باج نہ دینے کا اعلان کر دوں اور اگر میں وشنو دیو کی توہین کا انتقام لینے کی قسم کھالوں تو کیا آپ مجھے اپنے باپ کی گدھی کا دارت تسلیم کریں گے؟

”تم یقیناً مہاراج جے پال اور مہاراج انند پال کے جانشین ہوتے۔ ایک پندت نے کہا۔

پھر ایک شور اٹھا۔ ”تروچن پال کو بھادو.... تروچن پال سے تلوار لے لو۔“

مذکر مہاراج کی جے ہو۔۔۔“

یہ شور بلند ہوتا چلا گیا۔ انند پال کی جتا کے شعلے اور زیادہ بلند ہو گئے۔ جلتی ہوئی

لوگوں میں سے برآمد کیا گیا۔ ایرانی حسن کے لحاظ سے غزنی بھی خوبصورت علاقہ تھا لیکن ہندوستان کا حسن اس میں زیادہ جاذب نگاہ۔ انیس بتایا گیا کہ ہندوستان طاسائی سرزمین ہے اور یہاں یہ بتایا کہ شکل ہے کہ شہرہ کی اور کرامات کون سی ہے۔ ان کے لیے سب سے زیادہ عجیب بات یہ تھی کہ یہاں لوگ سانپوں کی بھی پوجا کرتے تھے اور عورتیں سانپوں کو ودھ پلائی تھیں۔

ایک روز تھانہ میر قلعے میں ساتھ ساتھ راہب آئے۔ ان کے ساتھ چار جوان لڑکیاں تھیں۔ ان سب کا لباس ایک ایک سفید چادر تھی جو مردوں کے کندھوں سے ٹخنوں تک لگتی ہوئی تھی۔ لڑکیوں کا لباس بھی یہی تھا اور ان کے سروں پر بایک کپڑے کی اور گھنٹیاں تھیں۔ ان لڑکیوں کے رنگ گودے، آنکھیں، شرتی اور بال گہرے بادامی تھے۔ ان کے نقش و نگار میں کج نش تھی۔ برہمن کی داڑھیاں تھیں۔ ان میں ایک سفید ریش تھا۔

شام کے بعد کا وقت تھا جب یہ گروہ قلعے میں داخل ہوا یہ لوگ راہب اور پیر سرگاہ گئے تھے۔ انہوں نے قلعہ دار سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تھی اور روجہ بتائی تھی کہ ان کے ساتھ جوان لڑکیاں ہیں اس لیے وہ سڑے میں بکھرے سے ڈرتے ہیں۔ انہیں لڑکیوں کے لیے محفوظ رہائش جگہ کی ضرورت تھی۔ انہیں قلعہ دار قطب گز تک جانے کی اجازت دے دی گئی۔ انہیں قلعہ دار کی طرف جانا دیکھ کر سالار بہرام اور اس کا نائب بھی اس عجیب مخلوق کو دیکھنے چلے گئے۔ یہ لوگ لباس سے عجیب بن گئے تھے۔ عجوبہ ایک تو یہ تھا کہ مرد بھی خوبصورت تھے اور لڑکیاں ان سے زیادہ حسین تھیں۔ دوسرا عجوبہ یہ تھا کہ

ان میں جو سفید ریش تھا اس کے گلے کے گرد گڑھا گڑھا لباس پہنا ہوا تھا۔ یہ لباس پہن کر ناگ تھا۔ جو اپنا منہ سفید ریش کے چہرے پر اوڑھ لیتی سر پر بھیرتا تھا۔ مردوں کے پاس بڑے خوبصورت عساکر تھے۔ ہر عساکر کے اوپر سانپ کا پھین بنا ہوا تھا۔ لڑکیوں کی گردنوں سے رنگدہ ریشاں تک رہی تھیں اور ریشوں کے سروں سے باریک گھنٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ لڑکیاں چلتی تھیں تو گھنٹیاں دھیمی آواز سے اس طرح بجتی تھیں جیسے ندی کا پانی بہتھروں سے گزر رہا ہو۔

قطب گزک نے ان کا خیر مقدم کیا اور احرام سے بھٹایا کیونکہ وہ شکل و صورت

کے ہم ایسے بھندے میں لائیں گے۔
”اس دوران کیا تین یہ پیشہ پیش کرنی چاہیے کہ ہم بھیرہ، طاسان اور تھانہ میر کے سلطان سالار اور حکام کو ہاتھ میں لیں تاکہ وہ سلطان نوہ کے وفادار نہ رہیں۔“ بھیم پال کے وزیر نے کہا۔ وہ بڑی دانشمند اور تجربہ کار وزیر تھا۔ اس نے کہا۔ ”ہمارے پاس طریقے موجود ہیں جن سے ہم ان حکام کو برا کر سکتے ہیں۔“

”یہ مسلمان اپنے ایمان اور کردار کے بڑے کچے ہوتے ہیں۔“ بھیم پال نے کہا۔
”مجھے امید نہیں کہ آپ ان کے سالاروں اور حاکموں کو اپنے ہاتھ میں لے سکیں گے۔“ وزیر نے نہیں کر سکا۔ ”سلطان بھی انسان ہوتے ہیں۔ ہر انسان اوقات اور پیر پیر میں ہوتا ہے۔ ہر انسان میں ایک ہی کمزوریاں اور ایک ہی خواہش ہوتی ہے جو انسان انہیں دبا دیتے ہیں، وہ رشتہ منی اور مولوی کھاتے ہیں۔ ہم ان میں سے کمزوریاں اور خواہشیں ادھنسنے بیدار کر کے انہیں پسینوں میں گر سکتے ہیں۔ ہم یہ کام تھانہ میر سے شروع کریں گے۔“

اس کا خیر نس میں ایک فیصلہ یہ ہوا کہ محمود غزنوی کے خلاف جنگی تیاریاں شروع کر دی جائیں اور دوسرا یہ کہ اس کے سالاروں وغیرہ کو ہاتھ میں لینے کی ہم کا آغاز کر دیا جائے۔ ان تیاریوں کے بعد بھیم پال کو سلطان محمود غزنوی کو یہ پیغام بھیجا تھا کہ وہ غزنی کا باجگزار نہیں اور اندھ پال نے سلطان کے ساتھ دوستی کا جو معاہدہ کیا تھا، وہ منسوخ کیا جاتا ہے۔

سلطان محمود غزنوی اپنے تجربہ کار سالار عبداللہ الطائی، القناتاش اور ارسلان جہن کو اپنے ساتھ لے گیا تھا کیونکہ وہ ان کی بھین اس کے لیے زیادہ خطرناک تھیں۔ ہندوستان میں وہ جن سالاروں کو چھوڑ گیا تھا، وہ تھے تو اپنے جہیل لیکن ان میں سالاروں کے پائے کے نہیں تھے جنہیں سلطان اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ان پر شہری انتظامیہ کے حاکم مقرر کر دیئے گئے تھے۔

تھانہ میر میں بہرام غور سالار تھا اور شہری حاکم قطب گزک تھا۔ وہ پہلی بار ہندوستان میں آئے تھے۔ انہیں یہاں کی ہر چیز عجیب لگتی تھی۔ انہوں نے یہ شہرہ بھی دیکھا تھا کہ دور لڑکیوں کو وہ لوگوں میں بٹھایا گیا اور خالی ٹوکے رکھا دیئے گئے۔ پھر لڑکیوں کو وہ

اور لباس سے قابل احترام لگتے تھے۔

”ہم شاید آپ کے دیباہیں آنے کی جرات نہ کرتے۔ سفید ریش نے کہا۔ لیکن ہم آپ پر اعتماد کر سکتے ہیں کیونکہ آپ ایک باطل مذہب کے دشمن ہیں۔ ہمیں دلی خوشی ہے کہ آپ باطل کو کھیل رہے ہیں۔ آپ یقیناً اپنے کردار کے لوگ ہیں۔“

”آپ کا مذہب کیا ہے؟“ سالار بہرام نے پوچھا۔

”ہم سانپوں کے بھاری ہیں۔ سفید ریش نے کہا۔ اور اس کے ساتھ ہی ہم ایک خدا کو مانتے ہیں۔ ہمارا حسب نسب ان یونانیوں سے ہے جسے جو سکندر اعظم کے ساتھ ہندوستان میں آئے تھے۔ وہ یونانیوں کا خاص فرقہ تھا جو سانپوں کا بھاری تھا۔ ان کے متعلق ایک معایت ہے کہ وہ ہمیشہ ایک شیش ناگ کی تلاش میں رہتے تھے جو انہیں لہناں میں مل سکا۔ یہاں ہندوستان میں انہیں مل گیا۔ وہ سکندر اعظم کی فوج سے الگ ہو گئے اور شیش ناگ کے پیچھے چل پڑے۔ روایت ہے کہ یہ ناگ ان کے لیے ٹھکانے بھیجا تھا۔ اُس کا رنگ لال اور ہنری تھا۔ اُس کے سر پر کھنی تھی اور وہ ایک سیاہ جگ کی پیٹھ پر سوار تھا۔۔۔۔

”شیش ناگ آگے آگے چل پڑا۔ ہمارے آباء اجداد کے چند آدمی اُس کے پیچھے گئے۔ وہ ایسے دشوار گزار ملاتے میں چلا گیا جہاں عام انسان نہیں پہنچ سکتے۔ وہاں چٹانیں ہیں جو اوپر سے تلوار کی دھار کی طرح ہیں۔ دریا سے جہاں ایک شاخ اس ملاتے میں سے گزرتی ہے۔ اس کے اوپر قدمت کا بنا ہوا پل ہے جو دریا کی چوڑائی جتنا لمبا پتھر ہے۔ چوڑائی میں کلہری کے شہیر کی طرح ہے۔ اس پر ایک انسان کا پاؤں آ سکتا ہے۔ مگر نہ کاغذ ہر قدم پر بے نیچے دباؤ لگتا ہے کیونکہ پاؤں کے درمیان سے گزرتا ہے۔ گہرائی بہت زیادہ اور باد بہت تیز ہے۔۔۔۔

”شیش ناگ اس کے اوپر سے گزر گیا۔ چار آدمی اس کے پیچھے گئے۔ وہ پل کے زونے اور دیا انہیں اپنے ساتھ لے گیا۔ ٹھکانے پر جا پہنچے۔ دھلیک خوشنما ہو گئی تو ناگوں کی رستی تھی۔ ہمارے آباء اجداد وہیں آباد ہو گئے۔ ہم وہیں سے آئے ہیں۔ ہم سانپوں میں بہتے ہیں۔“

”کیا آپ سانپ کو خدا مانتے ہیں؟“

”خدا تو ہم خدا کو ہی مانتے ہیں۔ سفید ریش نے کہا۔ لیکن سانپ کو ہم اس لیے لائق پرستش سمجھتے ہیں کہ یہ خدا اور انسان کے رابطے کا ذریعہ ہے۔ یہ شیطان بھی ہے۔ فرشتہ بھی ہو ہے اور پتھر کو سونا بنانے کی طاقت اور کلمات کس کے پاس ہے؟ صرف سانپ کے پاس۔ یہ ایک خاص قسم کا سانپ ہوتا ہے۔ اگر اس کی عمر ایک سو سال پوری ہو جائے تو اس کے جسم میں ایک گولی پیدا ہو جاتی ہے جو چمکتی ہے۔ اسے کوئی من کت ہے کوئی منکا۔ سانپ اسے ہر وقت من میں رکھتا ہے۔ کوئی کئی وقت اس کے ساتھ ٹھکتا ہے۔ گولی کو ہوا میں اچھالتا اور اسے پڑھتا ہے۔ یہ گولی اگر لوہے کے ٹکڑے پر گرے تو وہ لوہا سونا بن جائے۔ اسے اپنی تلوہ پر گر گئیں تو تلوار سونا بن جائے مگر آج چمک کوئی انسان یہ گولی حاصل نہیں کر سکا۔ رات کو سانپ سونہیں سکتا۔ وہ گولی من سے نکال کر زمین پر رکھتا ہے اور اس پر کندل مار دیتا ہے۔ تب اسے نیند آتی ہے۔۔۔۔

”ایسا سانپ صدیوں بعد سننے میں آیا ہے۔ اگر صرف سننے میں آتا ہے۔ اسے دیکھا کسی نے نہیں۔ اس کا منکا آج تک کوئی حاصل نہیں کر سکا۔ اسے کھانی حاصل کر بھی نہیں سکتا۔ ہندوستان میں مشہور ہے کہ منکا جس کے اٹھ آجائے گا۔ وہ سارے ہندوستان کا بادشاہ ہو گا۔ شیش ناگ بھی اس کا غلام ہو گا اور اُس کے محل، اس کی راجدھانی اور اُس کے تلوں کی حفاظت سانپ کریں گے۔ وہ ساری دنیا کا سب سے زیادہ دولت مند بادشاہ ہو گا۔“

”کیا آپ نے یا آپ کے آباء اجداد میں سے کسی نے یہ سانپ اور اس کا منکا دیکھا ہے؟“

”نہیں۔ سفید ریش نے جواب دیا۔ ہمارے خطے میں سکے والا سانپ موجود ہے لیکن وہاں تک ہم میں سے کسی کو جانے کی اجازت نہیں۔ کوئی دانا جانے کی جرات بھی نہیں کر سکتا۔ ہم وہ جگہ جانتے ہیں جہاں وہ سانپ ہے لیکن اُس تک پہنچنے کے لیے راستہ اس قدر خطرناک ہے کہ کوئی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ہمیں یہ بھی بتا دیا ہے کہ وہاں سونا بھرا ہے۔“

ہیں۔ یہ صرف جوان ہی نہیں رکھتی بلکہ بڑی لمبی عمر دیتی ہے۔

قلب گزرک کا خیال تھا کہ ان لوگوں سے وہ اکیلا ہی راز لے رہا ہے، لیکن سالہا بہرام جہر داگی کا خوبصورت جسم تھا، اس عیب و غریب گروہ کے ایک آدمی اور ایک لڑکے کو اپنے کمرے میں بٹھائے ہوئے پوچھ رہا تھا کہ کیا وہ اُسے اپنے ساتھ اپنے خطے میں لے جاسکے ہیں؟ آدمی اسے بتا رہا تھا کہ وہ اپنے فرشتے اور عقیدے کے ساتھ ہندوئی نہیں کر سکتا۔ وہ باتیں کرتے کرتے کئی مہانے پہنچ گیا اور لڑکے اس کے پاس اکیلی وہ گھٹی وہ سکڑا رہی تھی، بہرام نے اس کے ساتھ باتیں شروع کر دیں۔ لڑکے نے اُسے کہا کہ اس بے اس سے زیادہ خوبصورت اور سوند آدمی کبھی نہیں دیکھا۔

”تم تو جنت میں رہتی ہو۔ بہرام نے کہا۔

”وہ جنت نہیں جہنم ہے جہاں اپنے جذبات کھلنے پڑیں۔“ لڑکے نے کہا۔ ”ہماری زندگی ان راہبوں کے ساتھ گزر رہی ہے۔ یہ مردہ دل لوگ ہیں۔ مجھے آپ کی عورتوں جیسی زندگی چاہیے۔“

یہاں سے بات چلی تو اس معاملہ تک جا پہنچی جہاں دل تو دو ہوتے ہیں لیکن دھیموں کی جان ایک ہو جاتی ہے۔ لڑکے نے دالما زنجیت کا اظہار کیا تو بہرام نے اس سے پوچھا کہ اگر سانپ کے سنے کا قہقہہ کہاں تک درست ہے؟ لڑکے نے اُسے بتایا کہ ساتھ میں کر اُس کی راہنمائی نہیں کر سکتی، اُسے راستہ سمجھا سکتی ہے۔ چنانچہ اُس نے راستہ سمجھانا شروع کر دیا اور بہرام کا ہنر کرکریں ڈالتا گیا۔

”آپ کے پاس تیروں کا ذخیرہ ہونا چاہیے۔“ لڑکے نے کہا۔ ”داں آپ کو قدم قدم پر سانپ نظر آئیں گے۔ آپ نہیں تیروں سے مدد سکتے ہیں۔ میں نے آپ کو جو سرنگ بتائی ہے اس کے دانے پر ایک اڑدھا کڈل مار بیٹھا ہو گا۔ اس کے سر پر سرنگ لگے تو مرجائے گا جسم پر کہیں بھی سرنگ لگا تو یہ آپ کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ یہ سرنگ بہت لمبی ہے۔ اس میں سے آپ گزر گئے تو آپ کو شخاف پانی کا ایک چشمہ نظر آئے گا۔ اس کے کنارے پر آپ کو وہ سانپ نظر آئے گا جس کے پاس وہ سنا ہے وہ اس کے ساتھ کھیل رہا ہو گا۔ اسے بھی آپ تیر سے مار سکتے ہیں پھر شخاف آپ کا ہو گا۔“

بڑا ہے اندوہاں میرے اور جو اہلرت ہیں اور ہمارے پر وہ بت کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں، انہیں دیکھ کر کوئی یقین سے کہہ نہیں سکتا کہ یہ اس دنیا کی لڑکیاں ہیں یا بہر کی دنیا والوں کو اس خطے کے متعلق علم ہے لیکن سب کہتے ہیں کہ وہاں جو لڑکیاں ہیں انسان نہیں ان گینس ہیں جنہوں نے اپنا دھب بدل رکھا ہے۔ یہ غلط ہے۔ وہ ہماری نسل کی لڑکیاں ہیں۔ وہ جس قدر حسین ہیں اتنی ہی بد نصیب ہیں عمر کے ایک حصے تک وہ خوش رہتی ہیں مگر آگے چل کر وہ اداس رہ جاتیں گئیں ہیں کیونکہ انہیں مرد کی نفاقت دینا نہیں آتی۔ سفید ریش ایسے انداز سے اس ظلم کو شربا کی باتیں سنا رہا تھا کہ قلعہ دار قلعہ گزرک اور سالار بہرام اداس کے نائب سالار کی آنکھیں ٹھہر گئیں تھیں اور ان کے رونگٹے کھڑے ہو رہے تھے۔ ان کے سامنے چار لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ ان سب کے ہونٹوں پر تبسم تھا غزنی کے حکام ان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ ان سے زیادہ خوبصورت بھی کوئی لڑکی ہو سکتی ہے، انہوں نے ہمالیوں کی خوب خاطر مدارت کی اور ان کی رہائش کا شاندار انتظام کر دیا۔

وہ سب سونے کے پیلے چلے گئے تھے مگر سفید ریش کو قلب گزرک نے اپنے پاس بٹھا رکھا تھا۔ وہ سفید ریش سے اُس خطے کے عہدے رہا تھا اور سفید ریش اُسے کہہ رہا تھا کہ سارے ہندوستان کی بادشاہی کا راز ناگوں کے اس خطے میں ہے جہاں کوئی اجنبی نہیں جاسکتا اور جانے کی جرأت بھی کوئی نہیں کرتا۔

”کیا داں تک پہنچا جاسکتا ہے؟“ قلب گزرک نے پوچھا اور وہ اچھک کر بولا۔ ”مجھے دولت کی ضرورت نہیں۔ آپ دیکھ سبے میں کوکتا بوڑھا ہو گیا ہوں۔ بڑھا پنے کی بیماریوں نے خطے شروع کر دیئے ہیں۔ میں نے سنا ہے کہ ہندوستان کے پہاڑی علاقوں میں ایسی بڑی بونیاں ہیں۔“

”جو بڑھاپے کے عمل کو روک دیتی ہیں۔ سفید ریش نے اس کی بات پوری کرتے ہوئے کہا۔ میرے بال سفید ہو گئے ہیں، لیکن میرے جسم کو ہاتھ لگائیں، جوانوں جیسا مضبوط اور تھوڑا ہے اور میری عمر ایک سو سال سے زیادہ ہو گئی ہے۔ آپ نے ٹھیک سنا ہے ہمارے خطے میں ایسی بوٹیں ہیں جس میں سانپوں کا زہر بلا ہول ہے۔ صرف ہم لوگ اس بوٹے سے آگاہ

”اود تم مجھے کہاں ملوگی؟“

”میں آپ کو مل جاؤں گی۔“ لڑکی نے جواب دیا۔

دوسرے دن ناگ پرستوں کا یہ گروہ روانہ ہو گیا اود اپنے پیچھے پراسرار سا راجا جان چھوڑ گیا۔

قلب گزک نے اپنے محافظوں میں سے دو کو بلایا۔ یہ دونوں اُس کی نظر میں تاباں اقامت و اود دیر سکتے۔ اُس نے اُن سے کہا۔ ”میں نے تیس قلعہ دار کی حیثیت سے نہیں۔ راز دار دوست کی حیثیت سے بلایا ہے۔ اگر میرا ایک کام کرو تو میں تمہیں وعدے دے کر غزنی بھیج دوں گا۔ اگر تم فوج سے نکل جانا چاہو گے تو تیس نکال دوں گا۔ تم جب یہاں سے جاؤ گے تو تمہارے پاس اتنا سونا ہو گا کہ تمہاری سات پشیش کوئی کام کیے بغیر پیش و عشرت کی زندگی بسر کریں گی۔ شرط یہ ہے کہ تم یہ راز کبھی کو نہیں دے گے کہ ہم کہاں جا رہے ہو۔ میں تیس ایک خاص لباس میں بھیجوں گا۔“

دونوں نے رہنما سندی ظاہر کر کے وعدہ کیا کہ وہ کسی کو پتہ نہیں چلے دیں گے کہ وہ کلاں جلد سے ہیں۔ قلوب گزک نے ان کے آگے ایک نقشہ رکھ دیا اور انہیں رات بھر لگا۔ جوں جوں محافظ راستہ سنتے جا رہے تھے، ان کے رنگ اڑتے جا رہے تھے۔

”تم نے کل رات وہ لوگ دیکھے ہوں گے جو سفید چادروں میں لمبوس یہاں آئے تھے۔“ قلوب گزک نے کہا۔ ”اگر تم اس مقام سے دیر پا کر گئے تو تمہیں وہ سفید پوش آدمی ملے گا جو رات یہاں آیا تھا۔ اس کے بعد سنا ما کام آسان ہو جائے گا۔ وہ تیس ایک بوٹی اور بہت سا سونا دے گا۔ یہ تمہارے لیے میرے پاس آ جاؤ گے۔ بوٹی بچھ دے دینا اود سونا تمہیں پس رکھ لینا۔“

”یہ بوٹی کیسی ہے؟“ ایک محافظ نے پوچھا۔

”ایک بار کھا تو انسان ایک سوسال سے زیادہ بھی زعمہ رہ سکتا ہے۔“ قلوب گزک نے کہا۔ ”اور مرتے دم تک انسان جوان رہتا ہے۔“

وہ محافظوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور مسکرا دیے جیسے انہیں سونے

سے زیادہ اس بوٹی کے ساتھ دلچسپی تھی۔

”دراصل جانا مجھے خد جائے تھا۔“ قلوب گزک نے کہا۔ ”سفید پوش ناگ پرست نے کہا تھا کہ میں خود جاؤں لیکن تم جانتے ہو کہ قلعہ دار سے عرصے کے لیے کسی طرح فوج حاضر ہو سکتا ہے۔ مجھے اتنا اختیار ہے کہ تم دونوں کو جہاں چاہوں اود جتنے عرصے کے لیے چاہوں بھیج سکتا ہوں۔“

گزک شہزادہ جب بہرام لڑکی سے راستہ سمجھ رہا تھا، اُس رات سفید پوش قلعہ دار کو راستہ بھار اٹھا اود اُس نے قلعہ دار سے کہا تھا کہ وہ خود آئے۔ اُس نے قلعہ دار سے یہ بھی کہا تھا کہ اُس نے ان لوگوں کی جس طرح خاطر عدالت کی ہے، اس کے بدلے میں وہ اسے پیشہ جوان رکھنے والی بوٹی اود کچھ سونا بھیجے گا۔

اود اب جب ناگ پرست چلے گئے تھے، بہرام اپنے نائب سے کہہ رہا تھا۔ ”تم جاؤ یا میں چلا جاتا ہوں۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی لیا تو برابر کی مسخول ہو سکتا ہے کہ گزک کوٹ تک کے علاقے میں چوکیوں کا انتظام دیکھنا اود اسے سہتر بنانا ہے لڑکی نے مجھے راستہ بھار دیا ہے، اگر ہم دہلی پہنچ گئے تو قصود میں لاؤ کہ ہم کیا ہے کیا بن جائیں گے جیسے ایک دوسرے کی مدد کی ضرورت ہے۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں، چار پانچ قابل اقامت آدمی ساتھ ہونے چاہئیں۔“

”کیا آپ نے یقین کر لیا ہے کہ ان لوگوں نے جو کو کاتبہ وہ اسکل ٹھیک ہے؟“ نائب مالار نے کہا۔ ”کیا آپ نے سوچا ہے کہ اس لڑکی نے اتنا نازک راز آپ کو کیوں دے دیا ہے؟“

”اس لیے کہ مجھے دیکھ کر وہ اپنے دل کے لفظوں مجھ پر جو گئی تھی۔“ بہرام نے جواب دیا۔ ”وہ جانتی ہے کہ میں اُس پراسرار اود دنیا کی نظروں سے اوجھل خطے سے سونا سمیٹ لوں اور اسے اپنے ساتھ لے آؤں۔“

”اور میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے اپنی لڑکیوں کی عزت بچانے کے لیے آپ کو اس لڑکی کے ذریعے دھوکا دیا ہے۔“ نائب مالار نے کہا۔ ”انہیں رات

کے لیے تیار کر رہا تھا قلعہ دار کے سامنے بھی سی ہلکا تھا کہ اسے اپنا ہنسنے وغیرہ نہ دیکھا تھا۔
وہ بھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ جو راز اسے ملا ہے، وہ کسی اور کو نہیں ملا۔

سفید ریش اپنے گمہ کے ساتھ سورج نکلنے سے پہلے قطعے سے رولہ ہو گیا تھا ان کے پاس ہاتھیوں والے آؤنٹ تھے جن پر لڑکیاں سوار تھیں اور مردوں کے لیے دودھ گھوڑوں والے گھوڑا گاڑیاں تھیں۔ جب یہ قافلہ تھانہ سرشہر میں سے گزر رہا تھا تو لوگ انہیں دیکھنے کو اکٹھے ہو گئے تھے۔ قافلہ شہر سے نکل گیا اور جھل میں داخل ہو گیا۔ سفید ریش نے اپنے ان دو آدمیوں کو جو گاڑی بان تھے، کہا: ”واپسی پر بھی خیال رکھنا کہ کسی چوکی کے قریب سے نہ گزرنا۔ تمہیں معلوم ہے کہ ان لوگوں کی چوکیاں کہاں کہاں ہیں۔“

دن آدھا گزر گیا تھا جب قافلہ دیران اور سفان علاقے میں داخل ہو گیا۔ وہاں کھڑا لے ادا اپنے نیچے نیلے اور گھائیاں تھیں اور خدمت بھی تھے لیکن یہ جنگی سرکنڈوں اور اچھی گھاس کا علم رہتا تھا۔ سفید ریش نے قافلے کو آرام کے لیے روک لیا۔ لڑکیاں ہاتھیوں میں سے تھیں۔ گھوڑوں سے رہیں اُتار دی گئیں۔ دیاں زمین پر بیٹھا کر سب بیٹھ گئے۔ سب بہت خوش تھے۔ لڑکیاں اچھل کود رہی تھیں۔ سفید ریش اور دوسرے آدمی انہیں دیکھ کر کہن رہے تھے۔

”ہمیں کس طرح پہنچے گا کہ ہم نے شکار مار لیا ہے؟“ ایک لڑکی نے پوچھا۔
”تھانہ سرشہر میں ہمارے آدمی موجود ہیں۔“ سفید ریش نے جواب دیا۔ ”تسلے کے قدر بھی ہمارے آدمی ہیں۔ اگر قلعہ دار اور سالار ہمارے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑے تو ہمارے آدمی کچھ مدت تک ان کا تعاقب کریں گے۔ جب انہیں پھنس ہو جائے گا کہ وہ ہتھیار گرا دیے ہوئے جا رہے ہیں تو انہیں معلوم ہے کہ کہاں کہاں اطلاع پہنچانی ہے۔ وہ جائیں گے منہ۔“

”جس سالار کے پاس مجھے بھیجا گیا تھا، وہ تو اسی وقت ہوش اور عقل کھو بیٹھا تھا۔“ ایک لڑکی نے کہا۔

”یہ مت سوچو کہ یہ لوگ اب کیا کریں گے۔“ سفید ریش نے کہا۔ ”وہ جو کچھ بھی کریں

میں خیال کرنا تھا۔ وہ دھوکہ دے کر اور اپنی لڑکیوں کی عزت بچا کر چلے گئے ہیں۔“

”تم میرا ساتھ نہیں دو گے؟“ بہرام نے کہا۔ ”میں نے تمہیں اپنا ساتھی نہیں اپنا عزیز دست بچ کر اپنے راز میں شریک کیا ہے۔ میں وہاں سے کچھ لاؤں گا اس میں تمہارا حصہ بھی ہو گا۔“ نراسو چوکیا ہمارے قسمت میں اپنے وطن اور اپنے عزیزوں سے وعدہ پر دس میں لڑنا اور کٹ ہنسی مکہ دیا کہ ہے؟ یہ ہمارا جوں اور سلطانوں کی جنگ ہے۔ خزانے بھرتے ہیں تو ان کے ہمیشہ و عشرت ان کے حصے میں آتی ہے۔ وہ ہمارے خون اور ہماری جانوں کو جنگ میں جھونک کر سلطان اور مارا جے بنے ہوئے ہیں۔

کیا ہمیں حق حاصل نہیں کہ ہم موت کے سامنے بے نکل کبابی عمر عیش و آرام سے گزاریں؟ بہرام نے جب لڑکیوں کے حسن کا ذکر چھوڑا تو نائب سالار کی آنکھوں میں چمک آنے لگی۔ بہرام نے کہا: ”تم کیوں فکر کرتے ہو؟ تم نہ جاؤ۔ میں جاؤں گا۔ میں اپنی جان خطرے میں ڈال رہا ہوں۔ بہتیں صرف یہ کام کرنا ہے کہ میری عزیز خاوری کو چھپائے رکھو اور یہی ظاہر کرو کہ میں دودھ دار کی چوکیوں کو دیکھنے اور انہیں بہتر بنانے کے لیے چلاؤں گا۔ ہٹوں قلعہ دار مجھے اس کام سے نہیں روکے گا۔ تمہارا دوسرا کام یہ ہو گا کہ قطعے پر حملے کا خطہ تو نہیں لیکن ہم دشمن کے پیٹھ میں بیٹھے ہیں دشمن پر بھرور نہیں کرنا چاہیے۔ اگر حملہ ہو جائے تو تم قطعے کو بچانے کے لیے جان ہلا دو تاکہ کسی کو میری کمی محسوس نہ ہو۔“

نائب سالار بہرام کی باتوں میں آ گیا۔ اُس نے راز چھپائے رکھنے کا وعدہ کیا اور ان کے سامنے اب مسئلہ یہ آ گیا کہ وہ کون سے چار آدمی ہو سکتے ہیں جن پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ سونے اور چین عورت کے لالچ میں تو ہر کوئی اس خفیہ اور پُر اسرار مہم کے لیے تیار ہو جاتا مگر انہیں خطریہ نظر آ رہا تھا کہ اتنی زیادہ دولت دیکھ کر یہ آدمی بہرام کو قتل کر دیں گے اور سب کچھ خود لے لیں گے۔ ان کے آپس میں لڑنے کا خطرہ بھی تھا، اس لیے چار آدمیوں کے انتخاب میں انہیں بہت محتاط ہونا تھا۔ انہوں نے اُسی وقت اپنے چھاپے مارے ہیں سے چار آدمیوں کا انتخاب شروع کر دیا۔

ان کا خیال تھا کہ ان دونوں کے سوا اس پُر اسرار قطعے ہمارا ہر کسی اور کو معلوم نہیں۔ سفید ریش ناگ پر سوار قلعہ دار کو راستہ بتا گیا تھا اور وہ اپنے محافظوں کو وہاں بھیجے

ہنگ پرستوں کا قافلہ کھانا کھا کر آرام کر رہا تھا۔ رہزنوں کا ایک گھوڑا ہنسنا ہاتھا جس کی آواز قافلے تک پہنچی تھی مگر انہوں نے توجہ نہیں دی تھی۔ انہیں معلوم نہ ہو سکا کہ رہزن اپنے گھوڑے ذرا دُور چھوڑ آئے ہیں اور پیدل آکر انہوں نے گھبرا ڈال لیا ہے۔

ایک تیز آیا جو قافلے کے ایک آدمی کے سینے میں اتر گیا۔ سب گھبرائے ہوئے اُٹھے۔ انہیں آواز سنائی دی۔ سب ایک طرف گھبرائے ہو جاؤ کسی کی آواز نہ ملے اور کوئی حرکت نہ ہو۔ سب ایک طرف ہو گئے سوائے اُس کے جس کے سینے میں تیز اُتر گیا تھا۔ ہرگز کے سر کندوں میں سے وہ گیارہ آدمی باہر آئے۔ اُن کی صرف تینیں جنگی تھیں۔ سرور پرمانے اور چہروں پر سیاہ رومال لپٹے ہوئے تھے۔ اُن کے ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ وہ جوشی سامنے آئے، قافلے کے تمام آدمیوں نے اُن سینہ چادر اُن کے اندر سے جو انہوں نے لباس کے طور پر اپنے جسموں پر لپیٹ رکھی تھیں، خنجروں سے بڑی اور بڑی تلواروں سے چھوٹی تلواریں نکال لیں۔

وہ جو ہاں سے دایب اور بڑے ہی محسوس گتے تھے، تیغ زن بن گئے۔ وہ درگاہ کو اپنے حصار میں رکھے ہوئے تھے اور رہزن اُن حصار کو توڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔

رہزنوں کی یہ خوش فہمی جلد ہی رفع ہو گئی کہ وہ ان نشتے راجہوں کو نہ پاؤں دیکھی۔ سے زیر کر لیں گے اور اُن کے پاس جو کچھ ہو گا وہ بھی ادا ان کی چادر اُن کیسوں کو بھی اٹھائے جائیں گے، گھر اُن کی تلواریں لپی تھیں۔ اسی سے انہوں نے قافلے کے آدمی مار ڈالے۔ درگاہ نے دایری کا یہ منظر ہر کہہ کا اپنے مرے ہوئے آدمیوں کی تلواریں اٹھائیں۔ رہزنوں کو اب لڑائیوں کی یہ ٹھکانہ دینے لگی۔ راجہوں کی بیٹیوں کو تم اہتہ نہیں دیا سکو گئے۔ دو تین رہزن بھی مارے گئے تھے۔

غزنی کی فوج کے وہ سات اکھ آدمی جو کسی چوکی سے قتلہ سر کی طرف جا رہے تھے، قریب سے گزرے۔ انہیں شور اور لٹکار سنائی دی۔ وہ رگ گئے اور اُٹھ کر دیکھا۔ انہیں ایک جگہ دس گیارہ گھوڑے نظر آئے۔ انہیں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں رہزن اور

گئے۔ ہمارے حق میں بہتر ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ تھانہ میں دایس مل جائے گا۔ ان میں سے کسی نے چونک کر کہا۔ میں نے گھوڑے کی آواز سنی ہے۔ اپنے گھوڑے کی ہوگی۔ ایک نے کہا۔

کسی نے توجہ نہ دی لیکن آواز اُن کے اپنے کسی گھوڑے کی نہیں تھی۔ یہ قافلہ جب تھانہ میں سے دُور جنگل میں چلا گیا تھا تو ایک نو عمر لڑکا جو ایک نیگری پر بیٹھا تھا قافلے کو دیکھ کر ایک جھاڑی کی اوٹ میں ہو گیا تھا۔ اُس وقت ادنیوں کی پالکیوں کے پر سے اُٹھنے ہوئے تھے اور لڑکیاں نظر آرہی تھیں گھوڑا گالوں سے بھی پریشان تھا کہ قافلہ قیمتی ہے۔ لڑکا اوپر سے سرک کر دوسری طرف سے اُتر گیا اور بہت تیز دوڑا تاہو کسی طرف غائب ہو گیا تھا۔

لڑکا جہاں لگا۔ وہاں دس ہارہ آدمی زمین پر لیٹے ہوئے تھے اور قریب ہی اُن کے گھوڑے بندھے تھے۔ لڑکے نے انہیں بتایا کہ وہ کیا دیکھ آیا ہے، اور اس قافلے کا رُخ کدھر کو ہے۔ ان میں سے ایک آدمی اُٹھا اور لڑکے کے ساتھ چلا گیا۔ اُس نے بھی ایک جگہ چھپ کر دیکھا اور لڑکے کی پیچھے تھپک کر واپس آ گیا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ سوا شکار ہے۔ پیچھے تو انہوں نے نیکو کیا کہ قافلے کا تاقب جاری رکھا جائے اور رات کو چلے کیا جائے لیکن ایک نے کہا کہ دن اور رات کا خیال نہ کر دو صرف یہ دیکھو کہ غزنی والوں کی کوئی فوجی چوکی قریب نہ ہو کسی چوکی تک آؤ اور پہنچ گئی تو وہاں سے پابھی دھڑے آئیں گے اور ہم میں سے کوئی بھی نہیں بھاگ سکے گا۔

ان بہت مسلمانوں نے ہمارا تالاک میں دم کر دیا ہے۔ ان رہزنوں کے سردار نے کہا۔ ہم ہمارا جو کو اسی لیے بند کرتے ہیں کہ اپنی راجہ جانوں کے باہر کہ وہ پرواہ ہی نہیں کرتے۔ ان غزنی والوں نے تو جنگل میں بھی اپنی حکومت قائم کرنی ہے یہاں تو چار دن چھوٹ تھی۔ بہتر ہے چل پڑو جہاں تک سمجھتے ہیں ہے۔ قریب کوئی چوکی نہیں؟ قریب تو کوئی چوکی نہیں تھی اور نہ ہی کوئی پابھی تھی لیکن غزنی کی فوج کے سات آٹھ پابی ایک چوکی میں سے واپس تھانہ میں جا رہے تھے۔ وہ گھوڑوں پر سوار تھے اور گپ شپ لگاتے چلے جا رہے تھے۔

قافلے کو لوٹنے کی کوشش کی اور ان کے کئی آدمی اور دو لڑکیاں قتل کر دی ہیں۔ انہیں ساتھ لائے والے فوجیوں کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ لوگ میں سے کسے بنتے۔

قلعہ دار نے حکم دیا کہ سفید ریش کو پھانے کی پوری کوشش کی جائے۔ بظاہر یہ انسانی بھدروی کا مظاہرہ تھا لیکن قلعہ دار قلعہ گزرک اپنی گم گشتہ لڑائی اور بے حرکات خاطر سفید ریش کو پھاننا چاہتا تھا۔ طبیب فوراً سرگرم ہو گئے۔ دونوں کیوں پر ایسی دہشت طاری تھی کہ ان کے منہ سے بات سنیں نکلتی تھی۔ انہیں الگ کمرے میں رکھا گیا اور ان کی خدمت اور دیکھ بھال کے لیے دو عورتوں کو بلا لیا گیا۔ قلعہ دار اور سالار نے انہیں سلی دلا سے دیئے اور کہا کہ انہیں فوج کی حفاظت میں ان کی منزل تک پہنچا دیا جائے گا۔

سفید ریش بے ہوش تھا۔ رات بھر طبیب اور جراح اس نے زخموں کی مرہم پٹی اور خون روکنے میں لگے رہے اور اس کے منہ میں دوائیاں ڈالتے رہے۔ قلعہ گزرک ان کے سر پر سوار رہا۔ دوسرا دن آدھا گزر چکا تھا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں اور اس نے سرگوشی میں پوچھا کہ وہ کہاں ہے۔ اسے بتایا کہ وہ کھانا سر قلعے میں ہے اور قلعہ دار نے اپنی ذاتی نگہبانی میں اس کی مرہم پٹی کی ہے۔

وہ شام کے بعد ذرا بولنے کے قابل ہوا۔ اسے بتایا گیا کہ اس کے گروہ کی دو لڑکیاں زندہ ہی ہیں۔ اس نے دونوں سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو لڑکیوں کو اس کے پاس لے گئے۔ ان لڑکیوں نے بتایا کہ غزنی کے فوجیوں نے انہیں رہزنوں سے بچا یا ہے اور اسٹی فوجیوں نے اسے زندہ دیکھا کہ اسے کھانا غیر شک پہنچایا ہے۔ لڑکیوں نے اسے یہ بھی بتایا کہ قلعہ دار اور سالار نے ان کا سبب زیادہ خیال رکھا ہے اور ان کے لیے دو عورتیں مقرر کر دی گئیں۔

بوڑھے کے السنو عمل آئے۔ اس پر جذباتیت غالب آگئی۔ اس نے لڑکیوں سے کہا کہ میں ان لوگوں کو مزید دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔ قلعہ دار کو میرے ساتھ اپنے فائدے کے لیے مل جی ہو سکتی ہے، ان فوجیوں کو میرے ساتھ کیا دیکھی تھی؟ یہ لوگ تم جیسی دلکش لڑکیوں کو احترام سے لائے اور منساری دیکھ بھال کی۔ انہوں نے مجھے

ڈاکو بنگلوں میں موجود سب سے میں اور قافلوں کو لوٹ لیتے ہیں۔ وہ پیدل یا گھوڑوں وغیرہ پر سفر کرنے کا زمانہ تھا۔ تاہم ابھی ان قافلوں کے ساتھ ادھر ادھر آیا جایا کرتے تھے۔ اگر قافلہ چھوٹا ہوتا تو اس پر حملے کا زیادہ خطرہ ہوتا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں نے رہزنی کا کوئی رستہ نہیں کیا تھا۔ سلطان محمود غزنوی نے اپنی فوج کو کہ جسے اس نے ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں میں رکھا تھا، حکم دیا تھا کہ قلعوں اور شہروں سے دُور جو فوجی چوکیاں ہیں، ان کے ذمے فوجی فرائض کے علاوہ یہ ذمہ داری بھی ہے کہ اپنے اپنے علاقے میں گشت کا انتظام کریں اور مسافروں کو حفاظت اور سلامتی دیا کریں اور گھوڑوں اور رہزنوں کو اپنا بدترین دشمن سمجھ کر انہیں ختم کریں۔

ان فوجیوں نے اپنے گھوڑوں کے رُنج اور کمر کو موڑے اور گھوڑے دوڑا دیئے۔ وہاں انہیں لاشیں اور خون نظر آیا۔ تین چار نقاب پوش دو لڑکیوں کو اٹھائے کی کوشش کر رہے تھے۔ فوجیوں نے انہیں ملکارا تو وہ لڑکیوں کو پھینک کر بھاگ اٹھیں۔ ان کے ایک دو آدمی ساتھ بھی زندہ تھے۔ وہ بھی بھاگے لیکن فوجیوں نے انہیں دُور نہ جانے دیا اور انہیں ان کے گھوڑوں تک نہ پہنچنے دیا۔ سب کو زندہ پکڑ لیا۔

ادھر آکر دیکھا تو صرف یہ دو لڑکیاں زندہ تھیں۔ باقی دو اور ان کے ساتھ سب آدمی مارے گئے تھے۔ لڑکیوں نے ان کی لاشیں دیکھیں تو سفید ریش کے سبق فوجیوں کو بتایا کہ ابھی زندہ ہے۔ اسے دیکھا۔ اس کے جسم پر کئی زخم تھے اور وہ زندہ تھا۔ فوجیوں نے اس کے منہ میں پانی پڑایا۔ اسے اسٹاکر ایک گھوڑا گاڑی میں ڈال لیا۔ لڑکیوں کو دوسری گھوڑا گاڑی میں بٹھا دیا گیا۔ رہزنوں کے ہاتھ باندھ کر ان کی ریتاں گھوڑوں کے ساتھ باندھ دی گئیں۔ ان کے گھوڑے بھی ساتھ لے لیے گئے اور یہ قافلہ کھانا سر کی طرف چل پڑا۔ لاشیں وہیں رہنے دی گئیں۔

جب گھوڑا گاڑیاں، پالکیوں والے اونٹ اتنے زیادہ گھوڑے اور چار پانچ قیدی گھوڑوں کے ساتھ بندھے ہوئے اور غزنی کے فوجی کھانا سر قلعے میں داخل ہوئے، اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ قلعہ دار قلعہ گزرک اور سالار بہم غور کو اطلاع ملی تو نہ دھڑکتے آئے۔ انہیں بتایا گیا کہ یہ رہزن ہیں جنہوں نے راہبوں کے

نئی زندگی دی.... میں انہیں دھوکے میں نہیں رکھوں گا۔

اُس نے قلعہ دار قطب گرگ سے ملنے کی خواہش ظاہر کی تو قلعہ دار کو اطلاع دی گئی۔
وہ فوراً اٹھیا اور لڑکیاں چلی گئیں۔

”میں آپ کی فوج کو اس احسان کا بدلہ دینا چاہتا ہوں۔ سفید ریش نے منحرف
آواز میں کہا۔

”آپ اسے احسان نہ سمجھیں۔ قلعہ گرگ نے کہا۔ آپ پہلے محنت یا بہر
لیں۔ میں نے دو آدمی تیار کر لیے ہیں جو آپ کے ساتھ جائیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ
مجھے کیا چاہیے۔ بالی رمان چاہیں کہ افسانہ جو آپ کو رمان سے اٹھا لائے، میں تو جب
آپ محنت یا بہر کو واپس جائیں گے تو ان کے لیے کچھ سونا بھیج دینا۔“

”میرے پاس نہ آپ کے لیے کچھ ہے نہ ان چاہیوں کے لیے۔ سفید ریش نے
کہا۔ میں احسان کا بدلہ آپ کو ہمیشہ جو ان رکھنے والی بوٹی اور پیاسیوں کو سونا دے
کر نہیں دینا چاہتا بلکہ اس احسان کا بدلہ یہ ہے کہ آپ کو بتا دوں کہ نہ کوئی لڑکی بوٹی ہے
جو انسان کو ہمیشہ جو ان رکھ سکتی ہے اور نہ کسی جگر سونا بکھرا ہوا ہے جو میں کسی کو دے
سکوں۔ اب آپ چاہیں تو مجھے اٹھا کر قلعے کی دیوار سے نیچے پھینک دیں اور
جو دو لڑکیاں آپ کے پاس ہیں انہیں اپنے قبضے میں رکھ لیں۔ میں آپ کے ساتھ
سب سے بڑی لڑکی کو راہوں کو آپ کو اپنا راز دے دوں۔ جیسا کہ آپ کہہ رہے ہیں
کہ آپ نے بوٹی لانے کے لیے دو آدمی تیار کر لیے ہیں، اگر وہ آدمی چلے جاتے تو
جنگلوں میں بھٹک بھٹک کر مر جاتے۔ آپ کے دوڑے اہم آدمی میرے ساتھ کی
لڑکیوں کے جھانسنے میں آگئے تھے۔ وہ سونے اور ہریہ کو سنا بنانے والے مکے
کی تلاش میں نکل گئے ہوتے۔“

قلعہ دار کے چہرے نے کئی رنگ بدلے اور وہ کھینا نہ سا ہو کر دانستوں سے پلٹنے
سوٹ کاٹنے لگا۔

”آپ اتنے پریشان نہ ہو جائیں۔ سفید ریش نے کہا۔ میں اب بھی آپ کو
اسی دھوکے میں رکھ سکتا تھا جو آپ کو دے دیا تھا اور میں آپ کے ہاتھوں محنت یا بہر

بھی جو بکتا تھا مگر مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ کی فوج کا اخلاق اس قدر ادنیٰ ہے یہ آپ
کے مذہب کا اثر ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہم سب لاہور سے آئے ہیں۔ ہمیں کھم پال
نڈر کے وزیر نے یہ کہا ہے جہاں منصوبہ یہ تھا کہ آپ کو اور آپ کے سالاروں کو سونے،
نندو جواہرات اور زمین لڑکیوں کے خوب لکھا کر آپ کو گزرا کر دیا جائے۔ آپ کو تلو سے
قاتل کرنا بھی مقصود تھا۔“

”آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم گزرا ہو جائیں گے؟“ قلعہ دار قطب گرگ نے پوچھا۔
”آپ انسان ہیں، ارشد نہیں۔“ سفید ریش نے کہا۔ انسان کتنا ہی نیک اور مہذب ہو
کیوں نہ ہو اس میں ہمیشہ ریشرت کی خواہش ضرور ہوتی ہے۔ آپ اس خواہش کو دبا سکتے
ہیں، مہنسیں سکتے۔ دولت اور عزت کو عیش و عشرت کا ذلیقہ کھا جاتا ہے۔ ہم انسان
کی کمزوریوں سے آگاہ ہیں۔ ہر انسان میں ہمیشہ جو ان رہنے کی بھی خواہش ہوتی ہے۔ میں
نے آپ کے بڑھاپے کو دیکھ کر آپ کی اس کمزوری کو سید کر دیا تھا۔ آپ نے کہا کہ آپ
کو سونے اور خزانے کی ضرورت نہیں، اجالی کی ضرورت ہے۔ میں نے کہا کہ میں دوں گا۔“
قلعہ گرگ کے چہرے پر ہندامت کے آثار نمودار ہوئے۔

”آپ کو پریشان نہیں ہونا چاہیے۔“ سفید ریش نے کہا۔ ”آپ کی جگہ
کوئی اور ہونا تو وہ بھی جہاں سے جال میں اسی طرح آتا جس طرح آپ آگئے تھے۔ ہم
ان لڑکیوں کو اس لیے ساتھ لائے۔ مجھے کہ آپ کو اپنے بڑھاپے کا احساس ہو۔
میں نے دنیا دیکھی ہے۔ میں نے انسانوں کو آسمانی قریب سے دیکھا ہے جیسے ان کے
ہضمران کے دل اور روئیں بھی دیکھ لی ہوں۔ میں نے آپ پر اپنے اس ظلم اور تجربے کو
لکھا ہے۔ اپنے انھیں کی خواہشات اور دنیا کے لالچ میں آکر انسان اپنی عقل سے باہمی
ہو جاتا ہے۔ فرض کو انسان بے معنی سمجھنے لگتا ہے۔ وہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ وہ سماج کی
طرف جارہا ہے۔ وہ تسلیم نہیں کرنا کہ خزانہ کبھی واپس نہیں آتی اور وہ حالی مسرت کرنے
اور جواہرات سے اور مالی لذت سے حاصل نہیں ہو سکتی جو کہ اس راز کو پالتا ہے۔ اُسے
آپ مومن اور ہمیشگی کہتے ہیں۔ یہ آپ کا ایمان اور ہمارا دھرم ہوتا ہے۔ جس
انسان کی اپنی ذات کا تلو کمزور ہوتا ہے، وہ بڑے مضبوط قلعے مار جاتا اور دشمن

اور ناگ پرستوں کی صورت میں جو حملہ کیا تھا، ناکام ہو گیا ہے لیکن اُسے یہ نہ بتایا جا سکا کہ اُس کے پیچھے ہوئے آدمیوں نے راز بھی فاش کر دیا ہے۔ وہ دراصل اس سکیم کا قائل بھی نہیں تھا۔ اُسے اپنی دلیری اور جرات اور جنگی امور کی سوجھ بوجھ پر بجا طور پر ناز تھا۔ اُس نے جنگی تیاریاں تیز کر دیں اور کسی بڑی ہی شکل زمین کا انتخاب کرنے لگا۔

جہلم سے راولپنڈی کی طرف جائیں تو ایک پہاڑی سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ اس میں سے غرک بھی گزرتی ہے اور میل کی پٹری بھی۔ ان راستوں کی صورت دروں کی سی ہے۔ یہاں ایک مقام ہے جسے نو جوان کہتے ہیں اور اس پہاڑی کا نام بال ناٹھ ہے۔ روایت مشہور ہے کہ راجھنے سیں آکر جوگیوں کا روپ دھار اور کانوں میں جوگیوں والے کڑے ڈالے تھے۔

یہ مقام جوگیوں کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ اس کے ارد گرد کا علاقہ چٹائی ہے اور کھڈا نامے بھی ہیں سلطان محمود غزنوی کے دور میں یہ شیعہ اور زیادہ گہرے اور دشوار ہوں گے۔

بھیم پال نڈر نے سلطان محمود غزنوی سے ٹکر لینے کے لیے اس علاقے کا انتخاب کیا اور اپنی فوج کو وہاں منتقل کرنا شروع کر دیا۔ سلطان کو لکارنے کی صورت میں غزنی کی فوج کو لاہور کی طرف بڑھنے کے لیے اسی علاقے سے گزرنا تھا۔ بھیم پال نڈر وسیع میدان پر گھات لگا رہا تھا۔ اُس نے اپنے فوجی کمانڈروں سے کہا کہ وہ فوج کو پہاڑی علاقے سے دو ٹاس کر ایس اور پیادی جنگ کی ترس کراتے رہیں وہ زیادہ تر توجہ تیراندازوں کی طرف دے رہا تھا اور یہ ہدایت کہ تیرانداز بلینڈوں سے نیچے نہ آئیں۔ دائروں میں گھری ہوئی غزنوی فوج کو گھیرنے کے لیے وہ سوار دستے تیار کر رہا تھا اچھوں کو اُس نے تنگ راستوں اور میدان علاقوں کے لیے رکھا تھا۔

ایک دن بھیم پال نڈر کو اطلاع ملی کہ تھاغیر سے غزنی کے قلعہ دار کا اہلچل آیا ہے اور اس کے ساتھ ایک سفیریش بوڑھا اور دو لڑکیاں ہیں۔ بھیم پال نے انہیں

کو دے مٹھا ہے۔ آپ اپنے فرض سے ہٹ گئے تھے۔ ہمیں اپنے منصوبے کو ابھی لگے چلانا تھا....

”میں آپ کو ایک نصیحت کرتا ہوں کہ یہ دو لڑکیاں رہزنیوں سے بچ گئی ہیں، انہیں اپنے پاس نہ رکھ لینا، ورنہ یہ آپ کو آپ کے سالاروں اور کمانڈروں سے اور انہیں آپس میں بکرا دیں گی۔ اگر شکست سے بچنا چاہتے ہیں تو اپنے نفس کو اپنے قبضے میں رکھیں۔“

سفیریش کے زعم ایک مہینے میں ٹھیک ہو گئے۔ اس ایک مہینے میں سالار بہرام غور کو پتہ چل گیا کہ کوئی ایسا خط نہیں جہاں سانپ اور انسان لکھتے ہیں، اور دونوں لڑکیوں نے اُسے یہ بھی بتایا کہ سانپ کے منہ کی کوئی حقیقت نہیں۔ اس انکشاف کے وجود سفیریش کا علاج ہو نہ اور طب گزک اس کی تیار داری میں کچی تیار شدہ دونوں لڑکیوں کو پوری عزت سے رکھا گیا۔ آغراں کے جانے کا وقت آگیا۔

”آپ جاتے ہیں۔“ طب گزک نے سفیریش سے کہا۔ ”آپ دشمن بن کر آئے تھے اور ہم آپ کو دوستوں کی طرح رخصت کر رہے ہیں۔ اگر آپ ہمارے سلوک کی قدر کرتے ہیں تو ہمیں اس کے عوض یہ بتائے جائیں کہ آپ کے ہمارے کی نیت اور ارادہ کیا ہے کیا وہ ہمارے سلطان کا باجگزار ہے یا اپنے باپ کی شکست کا انتقام لے گا؟“

”ہم نے آپ کے ایمان اور کردار پر جو حملہ کیا ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ برابر بھیم پال آپ کے سلطان کو لکارے گا۔“ سفیریش نے کہا۔ ”وہ اگلی رات ہی تیار کر لیا ہے۔ وہ باجگزار نہیں رہے گا۔ اُس نے آپ کے تمام قلو داروں اور سالاروں کو ذہنی اور جنائی طور پر ہکا کر دینے کے لیے یہی منصوبہ بنایا ہے جس پر غزنی ہم آئے تھے۔ اُسے یقین دلایا گیا ہے کہ اس طرح غزنی کی جو فوج یہاں ہے وہ ہکا ہو جائے گی، لیکن اصل منصوبہ یہ ہے کہ وہ کسی بہت ہی دشوار باجگزار سلطان محمود کو لڑائے گا اور اس کے ساتھ یہ اعلان کر دے گا کہ وہ سلطان کا باجگزار نہیں۔“

بھیم پال نڈر کو تھاغیر سے اطلاع ملی تھی کہ اُس نے سفیریش راہبوں

نذر لایا۔ لمبی نائب سالار تھا جو بارہ سافظوں کے ساتھ آیا تھا۔

”ہمارا جی!۔ لمبی نے کہا۔“ یہ کہ امانت دل پس کر لے آیا ہوں یہیں افسوس ہے کہ آپ کے پیچھے ہوئے بانی آدمی اور دو لڑکیاں ریزنوں کے ہتھوں ماری گئی ہیں۔ یہ شخص رخصوں سے چور زخم تھا۔ اسے ہمارے سپاہی اٹھا لائے اور ان دو لڑکیوں کو ریزنوں سے بچھڑا لائے۔ ہم انہیں جلدی عباس کر دیتے لیکن اس بزرگ کا علاج ضروری تھا۔ وہ ہم نے کیا۔ آپ اس سے امدان لڑکیوں سے پوچھ لیں کہ ہم نے امانت میں خیانت تو نہیں کی؟ ان سے پوچھ لیں کہ ان کے گروہ کا کوئی فرد ہمارے ہاتھ سے تو نہیں مرا؟“

اُس وقت کے وقائع نگار لکھتے ہیں کہ بھیم پال نذر جیسا جا بار اور جری جگہ آنا شرمسار ہوا کہ وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ نائب سالار کی گردن تکی جھلی تھتی۔

”آپ ہمارے باجگزار ہیں۔“ نائب سالار نے کہا۔ ”ہمارا اور آپ کا معاہدہ ہے کہ ہم ایک دوسرے کے خلاف کوئی ناجی کاروائی نہیں کریں گے لیکن آپ نے ایسی جی کاروائی کی ہے جس سے ثابت ہو گیا ہے کہ ہندو راجپوت سانپ سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔“

بھیم پال مذہب کی سخت میدان ہو گیا اور اپنی ران پر بڑی زور سے ہاتھ مار کر بولا۔

”باجگزار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے منہ میں جو آئے وہ کھڑا لو۔“
 ”درباریوں نے اپنی تواروں کے دستوں پر ہاتھ رکھ لیے اور انہوں نے چہروں پر قہر بھرے غصے کے آثار پیدا کر لیے۔ نائب سالار نے نظریں گھما کر سب کو دیکھا اور مسکرایا۔“

”ایک آدمی کے خلاف اتنے آدمی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں؟“ نائب سالار نے کہا۔ ”ہمارے سلطان کے دربار میں اگر اس کا بیٹا بھی کسی ہمان کو گھور کر اپنی تلوار پر ہاتھ رکھے تو سلطان اُس کا ہاتھ کاٹ دیں۔ تلواریں میدان میں نکلا کر لیں۔ اگر تم جنگجو ہوتے تو اس بوڑھے اور ان جوان لڑکیوں سے ہم پر حملہ نہ کرتے۔ یہ تمہاری بیٹیاں ہیں۔ ان کی عزت اور عصمت کو ہتھیار بناتے ہو؟“

ایک ذائق نگار لکھتا ہے کہ بھیم پال کے دربار میں جو آدمی ترجمان کا فرض ادا کر رہا تھا، اُس نے نائب سالار کے ان جملوں کا ترجمہ ذرا دھیل سی زبان سے کیا کیونکہ الفاظ بڑے سخت اور توہین آمیز تھے۔ نائب سالار نے اُسے کہا۔

”مجھے معلوم نہیں کہ تم میرے الفاظ کا معنی ترجمہ کر کے اپنے ہمارا ج کو مار رہے ہو یا نہیں لیکن میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ تم میرا جوش اور جذبہ ہمارا ج تک نہیں پہنچا رہے۔ میرے پرجوش لیے میں میری بات بدلج کر نکال دیتا ہوں۔“

ترجمان نے یہ بھی ہمارا ج بھیم پال نذر کو سنا دیا۔

”محترم مہمان!۔ بھیم پال نے کہا۔“ آپ کا باجگزار میرا باپ تھا۔ وہ مر گیا ہے۔ مجھے ابھی فیصلہ کرنا ہے کہ میں باج ادا کروں یا نہیں۔ دوستی کا معاہدہ قائم رہے گا۔“

”میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ آپ کو دعوت اسلام دوں۔“ نائب سالار نے کہا۔ ”آپ کے دادا نے ہم سے شکست کھائی، آپ کے باپ نے ہم سے شکست کھائی، اب آپ کی باری ہے۔ آپ نے نوجوان لڑکیوں کی قربانی دی۔ آپ پتھر کے بیڑوں کے آگے اٹھ جود کر گڑ گڑائے۔ آپ کو کیا ملا؟ شکست خیز فنا کی شکست۔ کیا آپ ابھی تک نہیں سمجھے کہ آپ باطل کی پوجا کر رہے ہیں اور آپ کو وہ خلد سزا دے رہا ہے جو حدہ لاشریک ہے، اور سزا بھی اور جزا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے۔ آپ اسلام قبول کر لیں۔“

”ہم کسی لمبی کوتاہی دھیل نہیں دیا کرتے کہ وہ کسی کے دربار میں اُس کے مذہب کا توہین کرے۔“ بھیم پال نذر نے کہا۔ ”آپ میری اور میرے مذہب کی توہین کر کے مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں دوستی کے معاہدے پر نظر ثانی کر دوں۔ آپ جا سکتے ہیں۔“

نائب سالار چلا گیا۔ سفید ریش اور دونوں لڑکیاں وہیں کھڑی رہیں۔

”جے جادہ انیس۔“ بھیم پال نے گرج کر کہا۔ ”انہیں میری نظروں سے اوجھل کر دو۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ یہ حربہ استعمال کیا جائے۔ یہ بوڑھا اور یہ لڑکیاں میرے

یہ طعنہ بنی رہیں گی۔ میں کھٹے میدان میں لڑوں گا اور سلطان محمود کو قیدی بنا کر اور مندر
میں سے جا کر پوچھوں گا کہ اب تباہ خدا کس کا سپنا ہے۔

جہلم کے قریب کا کوہستانی علاقہ فوجی کیمپ بن گیا۔ وہاں اتنے درخت نہ ہوں
تھے جتنے فوجی تھے۔ پنڈتوں نے ایک بار پھر ہندوؤں میں سلطان محمود غزنوی کے خلاف
دبی پروپیگنڈہ شروع کر دیا جو وہ پہلے بھی کر چکے تھے۔ اب کے بھی اس کا اثر دبی
ہوا جو پہلے بھی دیکھنے میں آیا تھا۔ وہ غیر فوجی لوگ لاہور میں جمع ہونے لگے جو تین دن
اور تیر اندازی کے ماہر تھے۔ لوگ راجہ جہیم پال کا خزانہ بھرنے لگے۔ عورتوں نے اپنے
زیورات خزانے میں جمع کر دیئے۔ ہر کسی کے دماغ پر اسلام کا اور جنگ کا بھوت سوار
تھا۔ دُور دُور سے ہندو جہلم لاہور کئے لگے اور ان میں جہلم کی طرف روانہ کیا جانے
لگا۔

محمود غزنوی کو اطلاع ملی، رہی تھیں لیکن ابھی یہ پتہ نہیں چل رہا تھا کہ جہیم پال
مندر کا ارادہ بدل کرنے کا ہے یا وہ حملے کی دعوت دینا چاہتا ہے۔ ۱۲۰۱ کا سال گزر گیا۔
۱۲۰۲ (۴۴۳ھ) کا سال بھی گزرنے لگا۔ اکتوبر کے وسط میں اُسے محدثہ اطلاع ملی
کہ جہیم پال نے اعلان کر دیا ہے کہ وہ غزنی کا باگبند نہیں اور اُس نے دوستی کا
مسامحہ بھی توڑ دیا ہے۔ سلطان کو جا سوسوں نے یہ بھی بتا دیا کہ جہیم پال نے اپنی تمام
فوج ہمکے قریب پرادی سلسلے میں گھات کی صورت میں پھیلا دی ہے۔

ہمارا جہیم پال کو مذکر کا خطاب دیا گیا تھا اور سلطان محمود غزنوی بے صبر تھا۔
کفر کے خلاف ہمیں پابکار رہنا تھا۔ وہ غصے سے لال ہو گیا۔ اُس کی فوج نے آرام
کر لیا تھا اور اُس نے فوج کی کسی بھی پوری کر لی تھی۔ جہیم پال کا خیال تھا کہ سلطان محمود
کچھ دیر بعد غزنی سے چلے ہندوستان پہنچے پہنچے اُسے چھ مہینے لگ جائیں گے۔ اُس وقت
ایک موسم سرما گزر چکا۔ جو کما اور موسم بارش کا آغاز ہو گا اور یہ موسم لڑائی کے لیے موزوں
ہو گا، گھمسان کے خواب بٹا ہونگے۔

وہ گھات کھل کر کے لاہور میں مینا تھا کہ اُسے اطلاع ملی کہ غزنی کی فوج مار کاہ۔

کی پیادہوں میں سے نکل آئی ہے۔ مار کاہ کی پیادیاں راولپنڈی کے قریب ہیں۔ جہیم پال
مندر سلطان محمود کی تیز رفتاری سے واقف نہیں تھا۔ وہ لاہور سے جہلمت میں روانہ ہوا یہ
دوڑ تھی کہ وہ بال ناتھ تک پہنچتا ہے یا سلطان محمود ہوا ایلوں کے سلطان محمود مار کاہ
سے نکل کر رات بھر کے لیے رگ گیا۔ اُسے اپنی اپنی جہت سے معلوم کرنا تھا کہ دشمن
کہاں ہے اور اُس کا ڈیڑھ پلٹے کیا ہے اور وہ لڑائی میں کیا اہم انداز اختیار کرے گا اپنی
دیر میں جہیم پال مندر بال ناتھ کے مقام پر پہنچ گیا۔ یہ جگہ پیادوں اور چٹانوں میں گھری
ہوئی ہے۔ جہیم پال نے اسے قطعے کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا اور وہاں حملہ
بند ہو گیا۔

ایک موٹے نے کھا ہے کہ یہ لڑائی مار کاہ میں ہوئی تھی لیکن بیشتر مؤرخین نے
بال ناتھ کا سلسلہ کوہ لکھا ہے۔ پولی موٹوں نے اسے بال نہٹ لکھا ہے۔ بہت سی جگہ
اور گردیزی نے اس جگہ کا پرانا نام ننڈا بھی لکھا ہے اور نزدیکی بھی لیکن اس کا
محل وقوع (عرض بلد اور طول بلد کے حساب سے) جو لکھا ہے وہ بال جوگیاں اور پیاسی
بال ناتھ ہے۔

سلطان محمود کو اگلے روز صبح اطلاع ملی گئیں۔ اُسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جہیم پال
مندر کے مقام پر قلعہ بند ہے اور وہ زمین کیسی ہے۔ اُسے بتایا گیا کہ ہندوؤں پر تیر انداز
ہیں۔ ان اطلاعات کی روشنی میں سلطان محمود نے اپنے سالاروں سے کہا کہ وہ لاہور
تک نہیں جائیں گے اور جہلم کے پیادہ سلسلے میں سے جو راستہ زبردستی، اُس راستے
پر بھی نہیں جائیں گے۔ سلطان نے نمایاں کا انتظام کر لیا اور اپنے چچا بہادر ستوں کو
ضروری ہدایات دے کر آگے بھیج دیا۔

جہیم پال مندر کی فوجی طاقت سلطان محمود کی نسبت خاصی زیادہ تھی اور وہ نہایت
اچھی اور جنگی کمانڈر۔ برز پوزیشن میں تھی۔ غزنی کی فوج جلد آہ موہری تھی۔ جو چہ بند
فوج پر حملہ کرنے والی فوج کی تعداد زیادہ تھی چاہیے کہ اس کا نقصان زیادہ ہو گا
ہے۔ سلطان محمود کو یہ سہولت حاصل نہیں تھی۔ اسے چچا بہادر کو نہایت چابکدستی

مستقل ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ چالیس ہزار سال پرانا ہے۔ سلطان محمود نے اس منہ
کو جیلوں سے ہی اکھاڑ پھینکا اور بت کو زہرینہ کر دیا تھا۔
سلطان محمود جولائی ۱۰۱۰ء میں دہلیس غزنی چلا گیا۔

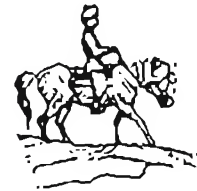
قلعہ جو سر نہ ہوا

۱۰۴ عیسوی کی آخری سہ ماہی کا واقعہ ہے جنہم کے قریب کے سلسلہ کوہ کی بال ناتھ تھیری پر مہول سا ایک تلہ تھا جس میں سلطان محمود غزنوی کی فوج کا ایک نیا وہ فخریہ والادہ رہتا تھا پنجاب کے مہاراجہ بھیم پال منڈ کا اس مقام پر شکست دے کر سلطان محمود نے اسے اپنا ہنگامہ بنایا تھا سلطان میاں این حکومت قائم نہیں کر سکا تھا کیونکہ اس کی غیر حاضری میں غزنی کی سلطنت کے حالات بگڑنے لگے تھے یہاں تک کہ مہاراجہ سلطان کو حق حاصل تھا کہ وہ پنجاب میں جہاں چاہے اپنے ایک دودھ سے رکھے اور ان کے اغراجات مہاراجہ پنجاب ادا کرتا ہے۔

ان رشتہ داروں میں رہتے مکنی بیٹے گزرتے تھے۔ قلعہ دار سادوک نام کا ایک بڑا اور غلاماں کرمان کے علاقہ کاربنہ والا تھا۔ ایک روز قلعے میں دو گھوڑا سوار آئے۔ ایک امام سجدہ تھا اور دوسرا غلام کی فوج کا یہاں تھا۔ یہ کشمیر سے آئے تھے۔ سفر باز آیا تھا جس کے اثرات ان کے چہروں اور سمون پر صاف نظر آ رہے۔ پتھر سے مڑجھائے ہوئے اور ہوش پھٹے ہوئے تھے۔ ان پر گرد کی دیر تیرا سی تھی کہ وہ ہت تیرا آئے ہیں اور رستے میں بہت کم رُکے ہیں۔ وہ آتے ہی قلعہ دار سادوک کے پاس چلے گئے۔

”آپ لوگ بہت شکلی ہوئے ہیں۔“ ساروٹ نے انہیں کہا۔ ”اب انہیں پھر
میں وہاں لے آؤں گی۔“

” ہمارے چہرہ پر ہرگز کائنات نہیں جتنا اس خبر کا کہ جو ہم سنانے آئے
ہیں۔“



کہ بائیس نہ کریں محترم امام! آپ نے کیا دیکھا ہے؟
 ”ہم وہاں گئے اور لوگوں کو بتانے لگے کہ اسلام کیا ہے۔“ امام نے زالا۔ ہم
 انہیں نماز پڑھانے لگے اور بتانے لگے کہ مسلمان کی فرمائش کیا ہے اور خدا کے ساتھ
 مسلمان کا کیا تعلق ہے۔ وہاں کے لوگ سلطان کے حکم سے مسلمان تو ہو گئے تھے لیکن
 ہم انہیں اسلام کی تعلیم دینے لگے تو وہ دل و جان سے اسلام کو نڈل کرنے لگے۔
 غصہ ہو کر ہم نے انہیں دھمکیاں دیں کہ اگر تم اسے نہیں مانو تو ہم تمہارے گھر کو آگ لگا دیں گے۔
 گھبراہٹ میں انہیں چلنے پھرنے میں تھکاؤں میں تھا، وہاں میں نے کئی ایک دیکھے۔
 ”ایک رات گاؤں کے قریب گھوڑے دوڑنے کی آوازیں آئی دوس کئی دوس
 نہیں ہو کر آوازیں دہراتے آئی ہوں اور قریب سے گزر کر جی گئی ہوں، ایک
 آوازیں انہیں اور خاموش ہو گئیں۔ یہ بلاشبہ دہراتے گھوڑوں کی آوازیں تھیں۔
 دن کے وقت گزریے کھل کو غلطے تو ڈرے ہوئے اور ڈرتے ہوئے۔ وہاں آ
 گئے۔ انہوں نے کانپتے ہوئے سنا کر جنہیں سے انہیں پہلے غولوں کے رونے
 کی آوازیں سنائی تھیں۔ انہوں نے جا کر دیکھا۔ وہاں کئی نہ تھے۔ رونے کی آوازیں بند ہو گئیں
 تو بھی گونج رہی تھی آواز آئی۔ یوں گاؤں کا ہوا تھا ہے۔ پھاڑ پھٹ جائیں گے جنہیں کو لگا
 ٹھک جائے گی۔ اپنے دیوتاؤں کو ملامت نہ کرو۔“

”میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ وہاں نہیں۔ دیوتاؤں کا کوئی وجود نہیں۔ وہ صرف
 اللہ کو یاد کریں، اگر ان کی تسکین نہیں ہوئی۔ وہ چاروں طرف دھڑلے گاؤں کے چنڈ ایک
 آدمی خوف سے بڑی طرح کانپتے ہوئے ہمارے گاؤں میں آئے۔ انہوں نے بتایا کہ
 ان کے گاؤں کے قریب ایک پہاڑ پھٹ گیا ہے اور اس میں سے کبھی کبھی شعلے نکلتے
 ہیں اور کبھی کبھی پہاڑ گر رہا ہے جہاں سے پہاڑ پھٹا ہے وہاں سے طرب و خرابی
 شکوں کے انسان نظر آتے ہیں۔“

ان کی بائیس میں کر میرے گاؤں کے لوگ اس قدر دہشت زدہ ہو گئے کہ
 گاؤں سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگے۔ میں نے انہیں روکا اور بہت کچھ مانا کر دیا
 خوف سے مرنے لگے۔ میں یہ سمجھا کہ یہ ہندو پنڈتوں کی کارستانی ہے۔ وہ لوگوں کو ڈرا

”کیا ہوا؟۔ سادگ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ کیا ہندوؤں نے
 ہمارے آدمیوں کو قید میں ڈال دیا ہے؟ آپ لوگوں کو تبلیغ سے روک دیا ہے؟
 سلطان کے احکام کی بجائے آدمی سے آپ کو کبھی نے روکا ہے؟
 ”نہیں۔“ امام نے کہا۔ میں اس سپاہی کو ساتھ لایا ہوں۔ یہ سنی شاہ ہے۔
 میں بھی سپاہی ہوں۔ صرف امام سمجھتے ہیں۔ یہ نہ سمجھتا کہ میں خوف سے بھاگ آیا ہوں۔
 کالجیڈ کوئی کثیر کا جو گریں کا دیں ہے یا اس پر مرنے والوں کا جو انسانوں کو دھوکا
 دینے کے لیے کبھی کبھی انسانوں کے رذیل میں نظر آتی ہے۔ یہ مخلوق جنات جی ہو
 سکتے ہیں اور دلوں خبیث بھی۔“

”معلوم ہے کہ آپ ہندوؤں کی شیعہ بازی کا شکار ہو گئے ہیں۔“ سادگ
 نے کہا۔ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، اسے میں اتنی جلدی تسلیم نہیں کروں گا۔ سلطان
 مجھے ذاتی طور پر منتخب کر کے یہاں بھیجے گئے ہیں۔ انہیں میرے متعلق بتایا گیا تھا کہ
 میں تو بہت سے ڈرنے اور تصورات سے خوش ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔
 آپ ہندوستان میں پیدا ہوئے ہیں اور آپ نے ہندوؤں کے سلسلے میں
 پرورش پالی ہے۔ آپ امام ہیں امام کو حقیقت میں جانا چاہیے۔ آپ قوم کے تلمذ ہیں۔
 ”ہم جو اتنی دھڑلے آئے ہیں۔“ امام نے کہا۔ اور اتنا تیز آئے ہیں کہ
 اور بھوک کا خیال نہیں کیا کیا آپ اس سے اندازہ نہیں کر سکتے کہ سادگ کتنا سنگین ہے؟
 آپ نے میری بات سنی ہے پہلے ہی کیوں کر دیا ہے کہ میں حقیقت میں نہیں ہوں؟
 ”اُس لیے کہ جب آپ وہاں کے واقعات سنانے لگیں تو ان میں بہانہ نہ ہو“
 سادگ نے کہا۔ اب سادگ وہاں کیا ہو رہا ہے؟

”کثیر اس قدر حسین خط ہے کہ لکھاں لگتا ہے۔“ امام نے کہا۔ کبھی شک
 ہوتا ہے کہ یہ انسانوں کا نہیں ہے بلکہ دیوی ہے یا وہاں ان انسانوں کی روحیں
 رہتی ہیں جو زندہ تھیں تو نیک اور پاک تھیں۔“

”روح خدا کی مانند ہوتی ہے۔“ سادگ نے کہا۔ ”انسان ہر جگہ ہے تو
 روح خدا کے پاس مل جاتی ہے۔ کوئی روح زمین پر نہیں رہتی۔ بلکہ وہاں اور خیالوں

رہے ہیں کہ اسلام قبول نہ کریں مگر کچھ واقعات ایسے ہوئے ہیں کہ انہیں عقل سمجھ نہیں سکتی مثلاً پہلی کا چمک کو میں نہیں سمجھ سکتا اگر میں سمجھ لیتی جاؤں تو میں لوگوں کو نہیں سمجھا سکتا۔ پھر ایک واقعہ ایسا عجیبو ہے جو آپ کو یہ بتاتی ہے کہ انہیں کچھ

نہاری چوکی دریا کے کنارے ہے۔ پیاسی نے کہا۔ "بیس ایک رات دو تین عورتوں کے مدنے کی آوازیں سنائی دیں چوکی کا مالدار زیر جلال مجھے اور ایک اور پیاسی کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ ہم آوازوں کی طرف گئے تو آوازیں خاموش ہو گئیں۔ ایک طرف سے دو آدمی گئے۔ زیر جلال نے ان سے پوچھا کہ عورتیں کہاں رو رہی تھیں؟ انہوں نے کہا کہ انہوں نے ایسی کوئی آواز نہیں سنی۔ اسے میں عورتیں پھر رو نے لگیں۔ زیر نے ان آدمیوں سے کہا کہ یہ کس کی عورتیں رو رہی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ انہیں تو کسی کے رو نے کی آواز نہیں سنائی دے رہی۔ بہت حیران ہوئے کہ جو آواز ہم سن رہے تھے، وہ ان کے کانوں میں نہیں پڑ رہی تھی۔۔۔۔۔

"ان آدمیوں نے میں بتایا کہ اس علاقے میں دو جوان لڑکیاں کبھی کبھی نظر آتی ہیں۔ جیسے نظر آتی ہیں اُسے اپنے پاس بلاتی ہیں۔ ان کے قریب جاؤ تو غائب ہو جاتی ہیں۔ وہ کچھ کہنا چاہتی ہیں۔۔۔۔۔ ہم چوکی میں واپس آ گئے۔ دوسرے دن زیر جلال نے مجھے اور ایک اور پیاسی کو ساتھ لیا۔ کہنے لگا کہ وہ رات کے روئے کا راز معلوم کرنا چاہتا ہے۔ وہاں قریب کوئی آبادی نہیں۔ علاقہ بہت خوبصورت ہے۔ ہم دو پہاڑیوں کے درمیان چلے جا رہے تھے۔ اچانک ہمیں۔۔۔۔۔ پانی کی آواز آئی اور دو لڑکیاں کھڑی نظر آئیں۔ ان کے کندھوں۔۔۔۔۔ سپاؤں تک آسمانی رنگ تھے اتنا بارک کڑا پانی ادا تھا جس میں سے ان کے جسم نظر آرہے تھے۔ ان کے ہاتھ کھینچے ہوئے تھے۔۔۔۔۔ وہ کچھ کہتی تھیں۔ ہمیں ہمارے تھیں جہاں وہ کھڑی تھیں وہاں بڑی خوبصورت گھاس اور پھولدار جھاڑیاں تھیں۔ بچے بھی گھاس اور جھاڑیاں تھیں چیل کے لیے لیے درختوں کی اتنی بہتات، اتنی کہ وہ نیچے سے اوپر تک ایک دوسرے کے ساتھ

بلے کھڑے تھے اور انہوں نے سورج کی شعاعوں کو روک رکھا تھا لڑکیاں اس صحن بنجر دار کا حصہ معلوم ہوتی تھیں۔ ہم رک گئے۔ وہ وہیں کھڑی رہیں۔ زیر جلال نے کہا کہ وہ آگے جائے گا۔ ہم نے اسے روکا مگر وہ نہ رکا۔ ہم دونوں پیاسی آگے نہ گئے۔ ایک لڑکی نے اٹھتے اٹھتے کہنے کہ زیر جلال کو بلا۔ اتارے روکنے کے بعد وجود نہ بڑھایا۔ جب لڑکیوں کے قریب گیا تو محنت غائب ہو گیا۔

"کیا وہ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا؟" ساروگ نے طنز پر پوچھا۔

"نہیں۔" پیاسی نے جواب دیا۔ "وہ بہت تیزی سے زمین میں دھنس گیا۔ ہم نے اسے غائب ہوتا دیکھ کر جب لڑکیوں کی طرف دیکھا تو وہ وہاں نہیں تھیں۔ ہم دونوں پیاسی وہاں سے بھاگ آئے۔ یہ امام صاحب ہمارے علاقے کے ہیں۔ ہم نے انہیں بتایا۔ یہ پہلے ہی دسے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔"

"مجھے اپنی جان کا اندازہ نہیں تھا یہ خدشہ ہے کہ جن لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا وہ اسلام سے ہٹتے جا رہے ہیں۔" انہوں نے کہا۔ "انہیں یقین ہو گیا ہے کہ انہوں نے چونکا اپنا مذہب چھوڑ دیا ہے اس لیے ان پر قہر نازل ہوا ہے اور آسمانوں کی مخلوق انہیں سزا دینے کے لیے زمین پر اتار آئی ہے۔"

"چونکی میں اپنے پیاسی بھی اس دہم میں مبتلا ہو گئے ہیں کہ سلطان۔ زیر راں کے لوگوں پر اپنا مذہب تسلط کیا ہے اس لیے یہاں مافوق الفطرت واقعات دہرے ہیں۔" پیاسی نے کہا۔ "کمال دار زیر جلال کا یوں زمین میں دھنس جانا ایک ایسا واقعہ ہے کہ جو سننا ہے اس کا رنگ سیلا پڑ جاتا ہے۔ خود اپنے پیاسیوں کے دلوں میں شکوک اور شبہ پیدا ہو گئے ہیں۔"

"کیا تم میں کوئی اتنا دلیر اور جرات مند نہیں تھا جو وہاں جا کر دیکھنا حیاں تسلیم کر لے؟" پیاسی نے کہا۔ "ہاں گڑھا تو نہیں۔" ساروگ نے کہا۔ "ہم مافوق الفطرتوں میں گھاس اور جھاڑیوں کے نیچے چھپے ہوئے گڑھے ہوتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہاں گڑھا کھودا گیا ہو اور لڑکیاں محض شہدہ ہوں۔۔۔۔۔ مگر امام اکبر ایسا ہی کی قوت سے واقف نہیں کیا آپ نہیں جانتے کہ ایمان مضبوط ہو تو کوئی شہدہ کا شیب

کو مسلمان ایمان کہتے ہیں یہی ان کی طاقت ہے۔ آپ ایسے کسی کو بھی اپنے مذہب کا کچھ خیال نہیں۔ آپ کے سامنے اپنا دھرم نہیں بلکہ اپنا آپ اپنا تخت اور اپنا تاج ہے۔

سب خاموش تھے۔ پنڈت نے سب پر نگاہ دوڑائی۔

”ہندوستان ہندوؤں کا دیس ہے، ہندوستان دیویوں اور دیوتاؤں کا دیس ہے۔ یہ اللہ اکبر کا نہیں، ہری کشن اور برہما دیو کا دیس ہے مگر ہلکے مذہب کی جوتہیں ہو رہی ہے، وہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ یہ دھرتی پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ یہ کسی ایک بھی مسلمان کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر آج آپ نے اس دھرتی کی پکار نہ سنی تو ہماری یہ نسل جو جوان ہو رہی ہے مسلمانوں کی غلام ہوگی اور کرشن ہراری کی منسری ہوئے کے لیے خاموش ہو جائے گی۔ اپنی آلے والی نسلوں کو اس قدر سے بچاؤ۔ یاد کرو۔ کہ ہمارے باپ دادا نے قدیم قاسم کا لگایا ہوا اسلام کا یو دا جو درخت بن گیا تھا، کس طرح اکھاڑا تھا۔ اس درخت کی جڑیں چند گہمت اور اشوک کے اس دیس کی دھرتی میں دُور دیکھ کر کھیل گئی تھیں۔ ہمارے ہندوؤں اور یریشوں نے دھرم کی گنگں دل میں لکھ کر یہ جڑیں اکھاڑ پھینکی تھیں۔ انہوں نے اذانیں خاموش کر دی تھیں۔۔۔۔۔“

”جس پاپ کی آپ سب کو سزا مل رہی ہے وہ یہ ہے کہ آپ نے اس جنگ کو اپنے راج پات کی جنگ سمجھ لیا ہے۔ اپنے خیال بل ڈالو۔ یہ دو مذہبوں کی جنگ ہے اور جو مذہب جیت رہا ہے وہ اسلام ہے۔ اسلام پھیل رہا ہے۔ شکست مدارج عظیم پال نڈر کو نہیں جوتی، ہندو مت کو جوتی ہے۔ کالج کے اتنے وسیع علاقے کے لوگوں کو ڈرا کر مسلمان بنالیا گیا ہے اور دلوں کو دیویوں اور اماصول کی ایک فوج بھیج دی گئی ہے۔ اگر وہاں اسلام لوگوں کے دلوں میں اتر گیا تو آپ کبھی بھی اسلام کو اس دیس سے نہیں نکال سکیں گے۔“

”ہمارے لیے یہ باتیں سن نہیں۔۔۔ مدارج عظیم پال نڈر نے کہا۔“ اب سوچنا یہ ہے کہ کالج کے علاقے میں جس طرح اسلام کا بیج بریا جا رہا ہے، اس کا کیا علاج کیا جائے۔

سے بہت سے ایسے مسلمان کہ جو تبلیغ اور امامت کر سکتے تھے، بلا کر علاقے میں پھیلا دیا گیا تھا۔ بعض جگہوں پر مسجدیں تعمیر ہوئی شروع ہوئی تھیں اور بیشتر گائوں میں کمرہ کا ایک ایک جھونپڑہ کھڑا کر کے اسے مسجد بنالیا گیا تھا۔

اس نفلے کے رہنے والوں کا مذہب دی تھا جو ان کے ہمارے کا تھا۔ ان کا مذہب پیٹ سے تعلق رکھتا تھا یا اپنی جان سے۔ اب انہوں نے مسلمان فوج کو فائر دیکھا تو اس کا مذہب اختیار کر لیا۔ سلطان محمود اسلام گان کی رتوں میں آکر ویسے کا استہاک کر گیا تھا مگر ہندوستان کے راجوں و ملہانوں کے لیے یہ بہت بڑی شکست تھی۔ بھیم پال نڈر کا لہجہ یاوہ کوٹ کے قلعے میں پناہ لینے کی بجائے کشمیر کی کسی دُور دراز وادی میں چھپا رہا۔ جب اُسے بتایا گیا کہ سلطان محمود واپس چلا گیا ہے تو وہ کسی دیر لڑا رستے سے لاہور پہنچ گیا۔

بہت دنوں بعد لاہور میں دوسری ریاستوں کے راجے ہمارے جمع ہو گئے۔ اس اجتماع میں بڑے بڑے مسندوں کے پنڈت بھی شریک تھے اور ایک بار پھر کورنٹس اور منصوبے پیش ہو رہے تھے کہ اسلام کے سیلاب کو کس طرح روکا جائے۔ پنڈت حبیب موصول فوج حکام کو ملن طعن کر رہے تھے بعض نے سلطان محمود کو قتل کرنے پر زور دیا۔ دہلی کی ایک آواز یہ بھی سنائی دی کہ سلطان محمود کو اب دیر اسے سندھ کے پار اپنا دار سے بھی نڈر روکا جائے اور اس کی فوج کو پہاڑیوں کے اندر گھیر کر بھوکا اور پیاسا مار دیا جائے، مگر اس اجتماع میں کسی بھی تجویز پر اتفاق نہیں ہو رہا تھا۔

”آپ سب میں اتفاق اور اتحاد صرف اس لیے پیدا نہیں ہو رہا کہ آپ کو اپنے اپنے راج کا کھر ہے۔“ بڑے پنڈت نے کہا۔ ”آپ سب مسلمانوں سے ڈر گئے ہیں۔ بعد میں مسلمانوں کی فوج ہمیشہ تھوڑی ہوتی ہے اور وہ اتنی دور سے آکر لڑتی ہے۔ یہاں کا پورے اس فوج کا دشمن ہے۔ یہاں کی زمین اس فوج کی دشمن ہے مگر فتح ہر بار مسلمانوں کی ہوتی ہے۔ خاص کر کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیا محمود دیو ہے، جن نے، بھوت ہے،۔۔۔ وہ آپ کی طرح کا انسان ہے لیکن وہ آپ سب پر اس لیے غالب آگیا ہے کہ اس کا مذہب جو کچھ بھی ہے وہ اپنے مذہب کا شیلٹی ہے۔ اسی

کسی کی گزشتی ہے۔ پیارا اور محبت کا بیٹھام خواہ جھوٹا ہی ہو۔ انسان اسے فوراً قبول کرتا ہے۔ سلطان کو زبردستی میں لپیٹ کر دود اور ان لوگوں کے دہسوں میں ایسے توہمات ڈال دو جو ان پر خوف طاری کریں۔ انہیں پھیلاؤ، جھوٹ پھیلاؤ۔ اسلام پھیلاؤ۔ دے دے اور اسلام قبول کرنے والے آپ کے جال میں آجائیں گے۔ یہ ایسی تکریر تھی جو سب کو پسند آگئی اور سب نے اس پر اتفاق کیا۔

۴۴۔ اہل آخری سہ ماہی میں آج کے جنوبی کشمیر میں ایسے واقعات رونما ہونے لگے تھے کہ وہاں توہمات اور خوف کی حکمرانی تھی۔ جن گاؤں میں کوئی مافوق الفطرت واقعہ نہیں ہوا تھا وہاں دوسری جگہوں سے افواہیں پہنچ جاتی تھیں۔ ان کے مطابق ہمارا ملک لگتے تھے۔ آسمان صاف ہوتا تھا تو بجلی بجتی تھی۔ بڑی خوبصورت چتریں مسافروں کے رستے روکتی تھیں۔ لوگ سن کر ہی ڈر جاتے تھے اور یہ ڈر اس وقت دہشت بن جاتا تھا جب کوئی اجنبی خوف سے کانپتے ہوئے انہیں نشانہ بناتا تھا کہ غریب کے سلطان لوگوں کے پلوں کو زنج کر کے کھاتے ہیں۔

سلطان محمود کی فوج کی ایک چوکی کا کماندار زیر جلالی زمین میں دھنس گیا تھا۔ یہ حادثہ بڑا سنگین تھا۔ اس کی اطلاع ساروگ تک پہنچنا ضروری تھا تاہم چوکیاں جو کالنجہر میں قائم کی گئی تھیں، ان کا کماندار ساروگ تھا جس کا ہیڈ کوارٹر تھرہ جہر گان کے مقام پر تھا۔ اُسے اہم اور پاسی نے اگر اطلاع دی تو وہ کالنجہر کو روانہ ہو گیا۔ اس کے تعلقے میں اُس کے چند ایک محافظ تھے۔ تاہم گھوڑوں پر سوار تھا اور ان کا سامان خچروں اور ٹٹوں پر لدا ہوا تھا۔ اُن سے کچھ دُور دُور دگھوڑ سوار جا رہے تھے جو لباس اور حال چلے سے غریب اور بے ضرر مسافر لگتے تھے۔ وہ ساروگ کے تعلقے کو دیکھ کر آگے نکل گئے۔ اہم اور پاسی جب کشمیر سے آ رہے تھے تو وہ دیکھ نہیں سکتے تھے کہ کسی دونوں گھوڑ سوار اسی طرح اُن سے کچھ دُور دُور چلے آ رہے تھے۔ جب اہم اور پاسی بالنا تھے میں داخل ہوئے تو گھوڑ سوار کہیں چلے گئے تھے۔ اب ساروگ اہم اور پاسی کے ساتھ روانہ ہوا تو وہ سوار اُن سے دُور دُور چلے جا رہے تھے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے محمود سے شکست کھائی ہے اور کالنجہر کی فوج بھی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکی۔ مجھے تمام دماراجوں کی مدد کی ضرورت ہے۔ ہمیں ایک فیصلہ کن جنگ لڑنی ہے۔

”آپ نے اپنی شکست تسلیم کر لی ہے تو یہ بھی تسلیم کریں کہ آپ آئندہ بھی شکست کھا سکتے ہیں۔“ پندت نے کہا۔ تیاری میں وقت لگے گا اگر یہ جنگ فیصلہ کن نہ ہوئی تو جنگ کے لیے تیاری میں مزید وقت ضائع ہو گا۔ فوری ضرورت یہ ہے کہ کالنجہر جس طرح تمام تر آبادی کو مسلمان بنایا گیا اور اسلام کو ان کے دلوں میں اتارنے کا جو اہتمام کیا گیا ہے اس کا توڑ سوچا جائے۔

”آپ وہاں اپنے مذہب کا پرچار نہیں کر سکتے۔“ کالنجہر کے راجہ سندھ رائے نے کہا۔ ”سلطان محمود وہاں اپنی چوکیاں قائم کر کے کچھ فوج وہاں چھوڑ گیا ہے۔ یہ فوج گشت پر رہتی ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس فوج کو سلطان محمود یہ اختیار دے گیا ہے کہ جو کھلی بندہ موت کا پرچہ لکھے اُسے وہیں قتل کر دو۔ وہاں اگر ہندو مت رہ گیا ہے تو وہ میرے قلعے میں ہے۔ باہر اسلام کی باتیں اور چرچے ہیں اور جن مولویوں اور لائبرل کا ذکر آپ نے کیا ہے انہیں اپنی فوج کا تحفظ حاصل ہے۔“

”ہر کام تھوڑے سے نہیں کیا جاسکتا۔“ بھیم پال نذر کے وزیر نے کہا۔ ”شہدے دکھاؤ۔ اگر ان لوگوں کو اسلام قبول کرنے کا حکم دیا گیا ہے تو حکم چلائے بغیر انہیں ہم اسلام سے متنفر کر سکتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک پیدا کر سکتے ہیں۔ کہاں ہیں اس فن کے اُستاد؟... انہیں استعمال کرو۔ کالنجہر کے جنگل، پہاڑ اور دیہات اس کام کے لیے موزوں ہیں۔ وہاں کے لوگوں کو ڈراؤنے فریب دو اور جو بصورت چکے بھی۔ محمود اپنی فوج کی جو تھوڑی سی فہری چھوڑ گیا ہے، اس پر خوف بھی طاری کرو اور انہیں حسین جال میں بھی پھانس کر پکڑ کر دو۔ ان میں سے کچھ آدمیوں کو اپنے ہاتھ میں لو۔ اس دران جکی تیلاری کرتے رہو۔ اگر ہم نے وہاں اپنی درپردہ کارروائیاں کر لیں تو وہ علاقہ مسلمانوں کا گڑھ بن جائے گا اور ہمارے لیے بہت بڑا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔“

”انسان کی کمزوریوں کو استعمال کر دو۔“ بڑے پندت نے کہا۔ ”پیارا اور خوف ہر

دونوں دماغ سے غائب ہو گئے۔

”آج کا دن تو یہ اپنے گھوڑے شوگر تے رہیں گے۔“ ایک نے کہا۔ ”اُسکے چلو۔ یہ واپس نہیں جائیں گے۔“ ہو سکتا ہے واپس چلے جائیں۔ دوسرے نے کہا۔ ”ان پر نظر رکھو۔“

دن کا بچلا ہوا تھا جب ساروگ کا قافلہ اس حال میں کالجنگر کی طرف چلا جا رہا تھا کہ نصف قافلہ پیدل تھا اور سامان والے صرف دو ٹو ساتھ تھے۔ انہوں نے بڑی خصل سے ان دو چار گھوڑوں اور دو ٹوؤں کو پکڑا تھا۔ ساروگ عزم کا پکا تھا۔ میدان جنگ کا وحشی تھا۔ کسی دشواری اور کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ اُس نے قافلے سے کہا کہ جو پیدل چلتے تھک جائے وہ گھوڑے پر سوار ہو جائے۔ میں خود پیدل چلوں گا۔ ہندوستان کے ناگ ہمارا رستہ نہیں روک سکتے۔

اب راستہ پہاڑیوں کے اندر سے گزرتا تھا۔ ایک طرف پہاڑ اور دوسری طرف دُریچے کوگی ہوئی دھلان تھی۔ گھوڑے گھوڑے فاصلے پر راستہ مٹا تھا۔ کبھی دو پیدل کے درمیان چلا جاتا تھا۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے، سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوائیں رخ ہوتی جا رہی تھیں۔ اگر ان کے پاس کھانے پینے کا سامان نہیں تھا تو بھی بھوک اور پیاس سے مرنے کا کوئی خطرہ نہیں تھا۔۔۔۔۔ دماغ یا ان کی ہمت تھی اور پھلدار درخت بھی تھے۔ بچے کچھ گھوڑوں کے لیے گھاس ہی گھاس تھی۔

قافلے نے رات چنانوں اور ٹیلوں میں گھولیں گزاری۔ گھوڑے باہر بندھے رہے۔ رات کی گھاس کے لیے گھوڑوں پر زمینیں ڈالی گئیں اور قافلہ روانہ ہو گیا۔ ساروگ خود پیدل چلے لگا۔ اُس نے امام کو ایک گھوڑے پر سوار کر دیا چونکہ وہ خود پیدل چل رہا تھا اس لیے اُس کے ساتھ بھی پیدل چلے گئے۔ اور اچانک امام کا گھوڑا اڑ کر تھر تھر کانپنے لگا۔ گھوڑوں کی کیفیت کو یہی سمجھ سکتے ہیں جن کی زمین گھوڑوں کے ساتھ گزری ہو ساروگ نے گھر کر کہا۔ ”گھوڑے سے گود آؤ۔“ اور امام گھوڑے سے کود آیا بھاگتا خوف

ساروگ کوگی گا سیکس ضرورت نہیں تھی۔ امام اور سپاہی رستے سے واقف تھے۔ وہ مسافت کی عام رفتار سے تیز چلے جا رہے تھے۔ ان کے نیچے سے اپنی نئی زمین بھرتے کھڈے نالے اٹھائیاں اور نیلے پتے جا رہے تھے۔ انہیں کثیر کے پہاڑوں کی برف پوش اسپیڈ سیدھیان نظر آ رہی تھیں۔ امام ساروگ کو بتا رہا تھا کہ ان چوٹیوں کے دامن میں جھپٹ ہے وہ کس قدر زمین ہے اور دماغ کے لوگوں کا اُس لحظے زیادہ دلکش ہے۔

سفر کی پہلی رات چنانوں اور ٹیلوں کے علاقے میں آئی۔ قافلہ رات بھر کے لیے رک گیا۔ موسم سرد تھا۔ تباغہ جب منزل کو روانہ ہونے لگا تو ایک گھوڑا بڑی زور سے ہنپنا مارا۔ بے لگام ہو کر دوڑ پڑا۔ یہ ایک ہی لفظ کا گھوڑا تھا۔ ابھی سوار اس کی پیٹ پر نہیں بیٹھا تھا۔ جھپٹ نے چلا کر کہا۔ ”سانپ۔۔۔۔۔ ناگ۔۔۔۔۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور گھوڑا دوڑ کر دوڑ پڑا۔ گھوڑے اور ٹو چلے کو تیار تھے اس لیے کھلے ہوتے تھے۔ دو گھوڑوں کی غور زہ آدھیں ٹک کر تمام گھوڑے، خچر اور ٹو دوڑ کر بھاگ اُٹھے۔ کسی پر کوئی سوار نہیں تھا۔

سب نے دیکھا کہ ایک ڈیرہ گز لبا سانپ رنگ رہا تھا۔ وہ علاقہ سرسبز تھا۔ گھاس اپنی بھی تھی اور چھوٹی چھوٹی بھی خود رو پودے تھے اور درخت بھی۔ دماغ چنانیں اور نیلے تھے خچر اور ٹو سامان سمیت بھاگ گئے تھے۔ کسی گھاس کو مارنے کا ہوش نہ رہا۔ اصل مسئلہ گھوڑوں کو پکڑنے کا تھا۔ علاقہ ایسا تھا کہ یہی نہیں چلتا تھا کہ جانور کدھر نکل گئے ہیں۔ سب ان کے پیچھے دوڑ پڑے۔ سانپ سے ڈرے ہوئے جانور کو پکڑنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

وہ سب چنانوں اور ٹیلوں میں غائب ہو گئے تو ایک چنان کی اوٹ سے دھکی سامنے آئے۔ سانپ آہستہ آہستہ رنگ رہا تھا۔ ان میں سے ایک آدمی نے سانپ کو گردن سے پکڑا اور پرے لے جا کر اپنے گھوڑے کی زین کے ساتھ بندھے ہوئے تھیلے میں ڈال کر تھیلے کا منہ بند کر دیا۔ وہاں ایک اور گھوڑا کھڑا تھا۔ وہ آدمی ایک گھوڑے پر سوار ہوا اور دوسرے کی لگام پکڑ کر ابھر گیا۔ اُس کا سامنے گھوڑے پر سوار ہوا اور

سواران کے قریب آکر رک گئے۔ وہ کوڈر گھوڑوں سے اترے اور شرک کے کنارے گھٹنے نیچ کر اور ہاتھ جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ساروگ ان کے قریب جا رہا۔ ان دونوں نے سر جھکالیے۔ ساروگ نے امام سے کہا کہ آپ ان کی زبان جانتے ہیں۔ انہیں اٹھاؤ اور ان سے راستہ پوچھو۔

امام نے انہیں اٹھنے کو کہا۔ وہ اٹھے اور ایک نے ہاتھ جوڑے ہوئے ہوں بھکاریوں کے لیے میں کہا۔ ہم آپ کے غلام ہیں۔ آپ مسلمان ہیں ہم نے آپ کا مذہب قبول کر لیا ہے۔

امام نے انہیں اپنی منزل بتا کر پوچھا۔ کیا ہم ٹھیک راستے پر جا رہے ہیں؟

”ہیں۔ ایک نے کہا۔ ہم آپ کو بہت دُور سے دیکھ کر آئے ہیں ہم حیران ہیں کہ آپ اس علاقے سے زندہ کس طرح نکل آئے ہیں۔ اسے ہم موت کی وادی کہا کرتے ہیں۔ اس علاقے میں تو شیر بھی نہیں آتا۔ یہ سانپوں کا علاقہ ہے۔ آپ بدھ جا رہے ہیں۔ ادھر بردخت کے ساتھ ایک سانپ لیٹا ہوا نظر آتا گا۔ آپ یہ راستہ چھوڑ دیں۔“ اور وہ راستہ بتانے لگا، پھر بولا۔ ”مگر آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔ تین چار سونے زرا آپ بھول جائیں گے کہ کدھر جا رہے ہیں۔ ہم دونوں آپ کے ساتھ چلے گئے۔“

امام نے ساروگ کو بتایا تو ساروگ نے کہا کہ انہیں ساتھ لے چلو۔ ہم انہیں اجرت دیں گے۔

دونوں سوار اس پیدل قافلے کے گائیڈ بن گئے۔ راستے میں ساروگ نے امام کی معرفت ان آدمیوں سے پوچھا کہ وہ ان عجیب و غریب واقعات سے واقف ہیں جو کالانجر کے علاقے میں رونما ہو رہے ہیں؟

”ہم ادھر سے ہی بھاگ کر آئے ہیں۔ ایک آدمی نے جواب دیا۔ ہم اپنے بال بچوں کو ادھر لے آئے ہیں۔“

”کیا تم نے سانپوں سے الگ نکلتی دیکھی ہے؟“

”بہت دُور پہنچے تھے۔“ اسی آدمی نے جواب دیا۔ ہم نے فوراً ہی

سے ہٹنا کر بھاگ اٹھا۔ اس کے ساتھ ہی دوسرے گھوڑے بھی بے قابو ہو کر ہٹنے لگے۔

”سانپ۔ سانپ۔“ کسی نے چلا چلا کر کہا۔

اب ایک کی بجائے دو سانپ تھے۔ دونوں ایک ہی رنگ کے اور ایک ہی لمبائی کے تھے۔ گھوڑے لگا میں چھڑا کر ادھر ادھر بھاگ اٹھے تھے اس لیے سب انہیں پکڑنے کو دوڑے، سانپوں کو مارنے کا کسی کو ہوش نہ رہا۔ دو گھوڑے ڈھلان سے پھسل کر زحک گئے۔ بچے دیلے جلم بھا چلا جاتا تھا۔ ساروگ کے محافظ دور اُدھر کھڑے گھوڑوں کو دیر میں بتا دیتے رہے۔

قافلے کے تمام آدمی جب ہری بھری چٹانوں میں گھری ہوئی اس جگہ سے جانا، صبحی نے رات گزار لی تھی، پلے گئے تو وہی دو آدمی سامنے آئے جو چھپ چھپ کر قافلے کے ساتھ ساتھ چلے جا رہے تھے۔ سانپوں کو پکڑ لیا اور تھیلے میں ڈال کر تھپلا ایک گھوڑے کی زین کے ساتھ باندھ دیا۔

ساروگ کے آدمیوں نے ایک دوسرے اور ایک ٹوکڑ لیا اور منزل کو روانہ ہو گئے۔

”ایسا ہونیس سکتا۔“ امام نے ساروگ سے کہا۔ یہ علاقہ سانپوں کا نہیں۔ اگر یہاں سانپ ہیں بھی تو اہل ہر نہیں نکلتے کیونکہ سردی ان کے لیے قابل برداشت نہیں۔ میں اس پانی کے ساتھ اسی راستے گزرا تھا۔ رات کو اس جگہ قیام کیا تھا۔ یہاں کوئی سانپ نہ نہیں آیا تھا۔

”پھر سوچو۔“ ساروگ نے کہا۔ ”آپ راستہ بھول گئے ہیں۔ کوئی آبادی دیکھتے ہیں۔ اس علاقے میں راستے سے بھٹک جانا کئی بات نہیں۔“

ساروگ کا حوصلہ ابھی تک قائم تھا۔ وہ قافلے کو پیدل سے جا رہا تھا۔ سب کو حوصلہ دے رہا تھا اور وہ اس وہم میں مبتلا ہو گیا تھا کہ امام اسے غلط راستے پر لے جا رہے ہیں۔ چلتے گئے اور شام سے ذرا پہلے انہیں ایک موڑ پر تھے ہی دو گھوڑے سوار آتے نظر آئے۔

اس چیلن پر پڑی۔ اہم اتفاق سے باہر کھڑا تھا۔ اسے اس روشنی میں جو بہت تیز نہیں تھم
سکتی تھی، یہ رنگیناں نظر آئیں۔ روشنی بگھگنی۔ ذرا دیر بعد پھر وہ اس جد پڑی تو دہاں
کچھ بھی نہ تھا۔

اہم نے احکام کے مطابق قرعہ چوکی میں جا کر کمانڈر انو میر کو بتایا تھا کہ رات اس
نے کیا کیا ہے۔ اس نے انو میر کو یہ بھی بتلایا تھا کہ گاؤں کے لوگ اس کے پیچھے پڑے
ہوئے ہیں کہ اگر اسلام خدا کا مذہب ہے تو امام انہیں اس کا معجزہ دکھائے۔
گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ انہیں اپنا مذہب تبدیل کرنے کی سزا مل رہی ہے اور
بہت بڑی آفت آرہی ہے۔

انو میر گاؤں میں گیا۔ اس نے لوگوں کا خوف مٹانے کی کوشش لیکن وہ خود چکرایا
ہوا تھا۔ وہ عالم فاضل نہیں تھا۔ علی اللہ نہیں تھا بغیر نہیں تھا۔ اس کے پاس
کوئی ٹھوس دلیل نہیں تھی جس کے زور پر وہ دے۔ بے لوگوں کو قائل کرتا۔ اس
کے پاس ایک ہی دلیل تھی جو اس نے ان افغانوں دی۔ اگر کسی نے اسلام کے
خلاف بات کی تو اس کی گردن اڑا دی جائے گی۔

وہ امام کے ساتھ مسجد میں چلا گیا اور امام سے کہا: ”میں فوجی ہوں۔ آپ امام ہیں
عالم ہیں۔ کیا آپ کا علم یہ نہیں بتا سکتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں کو کچھ بتائیں، ورنہ
مسلمان پابندی بھی اسلام سے دستبردار ہو جائیں گے۔ میں ہاتھوں سے لاسکتا ہوں اور
راہوں میں نے قلعوں کی دیواریں پھلانگی ہیں مگر مذہب کے معاملے میں اُجڑا ہوا بڑا
ہی کمزور انسان ہوں۔ مجھے یہاں اس لیے رکھا گیا ہے کہ اسلام کی پابندی اور آپ
کی حفاظت کروں۔ سلطان کا حکم ہے کہ لوگوں کے دلوں پر قبضہ نہ کر سکیں ایسے واقعات
ہو رہے ہیں کہ لوگوں کے دل شکوک اور خوف سے بھر گئے ہیں۔ مجھے کچھ بتائیں کہیں
ایسا نہ ہو کہ میں بھی گمراہ ہو جاؤں۔“

امام کے پاس کوئی دلیل نہیں تھی۔ انو میر دہاں کے لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر
واپس آگیا۔ وہ پریشان اور مضطرب تھا۔ اُسے گاؤں کے لوگوں کی یہ آوازیں جیسے تھان
میں بھر رہی تھیں۔ اگر اسلام اپنا مذہب ہے تو اس کا معجزہ دکھائے۔

دیکھی تھی۔ ایسے لگتا تھا جیسے اُدھر سے آسمان جل رہا ہو۔ راتوں کو سنبلی لگتی دیکھی ہے
... اور آوازیں آتی ہیں کہ اپنا مذہب چھوڑ دو۔

”تم نے بھی اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کیا ہے؟“

”ہاں!۔“ اس نے کہا۔ ”تم اسلام کو اپنا مذہب کہتے ہیں اس لیے اُدھر سے بھاگ
آئے ہیں۔ ہم آپ کا مذہب نہیں چھوڑیں گے۔“

دونوں باری باری سارے کو وہ واقعات سناتے رہے جو امام اور پابندی نے سارے
کے پاس آکر اُسے سنائے تھے۔ دو تو آدمی دُور سے جوتے تھے اور امام انہیں تسلی دے
رہا تھا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ آدمی غلاموں کے انداز سے آگے آگے
پلے جا رہے تھے۔

دیو کوٹ جنوبی کشمیر میں ایک گاؤں ہوا کرتا تھا جو دیوہ اور اوجیل کی لکڑی کسبے
ہوئے جس کی کپیس گھروں سے مل کر بنا تھا۔ اس کی ساری آبادی ہندو تھی اور دہاں
لکڑی کا مندر بھی تھا۔ اس سے تھوڑی دُور غزنی کی فوج کی ایک چوکی تھی جس میں تیس کے
لگ بھگ سپاہی رہتے تھے اور ان کا ایک کمانڈر انو میر تھا جو سلطان کے علاقے کا رہنے والا
تھا کسی وقت وہ قراصلی ہوا کرتا تھا۔ سلطان محمود نے سلطان کو فتح کر کے قراصلیوں کی
اصلاحیت بے نقاب کر دی تو قراصلیوں نے اسے قید کر لیا۔ ان میں انو میر بھی تھا۔
ایک دفعہ وہ دو سپاہیوں کے ساتھ روزمرہ گشت پر گاؤں میں گیا۔ سلطان محمود کے
حکم سے دہاں سے مندر بھاگ کر مسجد بنادی گئی تھی اور دہاں ایک امام بھی مقرر کر دیا گیا
تھا جو دہاں کے لوگوں کو اسلام کے سبق دیتا اور انہیں اسلامی حکومت سکھا رہا تھا۔
اس گاؤں کے لوگ بھی دہشت زدہ تھے۔ انہوں نے قریب کی سپاہی پر پھل چکائی اور
اس کی روشنی گاؤں پر پڑتی دیکھی تھی۔ امام نے ایک رات باہر جا کر ایسی ہی روشنی میں
تین رنگیناں بالکل برہنہ دیکھیں۔ جو بہت تیز تھیں جس سے ان کے بال اڑاؤ کر
ان کے چہروں کو ڈھانپ رہے تھے۔ وہ چٹان کی ٹھکان پر چیل کے پڑوں کے
درمیان کھڑی تھیں۔ رات تاریک تھی۔ سامنے والے سپاہی پر چمک بتوی اس کی روشنی

ایک دوسری پرانی کے جھپٹے پھینک رہی تھیں۔ کمر کے اوپر سے وہ برسہا برس اس سے نیچے ہر لڑکی نے باریک سا کپڑا باندھ رکھا تھا۔

ازمیر لڑکیوں کے حسن پر حیران نہ ہوا کیونکہ خدا نے اس خطے کو نسوانی حسن سے نوازا تھا۔ حیران وہ اس پر ہٹا کے قریب کوئی آبادی نہیں تھی اور یہاں کوئی عورت خانہ یا کپڑے دھونے کے لیے نہیں آئی تھی۔ یہ لڑکیاں دیہاتی بھی معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ اُسے شک ہونے لگا کہ یہ دی لڑکیاں جس جن کے متعلق مشہور ہے کہ چٹائیں یا بدھیں ہیں اور وہ کہیں کہیں آبادیوں سے دور نظر آتی ہیں۔

وہ انہیں رجوت ہو کر دیکھ ہی رہا تھا کہ ایک لڑکی نے ایک طرف دیکھتے ہوئے بڑی دوز سے چیخ ماری اور دوڑ پڑی۔ ایک اور لڑکی اُس کے پیچھے مددی تیسری جو مذی کے کنارے پر بیٹھی ہوئی تھی، اُنھی اور جب وہ لے لگی تو پانی میں گر پڑی۔ پانی گہرا نہیں تھا گھٹنوں سے بھی نیچے تھا۔ ازمیر درختوں سے آگے ہو گیا۔ تب اُس نے ایک بہت بڑا ریکہ دیکھا جو مذی میں بڑا تھا اور بڑے غصے سے غرار تھا۔ لڑکی اُٹھ لی لیکن دیکھ کر اتنی قریب دیکھ کر اُس پر اتنی دہشت طاری ہو گئی تھی کہ وہ پھر گر پڑی۔ ریکہ اُسے پکڑنے کے لیے مذی میں اتر گیا۔

ازمیر فوراً سمجھ گیا کہ یہ لڑکیاں انسان ہیں، چٹائیں، یا بدھیں نہیں۔ اُس نے کلام کو جھٹکا دے کر اتر لگائی۔ گھوڑا تیزی سے آگے بڑھا۔ ازمیر نے برجھ کر چٹائیں کو دایس ہاتھ میں تول کر پوری طاقت سے برجھی بھینکی۔ برجھی ترک طرح گئی۔ ریکہ پانی میں اچھلتا کودتا لڑکی تک پہنچ گیا لیکن اتنی ہوئی برجھی اُس کے پیویں اتر گئی۔ ریکہ بڑی دوز سے غرار اور پانی میں گرلا۔ وہ پھر اٹھا اور ایک جگہ گھومتے لگا آخر گر پڑا۔

ازمیر گھوڑے سے اتر اور دھڑکندی سے لڑکی کو اٹھالیا۔ ریکہ پانی میں آہستہ آہستہ ٹوٹ رہا تھا۔ لڑکی بے ہوش ہو گئی تھی لباس کے ساتھ کی لڑکیاں جانے کہاں بھاگ گئی تھیں۔ ازمیر نے لڑکی کو گھوڑے کی پیٹھ پر ڈالا۔ کنارے پر پڑے ہوئے لڑکی کے کپڑے اٹھائے اور اُس پر ڈال دیئے اور واپس چوکی کی طرف چل پڑا۔ وہ لڑکی کو پھلانے کی کوشش کر رہا

اُس کی چوکی ایک پہاڑی کی ڈھلان پر تھی۔ یہ بھی ٹہری کا ایک دوسرا مکان تھا۔ رات کو ازمیر مالائی منزل کی کھڑکی کھولے باہر دیکھ رہا تھا۔ رات اندھیری تھی اور سرد بھی تھی۔ اُسے باہر کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ کشمیر کے پڑاؤ دھل کی دھبہ اُسے مسخ کر رہی تھی۔ وہ اسلام کا شیعہ تھا گھوڑیاں آکر اسلام کرے اسٹان میں پڑ گیا تھا۔ ازمیر کو یقین تھا اور یہ اُس کا ایمان تھا کہ ہندوؤں کا مذہب باطل ہے اور بت پرستی کفر ہے مگر اُس کے لیے ثابت کرنا محال ہو گیا تھا کہ اُس کا مذہب برحق ہے۔

اُسے دوسری پہاڑی چوٹی پر یا ڈھلان پر روشنی سی نظر آئی۔ اچھی خاصی چمک تھی۔ یہ روشنی ایک دو بار چمکی اور بجھی۔ ازمیر کے رنگے کپڑے جو گئے۔ وہ سوچنے لگا کہ کبھی گاؤں سے بغیر اُٹھنے کی رات اُن کے گاؤں پر کبھی چمکی یا یہ کہ رات ایک پہاڑی نے شعلے اُگلے تھے۔

کلام ازمیر پریشان ہوا کہ اُمرو ہو گیا اور اُس کے ہاتھ اپنے آپ دھلکے لیے اُٹھے۔ وہ گھوڑا لگا۔ ”خدا نے دو جہلاں! اپنے نام کی لاج کھو۔ اپنے مذہب کی لاج رکھ لو۔ مجھے اپنے نور کی چمک دکھاؤ کہ میں باطل کی ان روشنیوں کا راز پا کر انہیں بجھا سکوں۔“

اگلی صبح اُس کے دل پر سی بوجھ تھا۔ وہ اپنا فرض سمجھتا تھا کیسے مذہب کی عظمت ثابت کرے مگر اُس کے پاس اتنا علم نہیں تھا اور اتنی عقل بھی نہیں تھی جو وہ اور اٹھ آیا تو وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اکیلا ہی باہر نکل گیا۔ وہ لوگوں کے جھوپڑوں میں جا کر اُن کی باتیں سننا چاہتا تھا۔

اُس زمانے میں اس علاقے کا جنگل گھنا تھا اور اس میں دندے بھی دبائے جاتے تھے۔ ریکہ بھی کہیں کہیں نظر آتا تھا۔ ازمیر کے پاس برجھی تھی اور مکان بھی۔ وہ چکر سے کچھ مدد خصل میں چلا گیا۔ آگے ایک مذی تھی۔ اُسے عورتوں کے ہنسنے کی آواز سنائی دیں۔ اُس نے دیتوں کی ادھ میں جا کر دیکھا تو میں جوان لڑکیاں مذی میں نہا رہی تھیں اور

کو کچن سے جانتی ہو۔ وہ از میر کو اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔
 ”میں مسلمان ہوں لڑکی!“۔ از میر نے کہا۔ ”میں اپنے مذہب اور اپنے سلطان
 سے غداری نہیں کروں گا۔ مجھے پتہ نہیں۔“

لڑکی نے کچھ اور داؤ آزمائے۔ آخر اسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی بھتر ہے۔
 ”تم نے میری جان بچائی ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”ادتم ویسے نہیں جیسا میں
 سمجھتی تھی۔ بتلانا حق ہے کہ میں نہیں اپنے راز سے آگاہ کر دوں، پھر میرے ساتھ
 جو بھی سلوک کرنا چاہو کرنا۔ میں ان چیزوں میں سے ایک ہوں جو لوگوں کو جوان اور
 خوبصورت لڑکیوں کے مدد میں نظر آتی ہیں، لیکن میں انسان ہوں۔ سب لڑکیاں انسان
 ہیں۔ ہمارا مستقل ٹھکانہ غلو کالج میں ہے۔ عارضی ٹھکانہ دہلی سے تھوڑی ہی دُور پہاڑ
 پر ہے جہاں سے تم مجھے اٹھا لائے ہو۔ آج رات میں دہلی سے اُس گلابی پرکلی چکانی
 تھی جو اُس پہاڑ کی دوسری طرف ہے۔“

بکل چکانے کا راز کیا ہے؟

”تم ان لوگوں کو پکڑ سکتے ہو۔“ لڑکی نے کہا۔ ”مگر اب مشکل ہو گیا ہے۔ وہ مجھے
 ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میں انہیں زندہ یا مرنے نہیں ملوں گی تو وہ اپنا راز فاش ہونے
 کے خوف سے یہاں سے چلے جائیں گے۔ کیا تم کوئی طریقہ سوچ سکتے ہو؟“

”میں نہیں دیکھ رہی ہوں۔“ لڑکی نے کہا۔ ”از میر نے کہا۔“

”ادتم خود چھپ جانا۔“ لڑکی نے کہا۔ ”وہ تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔ میں انہیں پکڑ لوں گا۔“

”اگر تم نے دھوکا دیا تو یہاں کو کھو دوں گا۔ تم میرے سرک زدن ہو گے۔“

”میں دھوکا نہیں دوں گی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”تم نے میری جان بچائی ہے۔ میں نہیں
 اس کا انعام دوں گی۔“

لڑکی اسی جگہ بیٹھ گئی جہاں لڑکی نے اُس پر چھوڑا تھا۔ کچھ نہیں ہوا۔ لڑکی نے
 اتنا زیادہ نہیں تھا کہ اُسے بہا لے جاتا۔ لڑکی کنا سے کنا سے آگے چلی گئی اور ادھر ادھر

دیکھتی رہی۔ خاصی دیر بعد کسی کے دوسرے کنارے پر وہ آدمی نمودار ہوئے۔ انہوں

تھا اور وہ لڑکی سے یہ بھی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے اور دوسری
 لڑکیاں کون ہیں اور کہاں رہتی ہیں۔

وہ چوکی میں بیٹھا تو اسے لڑکی کی آواز سنائی دی۔ وہ اُسے کوشش کر رہی تھی
 از میر نے اُسے گھوڑے سے اتار لیا۔ وہ ہوش میں آگئی تھی۔ اُس کے چہرے پر غور
 اور زیادہ گہرا ہو گیا۔ پہلے وہ کچھ سے ڈر کر بے ہوش ہوئی تھی، اب از میر کو اور اجنبی
 جگہ کو دیکھ کر اتنی ڈیسی کہ اُس کا سر ہلنے لگا۔ از میر نے ہندوستانی زبان میں بات کی جو
 لڑکی نے سمجھی۔ از میر نے اُسے پکڑے پسینے اور چٹنے کو کہا۔

”تم نے مجھے کچھ سے بچایا ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”اگر میں نہ ہوتا یا میرے پاس یہی نہ ہوتی تو تم زندہ نہ ہوتیں۔“ از میر نے کہا۔
 ”مستعار جسم حیران کن ہوا مذہبی میں سپرد ہوا تھا۔ میں نے کچھ کو مار ڈالا ہے۔ دوست۔
 جہاں کو لگی دہلی پہنچا دوں گا۔“

لڑکی کڑے سین کر اندر چلی گئی۔ از میر اسے الگ کمرے میں لے گیا اور اُسے غور
 سے دیکھا۔ لڑکی اُس کے قصوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔

”میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے؟“ لڑکی نے پوچھا۔

”جس سلوک کا تمہیں ڈر ہے، وہ میں جنگ میں ہی کر سکتا تھا۔ از میر نے کہا۔“

میں نے تمہارے نیچے جسم پر پکڑے ٹکڑے تھے۔ میں تین بڑی نیت سے یہاں نہیں
 آیا۔ اب بتا دو کہاں جاؤ گی۔ میں تمہیں وہاں چھوڑاؤں گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم یہاں کی
 رہنے والی نہیں۔ تمہاری زبان اس خطے کی نہیں۔ تمہاری ذیل دہلی اور تمہارا چہرہ

اس خطے کا نہیں۔ تم کسی غریب کسان یا گندے کے بھی بی بی نہیں۔“

”اگر میں تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہ دوں تو میرے ساتھ کیا سلوک کر دے گی؟“

”پہلے مجھے پتہ چھوڑ دوں گا نہیں۔“ از میر نے کہا۔ ”ایک پاک امانت کی طرح
 بیس رکھوں گا۔“

لڑکی نے پڑی اور اُس نے ایک جڑیسی ادائیگی باتیں شروع کر دیں جیسے میر

میں اپنی چوکی نظر آ رہی تھی اور اس سے دُور وہ کاغذ درختوں میں سے نڈا زرد دکھائی دے رہا تھا جہاں از میر گیا تھا۔ اُسے بتایا گیا کہ پیاز کی جہاں سے عودی ہو جاتی ہے، وہاں کڑیوں کے ڈھیر کو آگ لگائی جائے گی۔ یہ آگ نیچے کے کاغذ والوں کو نظر نہیں آ سکتی۔ اس کے سامنے اور اوپر جہاں وہ کھڑے تھے، ایہ آئینہ رکھا جائے گا۔ آگ پر تیل پھینکتے ہیں جس سے شعلہ اور زیادہ کھڑکے گا اور اوپر کو لکے گا۔ اس کی چمک آئینے پر پڑے گی۔ آئینے کو چوکی اور پھر کاغذ کی سمت کر کے آہستہ آہستہ ایک دُور بلایا جائے گا۔ اس کی چمک دُور نیچے اس طرح پڑے گی جس طرح بجلی چمکتی ہے۔

از میر کے لیے یہ کھانا کئی شخص نہ تھا اسے یہ بتایا گیا کہ اس رات اس کی چوکی اور کاغذ پر چمک مانی تھی۔ اس سے پہلے ہی اور جگہ سے کاغذ پر چمک اسی جا چکی تھی۔ ”یہ عقل کا کھیل ہے۔ ایک آدمی نے کہا۔ رات کو پہاڑی سے آگ کا ٹکس اس چمک دہکتے پر سے لیا جاتا ہے تو دُور نیچے سے دیکھنے والوں کو اس نظر آتا ہے جیسے چمک آسمان کی ہو۔ ان پیازوں کی بلندیوں سے جو لوگ واقف ہیں، رات کو بھی شک نہیں کر سکتے کہ یہ چمک پیاز سے آ رہی ہے۔ اگلے روز ہمارے آدمی گاہوں میں جکر

افوا میں پھیلاتے ہیں، اور لوگوں کے ذہنوں پر یہ غلط بات مسلط کر دیتی ہیں کہ انہوں نے اپنا مذہب چھوڑ کر اسلام قبول کر لیا ہے اس لیے انہیں دیوانوں کے اشارے مل رہے ہیں کہ وہ اپنے مذہب میں واپس آجائیں ورنہ ان پر قہر نازل ہوگا۔۔۔۔۔ جو بصورت برہمنوں کے روپ میں نظر آنے والی چٹائیں سی لڑکیاں ہوتی ہیں۔ یہ اس خطے کی رہنے والی نہیں۔ یہ لاہور اور جٹنہ کے راج محل کی خاص لڑکیاں ہیں۔“

خدا نے از میر کی دُعا قبول کر لی اور اپنے نور کی چمک دکھا دی تھی۔ یہ اسے اب لوگوں کو دکھائی تھی۔ اُس نے ان آدمیوں اور لڑکیوں کو اپنی چوکی میں لے جا کر پیرے میں بٹھا دیا اور ان سے پوچھنے لگا کہ ان کے اور ساتھی کہاں کہاں ہیں۔

سارگ کا قائد ابھی تک دو گائیٹوں کی راہنمائی میں چلا جا رہا تھا۔ امام نے کئی بار گائیٹوں سے کہا کہ اب تک انہیں اپنی منزل پہنچ جانا چاہیے تھا۔ گائیٹوں نے

نے لڑکی کو بلایا۔ لڑکی نے انہیں اشارہ کیا کہ ابھر آ جاؤ۔ وہ دونوں ندی سے گزر کر لڑکی کے پاس آ گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ وہ کہاں رہی ہے۔

اپنی گھاس لہی سے از میر اور چار پیاسی اٹھے۔ از میر کے ہاتھ میں کمان تھی دونوں آدمیوں نے انہیں دیکھا تو وہ گھبرا کر ابھر ابھر دیکھنے لگے کہ از میر کی لٹکار نے انہیں بھاگنے نہ دیا قریب جاکر انہیں گھیر لیا۔

”میں اپنے ٹھکانے پر بے چلو۔“ از میر نے انہیں کہا۔

دونوں نے ٹالنے کی اور کچھ نہ سمجھنے کی اناکاری کی لیکن از میر نے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلیں۔ دونوں نے لڑکی کو بڑا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ ان کا راز اسی نے فاش کیا ہے۔ از میر نے تو راز نکال لی اور انہیں آگے آگے چلنے کو کہا۔ وہ چل پڑے اور گھنے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ذرا آگے جا کر وہ پیاز کی چڑھنے لگے۔ درخت بہت زیادہ تھے۔ پتیلیں زمین پر پھیل ہوئی اور درختوں پر بھی چڑھتی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ ایسی تھی کہ ابھر سے کبھی کسی کا گندہ نہیں جوتا تھا۔

خاصا ابھر گئے تو پیاز کی ابھی چوٹی نہیں آئی تھی۔ وہاں پیاز کی دیوار کی طرح سیڑھی ہو گئی تھی۔ وہاں خشک کڑیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ اس سے ذرا پیرے ایک گھٹ سی بنی ہوئی تھی۔ باہر کی آوازیں سن کر گھٹ میں سے دو لڑکیاں نکلیں۔ از میر نے انہیں ندی میں نہاتے دیکھا تھا۔ وہ فوجیوں کو اپنے آدمیوں کے ساتھ دیکھ کر گھبرا گئیں۔ از میر نے گھٹ میں جا کر دیکھا۔ وہاں پانچ چھنٹ ادنیٰ کاڑی کا ایک تختہ رکھا تھا جو قد آدم آیدہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ آئینے کی طرح شفاف اور بیکار تھا۔

”یہ سب کیا ہے؟“ از میر نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ ایک آدمی نے کہا۔“ ہم تو ایسے ہی یہاں آ گئے ہیں۔“

از میر نے اُس لڑکی کی طرف دیکھا جسے اُس نے بیکچہ سے پھایا تھا۔ یہ لڑکی از میر کی احسان مند تھی۔ اس کے عوض اُس نے از میر کو یہ راز بتانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ اب پردہ ڈالنا بیکار ہے کیونکہ وہ پردہ اٹھا چکی ہے۔

از میر کو وہ ابھرے گئے۔ وہاں سے اُس نے دیکھا۔ دُور نیچے درختوں اور سبزہ راز

انہیں بتایا کہ معمول نے راستہ بتا دیا ہے لیکن یہ خطہ اود آسان راستہ ہے۔

یہ راستہ آسان نہیں تھا۔ اُن کے گائیڈ انہیں منزل سے بہت دور دیر نے میں لے گئے تھے۔ ایک شام قافلے نے ایک جگہ تھام لیا اور گائیڈ نے انہیں بتایا کہ کل دن کے پہلے یہ وہ منزل پر پہنچ جائیں گے۔ سب تھکے ہوئے تھے کھانا کرفرا سو گئے۔ صبح اُن کی آنکھ کھلی تو دونوں گائیڈ غائب تھے۔ وہ اپنے گھنٹوں پر چلے گئے تھے۔ انہیں ادھر اوھر دیکھا لیکن بیکار تھا۔ وہ کہاں نظر آسکتے تھے۔ ان کے ارگرد اپنے پہاڑ کھڑے تھے نیچے سے اوپر تک چیل کے درختوں نے پہاڑوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ انہیں وہی راستہ معلوم تھا جس رستے سے وہ آئے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہیں اور منزل کتنی دور ہے۔

”ہندو ڈنک مار گیا ہے۔“ ساوگ نے کہا۔ ”اُن دونوں آدمیوں کو معلوم تھا کہ آپ مجھے یہاں کے پراسرار واقعات بتاتے جا رہے ہیں۔“

”ہم جب بالاسا سے آ رہے تھے تو میں چار بار کچھ دودھ آدمی جاتے دیکھے تھے۔ ایک کھانڈ نے کہا۔ میں انہیں مسافر بھٹلا دیا۔ یہ وہی نہ جوں۔“

”میں نے انہیں اس سے پہلے بھی دیکھا تھا جب ہم نے پہلا سانپ دیکھا تھا۔ ایک اور کھانڈ نے کہا۔ اُن کے چہرے نظر نہیں آتے تھے۔“

”وہی تھے یا کوئی اور تھے، اب کیا فرق پڑتا ہے۔“ ساوگ نے کہا۔ ”ہم بہت بڑے دھوکے کا شکار ہو چکے ہیں۔ اب یہاں سے نکلنے کا راستہ ڈھونڈو۔۔۔ اور دیکھو۔“

تھیلوں میں کھانے کی جو بھی چیز باقی ہے وہ پھینک دو۔ ہو سکتا ہے وہ ان میں نہ مرلا گئے ہوں۔“

ان کی بڑی کھٹن اور خطرناک سافٹ شروع ہو گئی۔ دن بھٹکے گزر گیا۔ رات آگئی جو انسانوں نے سو کر گزار لی لیکن یہاں سردی زیادہ تھی۔ اگلا دن بھی سبز پوش وادیوں میں بھٹکے گزر گیا۔

اگلے رات جب وہ سردی سے بچنے کے لیے کئی جگہ دیکھ رہے تھے، اُن کے

گائیڈ جو انہیں اتنے حسین دیرانے اور اتنی پُر وسیع بھول بھلیوں میں چھوڑ گئے تھے، قلعہ کوہ کوٹ میں ہندو قلعہ دار کے پاس بیٹھے اپنی کارگزاری سنا رہے تھے۔

”تم نے انہیں ہلاک کیوں نہ کر دیا؟“ قلعہ دار نے کہا۔ ”سلطان محمود کا قلعہ دار معمولی آدمی نہیں ہوتا۔ میں خوش ہوں کہ تم نے بہت موٹا شکار کر لیا ہے لیکن اُسے زندہ نہیں رہنا چاہیے۔“

”کالنجہ سے میں حکم ملا تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے۔“ ایک گائیڈ نے کہا۔ ”ہم خود نہیں سمجھ سکے کہ اس حکم کیوں ملا تھا۔ ہم ان کے کھانے میں بڑی آسانی سے زہر ملا سکتے تھے۔“

مہاراجہ کالنجہ نے کچھ سوچ کر ہی کہا ہوا کہ انہیں قتل نہ کیا جائے۔“ قلعہ دار نے کہا۔ ”وہ شاید محمد پریر ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ عہدے کے مطابق اُن کے فوجیوں کی جانیں یہاں محفوظ ہیں۔ اگر وہ خود ہی کہیں بھٹک بھٹک کر مر جاتے ہیں تو ہم انہیں روک نہیں سکتے۔“

اور ساوگ کو اپنے قافلے کے ساتھ بھٹکنے سے کوئی بھی نہ روک سکا۔ انہیں کہیں کوئی آبادی نظر نہیں آتی تھی نہ کوئی اکیلا دھکیلا جھونپڑہ یا کوئی انسانی نظر آتا تھا۔ کبھی کبھی انہیں ریشمیں کا جوڑا نظر آتا تھا یا بھیرلوں کے پھونسنے کی آوازیں سنائی دیتی تھیں۔ دنیا کا اتنا حسین اور جانفز خطہ انہیں بڑا ہی ہولناک اور پُر اسرار دکھائی دیتا تھا۔

ہندوؤں نے بڑی کامیاب چال چلی تھی۔ سلطان محمود فوج کی جو فہری یہاں چھوڑ گیا تھا، اس کا سب سے بڑا فساد ہو گیا تھا۔ ساوگ کو غائب کر دینے سے ہندو یہ قائمہ اٹھنا چاہتے تھے کہ انہوں نے اسلام کے خلاف جو شعبہ بازی کی طرح کی ہم چلا رکھی تھی اسے بے خوف خطر اور تیز کر دیں۔ ہندو عیارانہ چالوں میں ہمیشہ تیز اور دانشمند رہا ہے ہندوؤں میں پشت بھجنوں کے ساتھ ہندوؤں کو بتاتے تھے کہ گونا گونا جتنی مقدس ہے، سلطان اتنا ہی ناپاک ہے اس اسلام کا خاتمہ دھرم کا فرض ہے۔ ہندوؤں نے مسلمان کے قتل کو ایک نیکی اور مذہبی فریضہ قرار دے رکھا تھا۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے ہندوؤں

سے اسلام کے خاتمے کو آج بھی مذہبی فریضہ سمجھا جاتا ہے۔ آج بھی ہندو اسلام کو نقصان پہنچانے کے لیے اپنی اپنی کی عصمت قربان کر دیا کرتا ہے۔

۱۰۰۰ ایس راجنندہ رائے کالج کے جلسے میں اپنے تحریک کا رول کے استاد وادیت کار سے یہ رپورٹ سن رہا تھا کہ اُس نے لوگوں کو بکلی کی چمک اور حسین رنگینوں کو چڑھائیں اور بدرمیں بنا کر دکھانے اور افواہ بازی کی جو ہم شریع کی تھی وہ بے نقاب ہو گئی ہے اور غزنی کے فوجیوں نے ہمارے وہ آدمیوں اور تین رنگینوں کو سامان سمیت پکڑ لیا ہے۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ مسلمان فوجی ان آدمیوں اور رنگینوں کو ہر گز قتل میں لے جاتے اور لوگوں کو دکھاتے ہیں کہ یہ سب کالی چمک اور چڑھائوں کی حقیقت۔

ازمیر نے جن آدمیوں اور رنگینوں کو گرفتار کیا تھا، ان سے اس وعدے پر ان کے ساتھیوں کے متعلق پوچھ لیا تھا کہ وہ ان کی جان بخشی کر کے انہیں رہا بھی کر دے گا۔ اُس نے جس طرح انہیں پکڑا تھا، اسی طرح اُس نے ان کی نشاندہی پر ان کے ساتھیوں کو پکڑ لیا۔ ان کے پاس بھی سی سامان تھا لیکن ان کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔ وہ زیادہ آدمی تھے۔ وہ گاؤں گاؤں جا کر افواہیں پھیلاتے اور لوگوں کو ڈراتے تھے۔

ایک روز ازمیر نے یہ انتظام کیا کہ دو تین گاؤں کے لوگوں کو ایک جگہ جمع کر لیا اور ان کے سامنے ان افواہ بازوں کو کھڑا کر کے انہیں لگا کر وہ لوگوں کو بتائیں کہ وہ جو کچھ کہتے رہے ہیں وہ سب جھوٹ اور دھوکہ تھا۔ بہت سے لوگوں نے ان آدمیوں کو پہچان لیا۔ ان آدمیوں نے لوگوں کو اپنی اصلیت بتادی۔ پھر شام کے بعد ازمیر نے لوگوں کو بکلی کی چمک بھی دکھائی اور تینوں رنگینوں کو نیم پر بٹہ کر کے ایک پہاڑی کی چٹان پر کھڑا کر کے دُور اور سے ان پر آئینہ نہاتے۔ سے روشنی ڈھالی، پھر رنگینوں کو اسی نیم پر بٹہ حالت میں نیچے ہٹا کر لوگوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔

مہاراجنندہ کو جب پتہ چلا کہ ان کی ہم ناکامی اور بے نقاب ہو گئی ہے تو اُس نے یہ حکم دے دیا کہ اس علاقے میں جو مسلمان اہم اور استاد لوگوں کو اسلامی طریقے اور عبادت سکھا رہے ہیں، انہیں اس طرح غائب کر کے قتل کر دیا جائے کہ کسی کو ان کا سراغ نہ ملے۔ غزنی کی فوجی چوکیوں میں جو فوجی ہیں، انہیں بھی اکیلے دھیکلے غائب کرنا شروع کر دیا جائے۔

ازمیر ایک رات اپنی چوکی میں اپنے کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک کمرے میں اُس نے ان ہندو مردوں اور رنگینوں کو قید کر رکھا تھا جو لوگوں کو فریب دیتے اور نظروں کی تحریک لگائی کہتے پھر رہے تھے۔ ان پر اُس نے پیرہ کھڑا کر رکھا تھا۔ اُس نے انہیں کڑیا تھا کہ کل وہ مردوں کو بانٹا تھا۔ تین دو سے گا جہاں ان کی قسمت کا فیصلہ سارو کرے گا اور رنگینوں کو پاسیوں کی حفاظت میں کالج بھیج دیا جائے گا۔

ایک پاسی نے اُسے آکر بتایا کہ ایک لڑکی اُس سے ملنا چاہتی ہے۔ اُس نے لڑکی کو بلایا۔ یہ وہی لڑکی تھی جسے اُس نے ریکھ سے بچایا تھا۔
”کیا تم آج رات بھی مجھے اپنے پاس نہیں بلاؤ گے؟“ لڑکی نے اُس سے پوچھا۔
”یہ میری خواہش ہے۔“

ازمیر کی ہنسی نکل گئی۔ اُس نے کہا۔ ”مجھے احساس ہے کہ تم غیر معمولی طور پر خوبصورت لڑکی ہو۔ مجھ میں نے اتنی خوبصورت لڑکی کبھی نہیں دیکھی۔ میں تمہاری حیرت کو کبھی بھٹکا ہوں کہ کچھ جیسا جو ان فوجی جو اتنی مدت سے گھر سے دُور جنگوں میں ہوتے کے سائے میں پڑا ہے تم جیسی حسین لڑکی کی طرف وہ تو دیکھیں نہیں دیتا جس کی تہیں توقع ہے۔ اگر تم مسلمان ہو تو اگر تم پر یہ فرض مائدہ ہوتا جو مجھے سونپا گیا ہے اور اگر تم ایمان کا مطلب سمجھ سکتی تو تمہیں حیرت نہ ہوتی۔ تمہاری نظر جسم پر ہے۔ یہ تمہارا مذہب ہے۔ میری نظر روح پر ہے۔ یہ میرا مذہب ہے۔“

”اگر میں تمہاری خاطر تمہارا مذہب قبول کر لوں تو؟“
”ناگن کا زہر نکال دو تو کبھی وہ ناگن ہی رہے گی۔“ ازمیر نے کہا۔ ”اُسے شہد کھلاتا رہو تو کبھی اُس میں زہر رہے گا اور ناگن دس لے گی۔ اس کی فطرت ہے۔۔۔۔ میں یہاں ششی بازی اور شادی کرنے نہیں آیا۔ مجھے تمہارے جسم کے ساتھ کوئی دیکھی نہیں۔ یہی میری طاقت ہے کہ میری نگاہ نہ اپنے جسم پر پڑتی ہے نہ تم جیسی کسی حیدندہ کے جسم پر۔۔۔۔ اور لڑکی ازمیر سے مذہب کا حکم ہے کہ دشمن کی عہد تمہاری قید میں ہو تو اُس کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا گناہ ہے۔ اُسے الگ رکھو۔“

اگلی صبح از میر نے تینوں لڑکیوں کو گھٹھیل پر بٹایا۔ آٹھ دس سوار ساتھ لیے اور کالج کے طرف ریزا دھو گیا۔ لڑکی اپنا گھوڑا بدلا اور از میر کے گھوڑے کے قریب لے آئی تھی مگر از میر سوائے مسکان کے اس کے ساتھ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ آدھی رات کے قریب وہ کالج کے دروازے پہنچے۔ از میر نے لڑکیوں کو گھوڑوں سے اتارا اور واپس ہونے لگا۔

”میں تمہارے احسان کا صلہ نہیں دے سکی۔“ لڑکی نے کہا۔ ”مجھے ساری عمر فرس رہے گا۔ اپنے آپ کے سوا میرے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔“

”ملا خدا دے گا۔“ از میر نے کہا۔ ”اپنے راجہ سے کہنا کہ مردل کی طرح میلن میں آئے۔ جو میں جگ نہیں جیت سکتیں۔“

وہ اپنے سپاہیوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تو اس کی روح بھی مسرور تھی۔ خدا نے اسے اپنا لہو دکھایا تھا وہ خلع کے سامنے سرخورد تھا۔ اس نے اپنا فرض خوش اسلوبی سے ادا کر دیا تھا۔

نائب سالار سارنگ اپنے ساتھیوں کے ساتھ ابھی تک دایلوں میں بھٹک رہا تھا۔ اگر وہاں پہلے درخت اور پانی کی اخلاط نہ ہوتی تو وہ اب تک زندہ نہ رہتے۔ پہلے لوہ کوٹ کے قلعہ دار کوٹ لالہ دی گئی مگر بالآخر قلعہ دار سارنگ کو اس کے ساتھیوں اور ایک لہم کے ساتھ قلعہ میں چھوڑ دیا گیا ہے قلعہ دار نے یہ اطلاع کالج کے راجہ سندھ رائے کو دی۔ سندھ رائے نے حکم دیا کہ انہیں گرفتار کر کے قلعے میں لایا جائے۔ اس سے پہلے اس کا یہ حکم تھا کہ کسی مسلمان فوجی کو قتل نہ کیا جائے۔ اس کی بجائے انہیں غائب کیا جائے۔ اب جب اسے یہ پتہ چلا کہ اسلام کے خلاف اس نے جو ہم شروع کرائی تھی، وہ ناکام ہو گئی ہے اور تیس لڑکیاں واپس آ گئی اور تمام آدمی سلطان محمود کے فوجیوں کی قید میں تو اس نے حکم دیا کہ سارنگ اور اس کے ساتھیوں کو ڈھونڈو۔ وہ زندہ مل جائیں تو انہیں یہاں لے آؤ۔

بہت دنوں بعد ایک اور چوکی کا ایک سپاہی از میر کے پاس آیا اور اپنی چوکی کے

لڑکی کے آنسو چھل آئے اور وہ از میر کی چار پائی پر اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی۔ اس نے ایک بازو از میر کے گلے میں ڈالی یا اور اس کے اتنی قریب ہو گئی کہ اس کے کھیرے کھیرے ریشمی بال از میر کے گالوں سے مس کرنے لگے۔

”تم نے مجھے یکدم سے بچایا ہے۔“ لڑکی نے کہا۔ ”اب تم مجھے راکر کے خلاف سے واپس بھیج دینا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میں لڑکیاں اتنے دنوں سے تمہارے پاس تمہارے ہم و کرم پر ہیں مگر تم ہمارے لیے پتھر بنے رہے۔“

لڑکی بولنے لگتی چپ ہو گئی۔ اس نے از میر کا چہرہ اپنی طرف گھٹایا۔ اس کے چہرے پر درد کے آثار بڑے صاف تھے۔

”مجھے خون کی بو آ رہی ہے۔“ لڑکی نے گہرائے ہونے لہجے میں کہا۔ ”تم مجھے تھیکسوس معلوم ہوتے ہو۔ از میر ایک تم زخمی ہو؟“

از میر نے ہایاں ہاتھ اوپر کیا۔ اس ہاتھ میں خنجر تھا۔ خنجر کی نوک خون آلود تھی۔ لڑکی اس کے ماتیں طرف بڑھی تھی۔ وہ دیکھ نہیں سکتی تھی کہ جب وہ اس کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی تھی تو از میر نے اپنے سرانے کے نیچے سے خنجر نکال کر اس کی نوک اپنے ننگے پاؤں کے اوپر ملے جسے میں آلودہ تھی اور نوک کو بتا رہا تھا۔ لڑکی نے خون آلود خنجر دیکھا تو اٹھ کر از میر کے سامنے آ گئی۔ اسے از میر کا زخمی پائل نظر آ گیا جس سے خون نکل رہا تھا۔ لڑکی نے اسے حیران ہو کر دیکھا۔

”حیران نہ ہو لڑکی! از میر نے کہا۔ میں فرشتہ نہیں، انسان ہوں اور جو ان آدمی ہوں۔ تمہارے جسم کے لیس نے میرے ذہن سے میرا فرض اتارنا شروع کر دیا تھا۔ میں سلطان کے آگے جواب نہیں بلکہ خدا کے آگے جواب دہ ہوں۔ یہاں سلا مارا جوں اور سلطانوں کی فتح و شکست کا نہیں یہاں تمہارے اور میرے مذہب کی ٹکڑے ہیں۔ اپنے مذہبی اصولوں کو نہ مارے جس پر قربان نہیں کر سکتا، اور میں اپنے اوپر جبر بھی نہیں کر سکتا۔ اپنی توجہ تم سے ہٹانے کے لیے خنجر کی نوک اپنے پاؤں میں اٹا لی تھی۔۔۔۔۔ جاؤ تم چلی جاؤ۔“

لڑکی نے اس کا ایک ہاتھ اٹھا اور اپنی آنکھوں سے لگایا پھر اس کا ہاتھ چوم لیا وہ کچھ دیر ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ لڑکی اچانک گھوٹی اور کمرے سے نکل گئی۔

راج محل کے باہر چلے گئے والیاں اور دیگر عورتیں بہتی تھیں۔ جب یہ خبر اُس لڑکی کے کانوں میں پڑی جسے از میر نے دیکھ سے پایا تھا تو وہ باہر نکل آئی۔ وہ بھی سلمان فوجیوں کی قید میں رہ چکی تھی، اس لیے اُسے ان قیدیوں میں پکڑی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے قیدیوں کو ایک مذمت لے کر بھاگ دیا گیا تھا۔ لڑکی نے قریب آکر دیکھا۔ ان میں از میر بھی تھا۔

لڑکی ہندو فوجیوں کے کانڈر کو الگ لے گئی اور اُسے کہا کہ وہ از میر کو چھوڑ دے۔ اُس نے اپنے کانڈر کو بتایا کہ اس آدمی نے اُس کی جان بچائی تھی اور اُس نے اس کا صلہ قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ہندو کانڈر از میر کو راکر کرنے پر آمادہ نہ ہوا۔ لڑکی نے اُسے کہا کہ وہ منڈانکا اٹھام دے گی اور از میر کو اس طرح قلعے سے نکلے گی کہ کسی کو بہتہ نہیں چل سکے گا۔

یہ لڑکی اپنا جادو چلانے کی ماہر تھی۔ ہندو کانڈر کو اُس نے رام کر لیا۔ اس کے عوض لڑکی نے جو اٹھام پیش کیا، اُسے وہ تصور میں بھی نہیں لاسکتا تھا۔

قیدیوں کو اکٹھا کسی کے سامنے پیش نہیں کیا گیا تھا۔ سورج فوج ہو چکا تھا۔ قیدیوں کو اب قید خانے میں بند کر رکھا تھا۔ لڑکی از میر کو ایک ایسی جگہ لے گئی جہاں پودوں اور جھاڑیوں کی ادھ تھی۔ اندھیرا بھی گہرا ہو رہا تھا۔ لڑکی دوزی گئی اور کچھ کپڑے اٹھا لائی۔

”آج مجھے سکون نصیب ہوا ہے۔“ لڑکی نے از میر سے کہا۔ ”میں تندرست ہوں۔“
 احسان کا صلہ دے رہی ہوں۔ جاتے جاتے ایک اور خبر سن لو۔ یہاں دو اور بھارتیوں کی فوج آ رہی ہے۔ ایک فوج لاہور کی ہے۔ راجہ جیم پال منہ خور ساتھ لڑا ہے۔ ان کے آگے ہی وارا چند رائے سلطان محمود کو پیغام بھیجے گا کہ وہ اس کا باگڑار نہیں۔ اگر اس میں جنت ہے تو خود آکر باج وصول کرے۔ میں تمہیں یہ اطلاع اس لیے دے رہی ہوں کہ اس کے فوراً بعد تمہاری چکیوں پر حملے ہوں گے۔ مجھے صرف تساری ذات کے ساتھ دیکھی ہے۔ تساری تعداد بہت تھوڑی ہے۔ ہم مارے جاؤ گے یا پکڑے جاؤ گے، پھر میں تمہیں چھڑا نہیں سکوں گی۔ کیا یہ ممکن ہے کہ تم اپنی چوکی سے چلے جاؤ؟“

از میر ہنس پڑا۔ اُس نے لڑکی کا شکریہ ادا کیا۔ وہ اُس کے لالچ سے بے خبر تھی۔

اور وہ دونوں گناہگار ہیں ٹوٹ کر بھاگ گئے ہیں۔ ان کا انجام بھی انک ہوگا۔ ہمارے دونوں میں اللہ کی خوشنودی رہی تو یہ پتہ بھی نہیں پائی دیں گے۔“

اور پھر اس نے انہیں پانی دیا۔ اچھی رات گزر گئی تھی۔ چاند اوپر اٹھ گیا تھا۔ گھوڑے اپنی چال پہلے جا رہے تھے۔ دائیں طرف ایک وادی راستے سے آگئی تھی۔ وہاں جا کر دونوں گھوڑے رک گئے۔ لگائیں جھلنے پر بھی نہ چلے عمران نے گھوڑوں کے منہ دیکھ کر دونوں گھوڑے سختے چھٹکارے۔ جتنے اور دونوں وادی کی طرف دیکھتے تھے۔ دونوں آہستہ سے ہنسنا آہ وادی کی طرف چل پڑے۔

”اگر آؤرشی۔“ عمران نے گھوڑے کے پلوں میں جا کر رشی کو اپنی بازوؤں میں سے کھینچا اور کہا۔ ”انہوں نے پانی کی مشک لے لی ہے۔ پانی قریب ہی ہوگا۔“

دوسرے گھوڑے پر نظام اور زین سوار تھا۔ وہ بھی آڑ آیا۔ دونوں گھوڑے وادی کے اندر دوڑ پڑے۔ قدرت نے جانوروں کو یہ وصف عطا کر رکھا ہے کہ پانی کی ٹوڈر سے سوگندھ لیتے ہیں بعض چھوٹے چھوٹے جانور اور پرندے بارش سے بہت پیلے محسوس کر لیتے ہیں کہ بارش برسے گی۔ ان دونوں گھوڑوں نے پانی کی مشک لے لی تھی۔ عمران نے پہلے ہی اپنے ساتھیوں کو بتا رکھا تھا کہ اس خشک پیادہ سی خطے میں کہیں کہیں پانی مل جاتا ہے۔

گھوڑے دوڑتے گئے۔ عمران بھی اپنے ساتھیوں کے ساتھ گھوڑوں کے پیچھے گیا۔ کچھ دور اندر جا کر گھوڑے رک گئے۔ وہاں پیادہ کا دامن ایک وسیع اور بلند غار کی طرح کھنکھ چاندنی میں وہاں پانی صاف نظر آ رہا تھا۔ وہاں شاید چند گھوڑے پانی پی رہے تھے۔ پانی کی وجہ سے وہاں تھوڑی سی گھاس بھی تھی۔ گھوڑے پانی پی کر گھاس کھانے لگے۔ ان کے سوار بیٹھ گئے۔ جا کر گھوڑے سیر ہو جائیں۔

اُس وقت تا کہ لمبی اور ناظر غزنی کی سمت جا رہے تھے مگر وہ جا کیں بھی نہیں رہے تھے۔ وادیوں میں جھلک رہے تھے۔ لمبی غزنی کے عام راستے پر جاتے دڑا اٹھا۔ ترقی بھی کر سبازوں کے اندر ساند سے وہ لغمان میں چلے جا کر یہ وادیاں ایسی تھیں

سلازہ بھیج دیا بھیج کر آئے۔ قابی محمد ادرج کی کان بد اپنے ساتھ لے کر گئے۔
 ہمارے سب سے پہلے سلطان کو پہنچا بھیجیں گے کہ وہ اس کے باجگزار نہیں۔
 اگر سلطان میں اتنی ہمت ہے تو خود آکر باج وصول کرے۔ اس کے بعد ہی
 چوکیوں کو صاف کیا جائے گا۔

میرا ہونا ہی تھا۔ سامک نے کہا۔ دشمن کو اپنی شکست کا انتقام لینا ہی چاہیے
 اور پھر ہندوستان دشمن ہے جو شکست کو اپنے سامنے دیکھتا ہے تو کوارتار سے قدموں میں
 لٹک کر بیٹھا جاتا ہے۔ مظلوم ادبھکائی بن جاتا ہے۔ اگر کسی کو کہ اپنی تمام بیٹیاں اور بیٹیاں
 ہمارے حوالے کر دو تو فوراً ہوائے کر دے گا مگر تھاری تلوار کے نیچے سے نکلتے ہی سانپ بن
 جاتے گا اور اس کی ماری سوچیں اور ساری گولشیں اس پر مرکوز رہیں گی کہ وہ کس طرح اور
 کتنی جلدی تھیں۔ نکم مارے۔ ہند کے ساتھ ہماری جنگ زمین کے لیے نہیں یہ مذہبی
 جنگ ہے جو اس وقت تک لڑی جاتی رہے گی جب تک ہندوستان میں ایک بھی مسلمان
 یا ایک بھی ہندو زندہ ہے گا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہندو ہم پر کب حاکیوتا ہے۔

میں عرض کر رہا تھا کہ میں دیکھنے نہیں رہتا۔ از میر نے کہا۔ ہمیں آج ہی
 ایک قاصد غزنی کو روانہ کرنا ہے۔ دشمن کے لڑاؤ اور اس کی طاقت کے عملی کمی خوش فہمی
 میں مبتلا نہیں رہنا چاہیے۔ آپ کے پاس تو اتنی فوری نہیں کہ آپ جلد روک سکیں۔
 اسی وقت دو قاصد تیار کر کے انہیں پیغام دیا گیا اور انہیں کہا گیا کہ وہ کم سے کم
 رکیں اور راستے کی چوکیوں سے گھوڑے بدلتے جائیں۔

قاصد توقع سے زیادہ تیز گئے۔ سلطان محمود نے اپنی فوج کو ہرگز رفتار کی بڑی
 سخت ٹریننگ دے رکھی تھی اور ادا کیا ہوں کے نہیں میں بھی مثال رکھا تھا کہ چند لمحوں
 کی تاخیر شکست کا باعث بن سکتی ہے۔ اس ٹریننگ کا نتیجہ تھا کہ قاصد متوقع وقت سے پہلے
 پہنچ گئے۔ دو جب سلطان کو درگزر کے حالات اور دشمن کے ارادے سنا ہے تب وہ اُن
 کے سرِ لعل ہے تھے اور آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔

ایک انگریز تاریخ دان سر ہنری مورہ نے اپنے ایک مقالے میں (۱۸۹۸ء میں)

پس چکا تھا۔

مغل کے مدد سے بند ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایک گھوڑا روانہ کر کے
 گھوڑے پر بند ہوئے پیٹ دلا ایک ہندو سوار تھا۔ اس کے سر پر ہندوؤں والی
 چوڑی تھی۔ اس کے ساتھ لڑکی تھی۔ اس نے غلے کے دھانے کے اچھا راج سے کہا
 کہ ہندو جی سلازہ ہمارے پاس آئے تھے۔ یہ اب ساتھ دلوں گاؤں میں جا رہے
 ہیں۔ وہاں کوئی آدمی مر گیا ہے۔ مجھے کہا گیا ہے کہ ان کے لیے دو دن کھلوادوں۔
 وہ راج محل کی لڑکی تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس لڑکی کی کیا اہلیت ہے۔ اس
 کے کہنے پر دواؤں کھول دی گئیں اور ہندو جی سلازہ نکل گئے۔ اُن کے پیچھے دو دواؤں بند
 ہو گیا۔ از میر نے گھوڑا اور بیٹیاں۔ آہستہ آہستہ گلیڈ غلے سے دُور جا کر اس نے کتے
 کے اندر پھونسنے ہوئے وہ کتے نکال کر پھینک دیے جو اس کا پیٹ بڑھا ہوا دکھانے
 کے لیے پھونسنے گئے تھے۔ اس نے بڑی بھی آواز پھینکی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔

اگلے دن کے پچھلے سپردہ اپنی چوکی میں پہنچ گیا۔ نائب سلازہ سامک، امام اور دیگر
 تمام افراد جڑ بوجیاں بانٹتے سے غلے اور تھوڑے کا دل نے انہیں دیرانے میں گمراہ کر دیا تھا
 اب از میر کی چوکی میں پہنچ چکے تھے کیونکہ یہ چوکی اس جگہ کے فدا نزدیک تھی جہاں موکر
 رکھا نہیں چھوڑا گیا تھا۔

”تم کہاں تھے اور کس طرح آگے ہو؟“ سامک نے از میر سے پوچھا۔
 ”جواب سب سے زیادہ ضروری ہے پہلے وہ دشمن ہیں۔ از میر نے کہا۔ یہاں
 کے حالات بہت خراب ہو گئے ہیں۔ میں کالنجر غلے سے کسی کاندے سے فرار ہو کر آ رہا ہوں۔
 کالنجر کے سلازہ نے اس علاقے میں اسلام کے خلاف جو غریب کاری کرائی ہے، وہ
 آپ نے دیکھ لی ہے۔ یہ اللہ کا برا کرم ہے کہ کھد کا در خال گیا ہے۔ آپ کو گرتا کر کے
 کالنجر لے جانا اس امر کی دلیل ہے کہ سلازہ کالنجر اور سیماں کے چھوٹے چھوٹے راجے
 اور دارائے مہارے باجگزار نہیں رہنا چاہتے اور وہ ہمارے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔
 مجھے غلے میں پتہ چلا ہے کہ کالنجر میں ان لوگوں کی فوجیں اکٹھی ہو رہی ہیں اور لاہور کا

سب نے بلند آواز سے کہا "معلوم ہے سراج"۔ اور ان میں سے ایک نے
 کہا "ہم اس علاقے کے رہنے والے مسلمان ہیں۔ ہم اس علاقے کے لباس میں
 سلطان محمد کے پاس جاتے ہیں۔ اُسے بتائیں گے کہ ہم مسلمان ہیں اور اُس کی رہنمائی کے
 لیے آئے ہیں کیونکہ برف نے راستے بند کر دیئے ہیں۔ یہیں معلوم ہے کہ لوگوں کو کھانا کس
 راستے سے پہنچا جاسکتا ہے۔ ہم اسلام کے شہداء کی طرح باتیں کریں گے۔ ہم نے نماز
 اور کلمے زبانی یاد کر لیے ہیں۔"

شاہنشاہ نے "نندہ راستے" کہا۔ "اُسے لوگوں کو لے آنا۔ ہمیں پوری اُمید
 ہے کہ اُسے یہاں سے پیا ہونا پڑے گا۔ اُسے تم ہی واپس لے جاؤ گے۔ واپسی کے سفر
 میں تم اپنی اساری رکھنا۔"

یہ دس بارہ آدمی ہندو تھے اور تربیت یافتہ تہذیب کار۔ انہوں نے مسلمانوں کی
 طرح پہلی چھوٹی داڑھیاں رکھ لی تھیں اور لباس بھی بدل لیا تھا۔

سلطان محمد نے لوگوں کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا۔ اُس نے دس بہادار بھیجا
 کہ وہ آدھریں (جنگی علاقے) میں جا کر دلوں کے گائیڈ بن جائیں تاکہ وہ جاتے رہیں۔ پہاڑی علاقوں
 میں گائیڈوں کی ضرورت نہ ہونے کی وجہ سے سلطان محمد کی فوج کی جو چوکیاں پہلے سے
 موجود تھیں، انہوں نے مجروں اور گائیڈوں کا انتظام کر رکھا تھا۔ سلطان نے پیش قدمی
 کی تو راستے میں اُسے دس بارہ آدمی ملے جنہوں نے جھیلے اور جذباتی انداز سے رہنمائی کی
 پیش کش کی۔ انہوں نے چونکہ کہا تھا کہ وہ اس علاقے کے مسلمان ہیں اور وہ یہاں کے
 مہاراجوں سے اُس ملک کا انتظام لینا چاہتے ہیں جو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ رہا
 رکھا تھا، اس لیے سلطان نے انہیں اپنی فوج کے سالاروں میں تقسیم کر دیا۔

سلطان محمد نے لوگوں کے متعلق بہت کچھ سنا تھا لیکن اُسے جب تلوار نظر آیا تو
 اُس نے محسوس کیا کہ اسے بہت کم بتایا گیا ہے۔ وہ تلے سر کرنے کا مہر تھا لیکن وہ لوگوں
 کا تلہ دیکھ کر اُس نے اپنے آپ میں دھچکے مسمدس کیا۔ اس تلے کو بھی اظہار پر ناقابلِ تخریر
 کہا جاتا تھا۔ تمام مہاراجوں نے اسے ناقابلِ تخریر کہا ہے۔ یہ سہاڑی پر تعمیر کیا گیا تھا لیکن

سلطان محمد کے دور کے ایک قلعہ نگار ابن اسفندیار کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ پہلا
 موقع تھا کہ سلطان نے اپنے سالاروں اور دیگر کمانڈروں کو مقصد اور پروگرام بتائے بغیر نہایت
 جلد میں کوئٹہ کا حکم دے دیا۔ اُس کی ایک وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ وہ اسلام پر کھڑے
 ہیں جذباتی تھا۔ اُس نے جب سنا کہ وہ جنگی کشتی میں جہاں اسلام رائج کر آیا تھا مگر متعدد
 نے اس کے خلاف پراسرار اور زمین دوز تحریکیں کھدائیں کیں اور نائب سالار سادوگ
 اور اُس کے مسزوں کو گرفتار کیا تو سلطان ایسے غصے میں آگیا جس پر وہ قائل نہ رہا۔
 سرسری ہو کر دیکھنے اپنے مقابلے میں لکھا ہے کہ سلطان نے یہ بھی نہ سوچا کہ وہ کشتی
 جلد ہی وہاں پہنچے۔ ایک ہفت روزہ شروع ہو چکی ہوگی جو شکست کا باعث
 بھی بن سکتی ہے۔

ایک اور واقعہ نگار محمد رگبانی بن محمد حسین نے اپنی تصنیف "تاریخ راشدی"
 انگریزی ترجمہ سرائی ڈپٹی سرائی میں بھی ایسی ہی رائے کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ
 سلطان نے غالباً پہلی فتوحات کے زعم میں بلائی جنگ کے بغیر ایسے میدان جنگ کی طرف فوج
 کا حکم دے دیا جس کی دشواریوں و متول خطروں اور موسمی حالات سے وہ بوری طرح واقف
 نہیں تھا۔

اُس نے کچھ فوج پشاور سے اپنے ساتھ لی اور حسبِ معمول اتنی تیزی سے کشتی
 پہنچ گیا جس پر تاریخ دان بھی حیرت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ جنوری ۱۸۵۰ء یا ۱۸۵۱ء ہجری کے
 پہلے پہنچے جس کشتی پر پہنچا۔ پہاڑوں پر اور دابروں میں برف کی چادر کچھ جگہیں تھی چیل کے پیر بھی
 برف سے لگے تھے۔ سلطان کو یہ اصل جنس رپورٹ ملی کہ مہاراجہ نندہ راستے اور ہیم پال بڈ
 کھنجر کی بجائے تلہ وہ کوئٹہ میں ہیں۔ لہذا کاشمیر پر وقت ضائع کرنے کی بجائے وہ لوگوں کو
 مہاراجے میں لیا جاسے۔ یہ قلعہ سہ سو گیارہ سال کا کاشمیری مہاراجے کے بل جاسے گا۔

ادھر وہ کوئٹہ میں مہاراجوں کو اطلاع ملی کہ سلطان محمد آگیا ہے۔ مہاراجہ نندہ راستے
 نے اپنے جاسوسی اور تحریک کاری کے نظام کے سربراہ کو بلا کر کہہ کر ان آدمیوں کو لے
 کر آجھڑی دیر میں اُس کے سامنے دس بارہ آدمی کھڑے کر دیئے گئے۔

مگر انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ترانہ کیا ہے؟ نندہ راستے نے ان سے پوچھا۔

تو برلندی اس کی تیسریس حاکم تھی۔ اس کی دیواریں بہت قوی اور مٹی کی تھیں اور بہت چوڑی اساس کے کئی برج تھے جہاں سے محاصرہ کرنے والی فوج کو نہایت آسانی سے تیروں کی نیندیں لیا جاسکتا تھا۔ دیواروں میں نقب لگانے والے باہر اندر بے حد در نقب زن بھی میاں بہت تھے۔ قلعے کے وہ زون کے باہر لڑی دھلیں تھیں کہ مایوسیوں کی گھروں سے باہر سے بڑے شہر بلوں کے ساتھ بانڈھ کر ان سے بھی دروازے نہیں توڑے جاسکتے تھے۔

سلطان محمود نے قلعے کو دیکھا تو اپنی فوج کو روک کر کھٹکھٹا کر لیا۔ خود گھوڑے پر سوار ڈا بلندی پر چلا گیا اور بڑی بلند آواز سے اُس نے اپنی فوج کا حوصلہ بلند کرنے کے لیے کہا۔
— اللہ کے پاس ہو آج تم سلطنت غزنی کی خاطر نہیں، اپنے اللہ اور رسول کی خاطر لڑو گے۔ ہم نے یہاں کے بچے بچے کو مسلمان کر دیا تھا مگر یہاں کے کفار نے یہاں کی غریب اہمچور غفلت کو صرف اس لیے ظلم کا نشانہ بنائے رکھا کہ یہ مسلمان ہو گئی ہے۔ آج ہمیں یہاں انہی کفار کے خون سے اسلام کی قبیل روشن کرنی ہے۔ وہ قلعہ فطر آ رہا ہے۔ برف میں ڈھکا ہوا قلعہ ہمیں لگا رہا ہے۔ یہاں کا موسم نہیں لگا رہا ہے۔ ہم میرا زون اور ریگستان میں لٹے ہو آج ثابت کر دو کہ زمین و آسمان ہم جاتیں گے سلطان کی رگوں میں خون گرم رہتا ہے اور ایمان کی حرارت برف کے پہاڑ چمکلا دیا کرتی ہے۔ ہم بہت دور سے آئے ہیں۔ ہم خدا کا پیغام لے کر آئے ہیں۔ ہمیں کھاؤ کہ اس قلعے پر اسلام کا پرچم لہراؤ گے ورنہ واپس نہیں جاؤ گے۔

سلطان محمود نے ایسی تقریر بھی نہیں کی تھی۔ وہ پارسوں تک جو شیعہ پیغام اُن کے کان میں ملنے کے ذریعے پہنچا کر تھا۔ اُس نے فوج کو ڈرنگ بے رکھی تھی۔ اس کے سامنے جذباتی تقریریں کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں، لیکن اُسے وہ کوٹ کا قلعہ اور موسم نظر آ رہا تھا۔ مزاج دیکھتے ہیں کہ غم کا اس قلعہ کا سلطان خود اعتمادی سے جنگ آواز میں بولنے والا جس کے چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کچھ نہیں دیکھی گئی تھی، اُس وقت جانے کیسی ذہنی کیفیت میں تھا کہ اس کی آواز میں لرزہ تھا اور کبھی کودہ چپ ہو جاتا تھا جیسے مسنون الفاظ دھونڈ رہا ہو۔

اور یہ پہلا موقع تھا کہ اُس نے گھوڑے سے اتر کر دو رکعت نفل پڑھے اور یہ بھی نہ کہا (جیسے وہ اکثر کہتا تھا) کہ مجھے اللہ کا اشارہ مل گیا ہے۔ فتح ہماری ہوگی۔ اُس نے گھوڑے کی کلام کو جھٹک دیا اور گھوڑے پیچھے آتا رہا۔

اللہ اکبر کے نعرے نہ کوٹ کے اندر گر جئے گئے۔ قلعہ جس پہاڑی پر کھڑا تھا اس سے بہت کچھ کیاں اور اونچی اونچی چٹانیں تھیں۔ ان پر سخت تھے لیکن قلعے والی پہاڑی کی ڈھلان سے تمام سخت کٹا دیئے گئے تھے۔ اس پہاڑی کے دامن اور ارد گرد کی چٹانوں کے دامن میں کچھ فاصلہ تھا۔ سلطان محمود نے قلعے کے گرد گھوم کر جائزہ لیا۔ قلعے کی دیواروں اور برجوں سے ہندوئیں لگا رہے تھے اور دامن طعن بھی کر رہے تھے۔ ایک واقعہ نگار نے لکھا ہے کہ فارسی کا ایک نمرہ بار بار نالی دیتا تھا۔ سلطان غزنی، ہندو سے خدا نے تیری نسبت میں برف کی بڑکھ دی ہے۔

سلطان نے اندر گر کر چٹانوں پر تیرا انداز چلا کر دیواروں پر تیر برساتے اور ان کے سامنے میں نقب زون کو اس کام کے لیے آگے کیا کہ وہ قلعے والی پہاڑی میں سرنگ کھودیں۔ اُسے معلوم تھا کہ بیشتر کی پہاڑیاں پتھریلی نہیں۔ ان میں مٹی زیادہ ہوتی ہے۔ لہذا کھدائی آسان تھی۔ سلطان نے یہ بھی سوچا تھا کہ سرنگ چند گز کھودی گئی تو کھودنے والے اس کھ گھمیروں سے محفوظ ہو جائیں گے اور کھودتے چلے جائیں گے۔

نقب زون نے سرنگیں کھودنے کے لیے جوبولا لیکن ان میں سے ایک بھی زمین نہ رہا۔ اوپر سے یہ جمیع مسنون میں موسلا دھار بارش کی طرح آئے اور تمام نقب زون دیہی ختم ہو گئے۔ ہندو لکی چٹانوں سے دیواروں پر جو تیر چلائے جاتے تھے وہ ہندو کی وجہ سے کرن نقصان نہیں کرتے تھے۔

چند ایک پارسوں نے دیر کی کا۔ بے مثال مظاہر بھی کیا کہ وہ دروازہ توڑنے کا سامان اور آگ لگانے والی آتش کے ساتھ قلعے کے دروازے کی طرف دوڑے مگر دروازے کے نیچے ڈھلان پر برف پڑی ہوئی تھی۔ پابھی اوپر چڑھتے پھسلتے تھے۔ اوپر سے تیروں کی پوجا میں آئیں اور سب کی لاشیں لڑکھتی ہوئی پئے آئیں۔

انہوں نے سلطان کو مل دی کہ وہ اپنی کالیک رات ابھی محفوظ ہے۔ فوج بکھری ہوئی تھی۔
تین حصوں میں بٹ کر گھائیڈل نے اپنے آپ کو ان تین حصوں میں تقسیم کر لیا سلطان
کے بیگروں کو ان گھوڑوں سمیت دیا میں سے گئے تھے تاہم فوج کو کوٹ کے قیروں
اور برف کے طوفان کی غمزدگی تھی۔ اب کچھ فوج میں حصوں میں تقسیم ہو کر گائیڈل

کے پیچھے چلے تو اس کا جو حشر ہوا اسے محمد قاسم فرشتہ یوں بیان کرتا ہے
”سلطان محمود کا سر اٹھانے اور غزنی کو واپس چلے جانے پر مجبور ہو گیا۔ اُس کی

فوج کو فوجی گائیڈل نے ایسا گمراہ کیا کہ بہت دنوں تک اُس کی فوج برف کی اس دنیا
میں بھٹکتی رہی۔ برف کے نیچے کھائیں اور کھنڈ تھے۔ دریا کی ڈھلانی بھی برف تلے چھپ گئی
تھیں گھوڑے اور پیادے پھسلے اور بندھے دیامیں جاتے اور فاسب ہو جاتے تھے۔
بہت سے سپاہی اکثر مر گئے۔ اگر کوئی رُک گیا تو وہیں اکر گیا۔“

”یہ سلطان کی بہترین فوج تھی۔ وہ قوم تو سر نہیں کر سکا تھا لیکن گائیڈل نے
اُسے گمراہ کیا اور خود غائب ہو گئے۔ سلطان محمود جب برف جگیاں کے نائب سالار ملک کے
کیپ میں پہنچا، تو اُس کے سامنے اتنی تھوڑی فوج تھی جسے وہ بڑی آسانی سے گن سکتا
تھا۔ چند دنوں بعد وہ غزنی چلا گیا۔“



دوسرے مدافعوں پر بھی ایسے ہی ہونے لگے صرف ایک مدافع تک چند
ایک سپاہی پہنچ سکے اور انہوں نے گھائیڈل سے مدد نہ لے کر شرمیلہ کی گھر اور سے ان
پر چلتی ہوئی گھڑیاں اور بکتے ہوئے انکارے انڈیل دیئے گئے۔ سپاہیوں کے کپڑوں کو داگ
لگ گئی۔ ان کے ہر مجلس گئے۔

علی اگر دیر ہی، ابن الاثیر اور دیوہی موزوں نے لکھا ہے کہ رات کو بھی سلطان
کے نقب زن جیش طلوع کی سپاہی کی مدد میں سرنگیں کھودنے کی کوشش کرتے رہے۔ جمع
سلطان نے دیکھا کہ سپاہی کے دامن میں نقب زنیوں کی لاشوں کے انبار لگ گئے تھے۔
سلطان کے منہ سے غصے سے جھگ پھوٹنے لگی۔ وہ ہر طرف گھوڑا دوڑاتا اور سرنگیں کھودنے
کے حکم دیتا پھر رہا تھا۔ اسلام کے نام پر سپاہی اور کاتب و قریبان ہونے چلے جا رہے
تھے۔

پھر ایک اور رات آگئی اور اس رات کے ساتھ صرف برہاری نہیں بلکہ برہانی
طوفان آگیا۔ سورج دھندے میں گر جھکنا تیز اور برہاری اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑے بھی
برداشت نہ کر سکے۔ بیشتر گھوڑے اور اداھر بھاگنے لگے۔ کوئی ادب نہیں تھی۔ چھپنے کی
کوئی جگہ نہیں تھی۔ چائیں برف تلے جاتی جاری تھیں۔ طوفان کا جھرکاؤ فوج تھا اور مردیلے علم
تھا گھوڑوں کے ساتھ سوار بھی اُدھر کو ہی بہتے جا رہے تھے اور اوپر سے لڑھکتے دیا میں
گرتے جا رہے تھے۔ دال دیا بہت شیعہ بتا ہے۔ اس کا یاں تنگ ہے اس لیے گمرا
بھی ہے اور بہاد بہت تیز۔

صبح طلوع ہوئی تو کوئی گز نہیں سکتا تھا کہ یہ کل والی جگہ ہے۔ طوفان ختم کیا تھا اور
برف کی کئی فٹ ڈپ تھی۔ اس برف میں غزنی کے ہزاروں فوجی دب گئے تھے۔ سالاروں
نے سلطان سے کہا۔ ”اگر کوئی منظور تھا۔ اتنی فتوحات کے بعد ایک شکست کو ہم خاطر
میں نہیں لاتے۔ ہم پھر آئیں گے۔ باقی فوج کو کچا لیں۔“

سلطان محمود نے خود امدادی اور کٹل سے تسلیم کر لیا کہ وہ مار گیا ہے۔ اُس نے واپسی
کا حکم دے دیا۔ اب تو واپسی بھی محال ہو گئی تھی۔ اتنے بند ہو گئے تھے۔ اُس شکل بہت
میں وہ لایہ آگے آئے جو دھل ہند تھے مگر اپنے آپ کو جو شیعہ مسلمان ظاہر کرتے تھے۔

تھے اور اس سے خائف رہتے تھے۔ اب ان کے لیے بڑا اچھا موقع تھا کہ اُس پر فوج پڑے۔

طمع تحت کی اور تاج کی

سنی ۱۱۵ھ میں سلطان محمود جب ہندوستان سے واپس غزنی گیا تو اُس کی حالت کئی ٹوٹی پٹنگ جیسی تھی جو ہوا کے رحم و کرم پر زلزلتی زمین کی طرف آتی ہے اور اُسے پیر نہیں ہوتا کہ زمین ہل کرے گی یا کسی درخت کی ٹٹیکل میں الجھ کر پھٹ جائے گی اُس کے ساتھ تھوڑی سی فوج تھی اور یہ فوج ہاتھی جلوس کی طرح غزنی میں داخل ہوئی تھی غزنی کے لوگ جو اُس کے استقبال کے لیے راستے میں آئے کھڑے ہوئے تھے، ان کے ہونٹ ہل گئے تھے۔ ان کے لاشیائے نعرے ان کے سینوں میں تید ہو گئے تھے جو عرصے میں جو داندوں میں اور منڈیروں پر کھڑی تھیں، انھیں ان دانتوں تلے دبا کر رہ گئیں۔

سلطان محمود غزنوی نے اپنی قوم کو اس ادا اس سکوت میں دیکھا تو اُس نے گھوڑا روک لیا اور اپنے سالار الطغاش کو بلایا۔

”الطغاش! یہ لوگ خاموش کیوں ہیں؟ اگر فوج ماری گئی ہے تو ان کے نعروں کیوں مر گئے ہیں؟... انہیں کہو کہ فوج قوم کے لیے زندہ رہتی ہے۔ انہیں کہو کہ تم نہ سرجاؤ نہ نعرے لگاؤ۔ کہو اسلام زندہ باد۔ کہو سلطنت غزنی زندہ باد۔ اپنے زخمی سپاہیوں کے جوصلے بڑھاؤ۔ ہمارے نعرے ان زخمی شیروں کو اٹھادیں گے اور وہ جوشید ہو گئے ہیں وہ اپنی زندگی قوم کو دے گئے ہیں۔“

الطغاش نے بلند آواز سے سلطان محمود کے الفاظ دہرائے تو غزنی کے دہریلوار اور غزنی کا آسمان اسلام زندہ باد، پاسبان اسلام زندہ باد اور بُت شکن زندہ باد کے نعروں سے لرز نہ گئے۔

”اور ان لوگوں اور بہنوں کے کہو کہ اسلام کی ناموس تم سے نرند سے بیٹے اور تمہارے بھائی مانگ رہی ہے۔“

الطغاش نے بلند آواز سے سلطان کے یہ الفاظ بھی دہرائے تو عورتوں نے ان

پھولوں کا جوا نسوں نے سلطان کی حالت دیکھ کر چھپا بیٹھے تھے، زخم خوردہ فوج پر ہنس برسایا عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ہمارے بیٹوں کو لے جاؤ۔ ہمارے بھائیوں

۳ جولائی ۱۱۵ھ (۵ صفر ۵۱۵ھ) کے روز سلطان محمود غزنوی کو اپنی تاریخ کی ایک بہت بڑی جنگ بہت بڑے اور بے حد خطرناک ایمان فروشوں کے خلاف لڑنی پڑی۔ اُس کی سلطنت اور اسلام کے خلاف یہ بڑی ہی خطرناک اور دور رس سازش تھی جس کے پیچھے یہودیوں اور عیسائیوں کا ہاتھ تھا۔ سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ غزنویوں نے ۱۱۵ھ میں شیر سے شکست کھا کر واپس گیا تھا۔ اُسے کثیر کی برہان سے شکست دی تھی اور اُس کی شکست خوردہ فوج کو ہندو ٹائیکل نے مسلمانوں کے بہرہ واپ میں گرا دیا اور فوج برف سے آبی ہوئی وادیوں اور برف سے لدی پہاڑوں میں بہہ بہاؤ ہو گئی تھی۔

انے زادہ نقشان کی تلافی کے لیے کئی سال درکار تھے۔ اس عرصے کے لیے سلطان محمود غزنوی فوجی کاملاً ختم ہو گیا تھا۔ وہ معمولی سا فوج لڑنے کے بھی تیار نہیں رہا تھا۔ غزنی میں اُس کی کچھ فوج موجود تھی اور کچھ سرحدوں پر خیر زنی تھی۔ اس سے وہ جلد روک سکتا تھا۔ جوابی حملہ کرنے کے لیے اُس کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اسے ہندوؤں کے حملے کا خطرہ نہ تھا۔ اُس وقت تک وہ ہندوؤں پر دہشت طاری کر چکا تھا۔ وہ کثیر سے شکست کھا کر لڑ جو گیاں (بال نامہ) لگا تھا۔ راجہ ہیم پال نے تھوڑی سی فوج سے اُس پر حملہ کر دیا تو اُسے زندہ پکڑ سکا تھا مگر راجہ نے مارا جے اسے زخمی شیر سمجھتے ہوئے اُس کے قریب نہیں جاتے تھے۔

سلطان محمود کو خطرہ اپنے بھائیوں سے تھا جن کی ریاستیں اُس کی سلطنت کے اندر گھنٹیں۔ وہ سب مل کر بھی اور باری باری بھی اُس کے خلاف حرکت کر سکتے تھے۔

کو بے جاؤ۔

سلطان محمود غزنوی نے قوم کا حوصلہ بڑھایا تھا مگر اُس کے اپنے سینے میں جو غش تھی، یہ نئے بے چین کیے ہوئے تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے لوہ کوٹ (کشمیر) میں اپنی شکست کی تمام تر ذمہ داری اپنے اہل زوال لی تھی۔ اُس نے اپنے سالاروں اور غزنی میں مقیم اپنی فوج کے کمانداروں کو بلا کر کمانچہ دہشت خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس شکست کا زہر بار میں خود بخود نہیں نکلے گا۔ وہاں کے موسم کی طرف توجہ نہ دی۔ میں نے اپنے مجنوں اور جاسوسوں سے وہاں کی کیفیت پوچھی اور پھر میں ہندوستان کے جھانسنے میں آگیا۔ اب یہ ہمارا فرض ہے کہ قوم کو یہ شکست فتح میں بدل کر دکھائیں۔ ہمارا کام صرف حکومت کرنا نہیں۔ میرا حکم یہ ہے کہ اور اس کی تعمیل کرنا کہ قوم کا کوئی فرد تیس شکست کا لہو دیتا ہے تو اس لئے کو خندہ پیشانی سے قبول کر دے اور اسے یقین دلاؤ کہ تمہاری فوج تمام شکستے دُور کر دے گی۔

ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے باوجود اُسے چین نہ آیا اور وہ اپنے مرشد ابو الحسن خرقانی سے ملنے روانہ ہو گیا۔ خرقانی ایک دن اور آدھی رات کی مسافت جتنی دُور بہتے تھے اُس نے اپنے محافظوں کے ساتھ تیز رفتاری سے یہ مسافت طے کی اور اپنے مرشد کے قدموں میں جاگرا۔

”سلطان کا انداز بنارہا ہے کہ شکست کھاکر آیا ہے۔“ ابو الحسن خرقانی نے کہا۔
”مگر سلطان کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟“

”ذمہ داری“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میرے مرشد میری روح بے چین ہے۔ جن کی لاشیں کشمیر کی برف تلے چھوڑ آیا ہوں، ان کی مدد میں رتوں کو سونے نہیں دیتیں میں کچھ سوچنے کی حالت میں نہیں رہا۔“

”ہم سہ سلطان!“ خرقانی نے کہا۔ ”جسبیدوں کی مدد میں نہیں بے چین نہیں کیا کرتیں جو ان کے لوہ کے ایک ایک قطرے کا انتقام لینے کا عزم رکھتے ہیں۔ یہ بھی تمہاری فوج ہے۔ اسلام کے نام پر لڑنے کے لیے جس میدان میں جاؤ گے یہ وہیں تمہارے ساتھ ہوں گی۔ ہم جیسے پر عزم جنگو کے راستے میں یہ جذبات رکھنا نہیں بن سکتے بہت

زار و سلطان! ہندوستان کی مسجدیں تمہاری راہ دیکھ رہی ہیں۔“

”میں بہت بڑے دھوکے میں آگیا تھا۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”ایک تو موسم نے دھوکہ دیا، دوسرے ہندو دہمکازوں نے مسلمان بن کر دھوکہ دیا۔“

”یکوئی کی بات نہیں ہوئی۔“ خرقانی نے کہا۔ ”کفر اسلام کو دھوکے دیتا چلا آیا ہے، دھوکے ہی دیتا چلا جائے گا۔ آئندہ ان دھوکوں سے بچو۔ ابھی تو آپ کو اپنی زمین پر جنگ لڑنی پڑے گی۔ سیودی اور عیسائی مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ہماری جڑیں میں اتر گئے ہیں۔ خلیفہ جو اُمت رسول کے اتحاد کی علامت تھا وہ خود امتداری کی ہوس کا شکار ہو گیا ہے۔ ملت کی مرکزیت بکھر گئی ہے اگر آپ اسلام کی خاطر جنگ و جدل کے شیلڈ میں تو سلطان کو دل سے نکال دیں۔ نظر دشمن پر رکھیں۔ فوجی طاقت سے دشمن کو مرعوب کریں، اپنی قوم کو نہیں۔ تاج اور تلووار ایک ساتھ نہیں رہ سکتے۔ محبت تاج سے ہوتی ہے یا تلوار سے۔ دہ لوار کا بال نفرت ہوتی ہے جو تاج کی طاقت کے لیے چلے ایک شکست سے دایہ پر راستہ نہ ہو سلطان! اُٹھتے وہی میں جو گرتے ہیں۔ گر کر اُسی شان سے اٹھو جس شان سے آپ نے دشمن کو اکارا تھا۔ اپنی غلطی اپنے سر پر۔ قوم کو دھوکے میں نہ رکھنا۔“

”آپ نے فرمایا ہے کہ یہ سیودی اور عیسائی ہماری جڑوں میں اتر گئے ہیں۔“ سلطان محمود نے پوچھا۔ ”آپ کا یہ اشارہ کس طرف ہے؟“

”اسلام کا سب سے بڑا دشمن سیودی ہے۔“ شیخ ابو الحسن خرقانی نے کہا۔ ”وہ مسجد اقصیٰ کو اپنی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ اس کی کوشش ہے کہ کلیں کو اپنا وطن بنا کر خلیفہ پر بھی قبضہ کر لے اور ہمارے اس مقدس مقام کو سمارک دے۔ سیودی خود لڑنے والی قوم نہیں۔ اس کے پاس دولت ہے جسے وہ مسلمان کی جڑیں کاٹنے کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ ہندوؤں کی طرح سیودی بھی اپنی جلیوں کو استعمال کرتے اور عیسائیوں کو مدد دے رہے ہیں۔ تراسلی فرقہ انہی کی پیداوار ہے۔ آپ کے خلاف لڑنے والے مسلمان ان سے دیر پر گئے جوڑ بکے ہوئے ہیں۔ آپ کو خانہ جنگی میں اکھانے

جوتی تھیں۔

”میرا آپ مثل ہر گنا تھا اور میرا بڑا بھائی مر گیا ہے۔ اب اہل لباس نے کہا۔ میں اپنے آپ کو تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ راز کی ایک بات ہے جو دل میں کاٹنے کی طرح اتر گئی ہے۔ کیا آپ اس راز سے پردہ اٹھانے کیلئے ہیں؟“

”جن پروں کو میرا بوجھ ہی اٹھائیں، چاک کر کے دیں، ان پردوں میں چھپے ہوئے راز مامونی خاندان سے کبھی نہیں چھپائے۔“ وزیر نے کہا۔ ”مجھے اپنے دل کا کاغذ دکھائیں۔ شاید میں نکال سکوں۔“

آپ جانتے ہیں کہ میرے بھائی کی وفات پر ہمارا سرفراز الٹگین آیا تھا۔
 ابو العباس نے کہا: ”اُس نے مجھے کما تھا کہ آپ کے بڑے بھائی کی وفات کے انصاف
 کے ساتھ میں آپ کو خاتم شاہی کی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور آپ پر یہ راز ناس کرنا پڑتا
 فرض بھٹانوں کہ آپ کے والد مرحوم کو قتل کیا گیا تھا اور آپ قاتلوں کو جانتے ہیں مگر آپ
 کو یہ علوم نہیں کہ آپ کے بھائی ابو الحسن مامون بھی قتل ہوئے ہیں جیسی موت نہیں کہ میں
 اس خبر پر حیران نہ ہوں کہ ان کو میں اپنے دشمنوں کو جانتا ہوں اور ان سے تہمتیں لگاتے ہیں کہ میرے بھائی
 کو ایذا پہنچایا تھا جس کے اثرات ہیئت کی کسی بیماری سے ملتے جلتے تھے یہ زہر آہستہ
 آہستہ اثر کرتا اور طبعاً اسے ہیئت کا مرض سمجھتے رہے۔“

”یہ ممکن ہے۔“ ابو کارث نے کہا۔ ”دشمن کی کچھ چیزیں کر سکتا۔ آپ کے دشمن آپ کی جنگی طاقت سے خائف ہیں، ویسے ہی ادھیڑ بجے استعمال کر رہے ہیں۔“

میکسن محترم وزیر! — ابوالباس نے کہا — آپ لنگھیں نے وقت سے کہا ہے کہ میرے بھائی کو سلطان محمود نے زہر دیا ہے اور میرے بھائی کو سلطان محمود کا سین گاہ کا لہجی نے جو اُس کی بیوی لکھی پلا تھا، اُس نے اس کی وجہ بتائی ہے کہ سلطان محمود نے یہ سنا تھا کہ اُس کا اُس کی اطاعت قبول کرے میرے بھائی نے کہا کہ وہ اُن کا بھائی ہے

اُس دور میں خواندم ایک ایک ملک تھا جس کا دار الحکومت جرّانہ تھا۔ بعد میں یہ گرجنگ کہلا گیا۔ آج کل یہ گرجنگ کہلاتا ہے۔ پھر اسی ملک کا ایک صوبہ تھا خواندم میں مامون خاندان کی بادشاہی تھی۔ بادشاہ خوارزم شاہ کہلاتا تھا۔ یہ پہلے بھی سلطان ملک تھا۔ ۹۹۵ء میں ابوعلی مامون بن محمد بن علی نے خوارزم پر حملہ کر کے اس کے بادشاہ ابو عبد اللہ کو قید میں ڈال دیا اور تمام ملک پر قبضہ کر لیا تھا بعد ہی سال بعد ۱۰۰۱ء میں ابوعلی مامون تل ہو گیا لیکن اس کے دشمن مامون خاندان کا تختہ الٹ گئے۔ ابوعلی کے بیٹے بوکسن علی مامون نے بادشاہی سنبھال لی۔ وہ بارہ سال بعد ۱۰۱۷ء میں بڑھاپے سے بہت پہلے مر گیا۔ وفات سے تین سال بعد تین سال پہلے اُس نے سلطان محمود غزنوی کے ساتھ دستانہ تعلقات کے انتظام کے لیے سلطان بنجونی جن کے ساتھ جن حکام کا مدد کا بھی تھا، شادی کر لی تھی۔ ابوعلی کی وفات کے بعد محمود غزنوی سلطان محمود کے پاس پائس آگئی تھی۔

الو کہن ملی مامون کی فحاشی کے بعد اس کا چھوٹا بھائی ابو العباس مامون تخت نشین ہوا۔ اس کی عمر اُس وقت کمپن سال تھی۔ اس کی دہریاں تھیں جو ازرم شاہ کا وزیر ابو اکمار بن محمد تھا۔ ابو العباس مامون کے اب ابو علی مامون کے وقت سے وزیرِ حلاوت تھا۔

بڑھا، دوپکا تھا۔ اسے اسٹیٹ خاندان کے ساتھ بلی محبت پیدا ہو گئی تھی اور اُس کے سینے میں ایک ننھے لالہ کا جذبہ اور درد بھی تھا۔ اور لالہ ان کے بیٹے اُس کے اہتوں میں جنے پے تھے۔ وہ انہیں گے باپ کی طرح مشورے دیا کرتا اور انہیں ناروا حرکتوں سے مدد کرتا تھا۔ خوارزم کے صوبہ بخارا کا گورنر، امیر ابٹگلیں پتہ عمر کا تجربہ کار اور گھٹا آدمی تھا۔ اُس کے ستی وزیر اکبراش کی رائے اچھی نہیں تھی۔ بظاہر وہ خواندہ، شلو کا زمانہ بلکہ خوشامدی تھا مگر اُس کے مشورے اور اس کی رپورٹیں نیک فیتی پڑتی تھیں۔

یقین کروں کہ الیگین نے جی کہا ہے؟

”نہیں۔“ وزیر ابوالکوارث نے جواب دیا۔ ”میں اس الحشاک کو اس لیے صبح نہیں مان سکتا کہ یہ الیگین نے کیا ہے، اور اس لیے بھی نہیں ہانوں گا کہ سلطان محمود درمیدان ہے۔ اُسے زہر دیا جاسکتا ہے اور زہر دے نہیں سکتا۔ میں اُس کے ذاتی کردار سے واقف ہوں۔ وہ سلطان کا اہل اپنی سلطنت کی توسیع کا خواہشمند ہوتا تو زندہ رہنے کی کوشش کرتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ وہ کتنی بار ہندوستان کے دروازہ پر کھٹکتا ہے اور اب پھر ہندوستان پر چڑھا ہے۔ وہ اسلام کا شیلڈ اور صلح ہے۔ وہ ہمت نہیں ہے۔“

ان کے درمیان یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود غزنوی کشر میں لوہ کوٹ کے طے کا محاصرہ کیے ہوئے تھا اور اُس کی فوج برف باری میں تباہ ہو رہی تھی۔

”آپ دیکھ رہے ہیں کہ سلطان محمود کتنی بار میرے کوشش کر چکا ہے۔“ وزیر ابوالکوارث نے کہا۔ ”ہندوستان کے راجوں ہمارا جوں کی جگہ طاقت مسمولی نہیں۔ اس طاقت سے صرف محمود کر لے سکتا ہے اور وہ لے رہا ہے۔ ایسے جوانی اور جنگجو کسی کو زہر نہیں دیا کرتے۔“

”میں قتل نہیں ہونا چاہتا۔“ ابوالعباس نے کہا۔ ”میں دوست بنانا چاہتا ہوں جو زندہ ہیں اور زندہ رہنے دیں۔ مجھے مشورہ دین کہ میں ترکستان کے خانیں کو مدد بناؤں۔ سلطان محمود کو مجھے سلطان محمود سب سے زیادہ طاقتور نظر آتا ہے۔ آپ کی رائے اس کے حوالے سے کچھ بھی ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ جس طرح اپنے دشمنوں کو زیر کر کے ان کے علاقے سلطنت غزنوی میں شامل کر چکا ہے، اسی طرح وہ مجھے بھی کسی وقت کر دے گا کہ میری اطاعت قبول کر دے۔ اس کے علاوہ مجھے اپنے دشمنوں سے محفوظ رہنے کے لیے ایک مجلس اور طاقتور دوست کی ضرورت ہے۔“

”اور وہ صرف سلطان محمود ہے۔“ وزیر نے کہا۔

”میرے دل میں جو بات آئی ہے وہ میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں۔“ ابوالعباس

نے کہا۔ ”دوئی کے رشتے باتوں اور وعدوں سے بچے نہیں ہو سکتے۔ میں نے ایک طریقہ سوچا ہے۔ وہ یہ ہے کہ میں سلطان محمود سے اُس کی بہن کاہ کاگی کا رشتہ مانگ لوں۔ وہ میرے بڑے بھائی کی بیوہ ہے۔ مجھے اچھی لگتی تھی، مگر میں مجھ سے شاید ایک سال بڑی ہے۔ کیا سلطان محمود مجھے یہ رشتہ دے دے گا؟“

”میں کچھ نہیں کر سکتا۔“ ابوالکوارث نے کہا اور ہنس کر بولا۔ ”کیا آپ نے یہ خطہ محسوس نہیں کیا کہ اس عورت نے آپ کے بھائی کو زہر دیا ہے تو وہ آپ کو بھی زہر دے سکتی ہے؟“

”نہیں۔“ ابوالعباس نے کہا۔ ”کاگی مجھے زہر نہیں دے سکتی۔“ اُس نے وزیر سے نگاہیں پھیر کر غلامیں دیکھا اور جذباتی سرگوشی کی۔ ”کاگی مجھے زہر نہیں دے سکتی۔“ وہ وزیر سے مخاطب ہو کر ذرا بلند آواز سے بولا۔ ”وہ جان گئی تھی کہ مجھے اُس کے ساتھ روحانی نگاہ پیدا ہو گئی ہے۔ میں اس کے خادمہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ وہ مجھ سے پیار کرتی تھی۔ مجھے پیار سے شزاہہ کہتی تھی۔... میں بتاؤں تو محترم وزیر بھائی کے مرنے کے بعد میں محسوس کر رہا ہوں کہ تجانی کی جدائی کو میں نے برداشت کر لیا ہے، کاگی کی جدائی ناقابل برداشت ہے۔“

”کیا آپ محبت کی خاطر کاگی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟“ سلطان محمود کے ساتھ دوئی قائم کرنے کے لیے با۔

”دونوں باتیں میرے سامنے ہیں۔“ ابوالعباس نے جواب دیا۔ ”لیکن غالب کاگی کی محبت ہے حقیقت یہ ہے کہ کاگی کو مجھ سے پیار تھا۔ وہ پاک محبت تھی۔ میں ایک بہن یا اچھی بھانجی کی ہوتی ہے لیکن اب صورت بدل گئی ہے۔ میں کاگی میں اب گھٹیل رہی گیا تھا کہ میری جیوٹی بیوی اکبری مجھ سے اراض ہو گئی تھی۔ اکبری کے باب الہامان کو آپ جانتے ہیں۔ ہماری دوج کا ایک سالار ہے۔ اُس نے مجھے کہا تھا کہ اکبری کو مجھ سے شکایت ہے۔ میں نے اپنے اس سرے کا تھا کہ وہ مجھ پر اور میرے بھائی کی بیوی پر ایک بے بیوہ الزام فائدہ کر رہا ہے اور وہ آئندہ ایسی جرأت نہ کرے۔“

میں نے اُس کے ماتھے پر جو نگین دیکھے تھے وہ اچھے نہیں تھے۔

”سلطان محمود کو ہندوستان سے واپس آنے دیں۔ وزیر نے کہا۔ آپ کی اس تجویز میں آپ کی محنت بھی شامل ہے اور ریاست بھی۔ آپ ابھی سوچیں میں بھی سوچوں گا۔“

یہ باتیں اُس وقت ہو رہی تھیں جب سلطان محمود کو گنیش کی برفی شکست سے دھچکا کر رہی تھی اور اُس کی وجہ جنگی طاقت جس کی وجہ سے ابوالعباس اُسے اپنا برادر نسبتی اور اتحادی بنا چاہتا تھا، وہ دیا سے جہلم میں ڈوب رہی تھی اور برف کے نیچے دفن ہو رہی تھی۔

اس سے چھ ماہ بعد کا واقعہ ہے کہ وزیر ابراہان کارث ایک روز ابوالعباس کے پاس گیا اور اُسے تنہا ہی بے جا کر کہا۔ ”غزنی سے ایک عجیب خبر آئی ہے۔ سلطان محمود ہندوستان سے ایسی بڑی شکست کھا کر آیا ہے کہ اُس کے ساتھ فوج کا دسواں حصہ بھی نہیں اور جو فوج آئی ہے وہ زخمی ہے۔ اب کے محمڈ کے ساتھ نہ سونے جو اہرات سے لے کر جسے اُتھاتی ہیں نہ ہندوستان کے جنگی قیدی۔ وہ اپنی جنگی قوت بہلا کر آیا ہے۔“

”میں اس کے باوجود اُس کی بہن کاہن کی کے ساتھ شادی کر دوں گا۔“ ابوالعباس نے کہا۔ ”آپ کو زندگی کا جو تجربہ ہے وہ مجھے نہیں لیکن آپ میری رائے دیکھیں گے کہ میں سلطان محمود کے شکست میں دوستی کا ہاتھ بڑھائوں گا تو وہ میرا دشمن و دشمنوں کا بھروسہ بن جائے گا۔“

”موتور جی سوزوں ہے۔“ وزیر نے کہا۔ ”شکست پر اُٹھنا افسوس کن ضروری ہے اور یہی طبع پرکھا جاسکتا ہے کہ آپ اُس کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔ آپ کا جانا ضروری نہیں ہے۔ جانتے ہیں کہ اندیشہ شادی کا بیٹھ بھی رُوں گا۔“

چند دنوں بعد وزیر ابوالکارث دولہا پیوں، دس بارہ محافظوں اور کالف سے لے کر ہونے پارانہوں کے ساتھ غزنی پہنچا۔ سلطان محمود کو المللغ ہوئی کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کا مدد آیا ہے تو سلطان نے اُسے اُسی وقت بلالیا۔

”خوارزم شاہ ابوالعباس مامون نے سلطان عالی مقام کی خدمت میں برادر اسلام بھجے تھے اُنھیں بھیجے ہیں۔“ وزیر نے کہا۔ اور دلی رنج کا اظہار کیا ہے کہ سلطان عالی مقام کو ہندوستان کی مہم میں بہت نقصان اٹھانا پڑا اور اگلی سہ ماہی خوارزم شاہ نے فرمایا ہے کہ خاندانے ذوالکمال نے سلطان کو جہاں اتنی فتوحات عطا فرمائی ہیں وہاں ایک شکست بھی اُسی کی دین ہے۔ سلطان غزنی کو اللہ تعالیٰ نے جو جو صلہ عطا فرمایا ہے، اس کے سامنے یہ شکست کوئی معنی نہیں رکھتی خوارزم شاہ ابوالعباس مامون نے فرمایا ہے کہ میری طرف سے کسی بھی قسم کی مدد اور کسی بھی قسم کے تعاون کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ بھائی مشکل کے دھت کام آتے ہیں۔“

”یہ میرے دہار کے آداب کے خلاف ہے کہ ایک بادشاہ کا وزیر میرے سامنے کھڑا ہو کر بات کرے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”آپ میرے برابر بیٹھ جائیں۔“

وزیر سلطان محمود کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا تو سلطان نے کہا۔ ”میں خوارزم شاہ ابوالعباس مامون کا مشکور ہوں کہ اُنہوں نے اُنس دقت دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے جب مجھے یہ خطرہ ہے کہ میرے حریف میری کمزوری سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اُن کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دینا اور کہنا کہ مجھے دوستوں کی ضرورت ہے لیکن میں مدد صرف اللہ

سے اٹا کر آہوں۔۔۔۔۔ مجھے خوارزم کے اندرونی حالات کے ساتھ دلچسپی ہے۔ ابوالعباس ابھی نوجوان ہے کہ وہ سمجھے کہ اہمیت رکھتا ہے کہ دیا سے زرافشان کے کنارے کھڑا کیا جاوے گا یا وہ اپنے امیر انگلیسین کی نیت کو سمجھتا ہے؟“

”اگر وہ نہیں سمجھتا تو میں جو ہوں۔“ ابوالکارث نے کہا۔ ”امیر انگلیسین کی نیت پر مجھے بھی شک ہے لیکن میں اپنی فوج پر بھروسہ ہے۔“

”جہاں تک میں جانتا ہوں، آپ کو اپنی فوج پر اتنا بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”فوج کیا بولتی ہے؟۔۔۔ سالاددن اور نائب سالاددن کو فوج کہتے ہیں۔ فیصلے اُن چند ایک آدمیوں کے جوتے ہیں اور فوج کو اُکھار کی طرح استعمال کیا جاتا ہے۔ حکومت کا نائب سالاددن برطانیہ جاتا ہے لیکن قوم کی نفرت فوج کے حصے میں آتی ہے۔ سالاددن کا بہنہ اہلیوں کی سزا یا بیسوں کو ملتی ہے۔ آپ۔“

کی خواہش نہیں جس کسی کے حرم کی زینت نہیں بننا چاہتی ہیں مگر بھی نہیں بننا چاہتی۔ جس کے بھائی کے شب و روز جہاد میں گزر رہے ہوں، وہ سن مکہ نہیں بنے گی۔ مجھے یہ بتائیں کہ ابوالعباس خوارزم شاہ کی تیسری بیوی بن کر اسلام اور سلطنت غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کی زوجیت کو قبول کر لوں گی۔

خوارزم ایک ایسا ملک ہے جس کی فوج جہاد میں استعمال کی جاسکتی ہے۔ سلطان محمود نے کہا۔ سلطان بادشاہیاں اور چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں گڑ رہی ہیں۔ ان میں سے دو تین کے حکمران متحد ہوتے ہیں تو صرف اس لیے کہ انہیں کسی طاقتور حریف سے خطرہ ہوتا ہے۔ اُن کا اتحاد اسلام کی خاطر نہیں ہوتا۔ یہ لوگ مسلسل لڑ جھگڑ میں اُکھے ہوئے ہیں۔ اور یہودی اور عیسائی قطعی پریل ڈال رہے ہیں۔ میں انہیں کفر کے خلاف متحد کرنا چاہتا ہوں خوارزم ایک طاقتور ملک ہے لیکن مجھے اطلاع ملی ہے کہ اس ملک میں کئی فتنہ سر اٹھ چکے ہیں۔ شاید ابوالعباس کو اس کا علم نہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ایسٹین اُسے میرے خلاف کرے۔ خوارزم کی فوج ان حالات میں غزنی پر چڑھ دے گی جب میں فوج کی کمی پوری کر رہا ہوں میں اُن کا مقابلہ اب بھی کر سکتا ہوں لیکن یہ فائدہ جگلی ہوگی۔ یہ دو مسلمان ملکوں کی جگہ ہوگی جس میں اسلام کی طاقت خالص ہوگا اور اس کا فائدہ کفار کو پہنچے گا اور اس کا فائدہ ہندوستان کے ہندوؤں کو بلکہ ہندوؤں کے باطل مذہب کو پہنچے گا۔

”اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں ابوالعباس کی زوجیت میں جا کر اُسے ایسٹین اُن کے ہندو پڑوسیوں سے بچا سکتی ہوں تو مجھے اُس کی زوجیت قبول ہے۔“ کاہکی نے کہا۔

”یہ تم بہتر سمجھتی ہو کہ جب تم اُس کے بھائی کی بیوی نہیں تو ابوالعباس پر تمہارا کتنا کچھ اثر تھا۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”اور تمہارا اُس کے ساتھ کوئی رابطہ تھا؟“

”اُس وقت وہ میرے زیر اثر تھا۔“ کاہکی نے کہا۔ ”میرے دل میں اس کا بے اثر تھا اور وہ میرے پیار کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ زیادہ دقت میرے پاس گزرتا تھا۔ اُس کا باپ قتل ہو گیا تھا اور اُس کی ماں گرہی تھی۔ وہ تھا تو شہزادہ گرشامانہ جاہو

کو نظر سلاسل پر رکھنی چاہئے۔“

کچھ دیر اُن کا تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ وزیر تجربہ کار اور دانشمند تھا۔ اُس نے

شادی کا پیغام دینے کا موقع پیدا کر لیا۔

”سلطان غزنی!۔“ وزیر نے کہا۔ ”ابوالعباس ماموں نے منکلی پیش کش تو آپ کو کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ خود منکلی طلبہ ہیں۔ انہیں فوری طور پر کسی منکلی ضرورت نہیں۔ وہ دوستی کے خواہاں ہیں۔ انہیں ایسا دوست چاہیے جو انہیں دقت پر دھوکہ نہ دے۔ ایسا دوست آپ کے سوا اور کونسی نہیں ہو سکتا۔ اس دوستی کے دائم استحکام کے لیے انہوں نے خواہش ظاہر کی ہے کہ وہ آپ کی بہن کاہکی کے ساتھ شادی کر لیں جو اُن کے بڑے بھائی کی بیوہ بھی ہے۔ انہوں نے پوچھا ہے کہ سلطان عالی مقام اُن کی عرضداشت کو قبول فرمائیں گے؟“

”اس کا فیصلہ کاہکی خود کرے گی۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”میں کسی کی دوستی کو بگاڑنے کے لیے اپنی بہن کو اس طرح استعمال نہیں کروں گا میں نے مشورہ دے سکتا ہوں خوارزم اور غزنی کی دوستی کی اہمیت بتا سکتا ہوں، لیکن اُن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا کچھ دنوں بعد آپ مجھ سے جواب لے سکتے ہیں۔“

ابوالعباس اُس وقت اچھا لڑکا تھا جب وہ خوارزم کا بادشاہ نہیں تھا۔ سلطان محمود کو اُس کی بہن کاہکی سے جواب دیا۔ اب وہ جوان ہے اور بادشاہ بھی۔ اب دیکھنا بڑے گا کہ اُس میں کیا تبدیلی آئی ہے۔

”اُس کے پیغام کا جواب تم دو گے۔“ سلطان محمود نے کہا۔ ”فیصلہ میرا نہیں ہوگا۔ میں نہیں بتا چکا ہوں کہ میں نے ابوالعباس کے وزیر کو یہ کچھ کرخصت کر دیا تھا کہ میں اپنی بہن پر اپنا فیصلہ نہیں ٹھونسوں گا۔“

”لیکن مجھے آپ کے مشورے کی ضرورت تو ہے۔“ بہن نے کہا۔ ”اگر آپ سمجھتے ہیں کہ مجھے خوارزم شاہ کے ساتھ شادی کر کے غزنی کو کوئی فائدہ پہنچے گا تو میں اُس کے ساتھ شادی کر لیتی ہوں۔ میرے دل میں کسی بادشاہ کے ساتھ شادی کرنے

۱۲۰۰ء میں سلطان محمود کی رائے کے مطابق اس کے دو بیٹے در سالار۔ جو بعد ازاں کدالائی اور
الطاش میں کر رہے تھے۔ ان دونوں کے ساتھ مخالفین کے علاوہ در اور فوجی کمانڈر تھے
جو سلطان محمود کے محکمہ جاسوسی اور سرخسانی کے اعلیٰ حاکم تھے۔

ضیافت میں خوارزم کے صوبہ بنائے گا گورنر الگ تھے۔ بنی تھا۔ ابو الباس (اس کی اس)
فوج کا سالار خورشید بھی تھا جو خوارزم کے ایک بڑے شہر پر اسپیہ بن گیا۔ اور وہ
سالار ابو اسلم بھی تھا جو اس سالارن کا سر تھا۔ ان دونوں کے چہرہ۔ ان دونوں کا
ساتھ تھے۔ وہ دونوں اکٹھے بیٹھے تھے۔ وہ سلطان محمود کے زمانہ۔ اور اس
کا۔ اس نے اس سے دور بیٹھے تھے۔ ان کے پیچھے فوج کے دو دنوں کی مکمل فوج
تھے جو جاسوسی اور سرخسانی کے سربراہ تھے۔ ان دونوں کو سلطان محمود نے خاصاً تعین
کے لیے بھیجا تھا۔

۱۲۰۰ء میں محمود میری بنی کے ساتھ شادی کر کے ابو الباس (امور) پر اور اسے راست
بن گیا۔ سلطان محمود نے انہیں کہا تھا۔ "جو کتا۔ ابو الباس"۔ اس پر راست
راست بن ہی جاتے لیکن آپسی نے اپنے ذرائع سے وہاں۔ اسے اندلی اندلیں دور
ملاقات معلوم کر کے مجھے بتایا ہے کہ خوارزم کے ابو الباس (امور) نے سالاروں کے نام
جو ان کو پاکر رہا ہے۔ کمانڈر شہر تھا رہی۔ ابو الباس (امور) کے ساتھ
یہ نہیں کرنا چاہئے تاکہ تم الطاش اور الطاش کے ساتھ نہ ہو۔ شہر میں جاسوسی
کے اور اسے آپ کو سرحد کے اجراء کر کے۔ وہاں در اور یہاں دونوں کے کچھ
ہوں گے۔ گرتا رہی اور اس کی گیلی یہ کہی جو وہاں در اور کھیل جا رہا ہے۔ یہ وہاں کے
تین آدمیوں کے ساتھ۔ ان کے طرف سے۔ ان کی آس۔ ان کو تو ان کے انداز
اور ان کی حرکتیں دیکھنا اور یہ جاننے کی کوشش کرنا کہ ان کے ارادے کیا ہیں۔ ان میں
ایک الگ تھے۔ ابو الباس (امور) اور اس کے ساتھ۔ یہ دونوں سالار ہیں۔
ان دونوں کو اس سے زیادہ کچھ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ خود ہی اپنے
جاسوسی سے معلوم کر کے تھے کہ خوارزم میں کوئی بہت بڑا خطرہ پرورش پا رہا ہے۔ چنانچہ
جرجانیہ کی مخالفت میں وہ تیار ہو کر اس کو شک نہیں ہو گا تھا کہ یہ دونوں فوجی اس اور اسے

جلال سے جذبات کے بیس نہیں کچھ سکتی۔ وہ کچھ اپنی ان بھی اور اس میں نہیں سہی
کرتا تھا۔ اس کی شادی ہوئی پھر اس کی مدد میں ہو کر وہ وہاں تنگیں کھانے سے
حاصل کیا کرتا تھا۔ اس کا بھائی مرگیا اور اس میں ماہ بعد اس کے گھر سے نصرت ہوئی
تو آپ تصور میں اس کے کہ کسی طرح مدد کیا۔ اپنے بھائی کی موت پر وہ اتنا نہیں دیا
تھا۔

"پھر تم اسے اپنے اپنے میں ڈھال سکتی ہو۔ سلطان محمود نے کہا۔ اس کے
دو میں صرف لڑائی کی نہیں اسلام کی محبت پیدا کرنی ہے۔ مجھے اپنی سلطنت کو خطروں
سے بچانے کی ضرورت نہیں ہے۔

اگر اس کا راز پھر نہیں گیا تو میں اسے اپنے ساتھ میں ڈھال سکتی ہوں۔ کچھ
نے اسے اس کے عزم اور اسلام کا احساس کے لیے اپنے جذبات اور اپنی
ذمہ داری وقف کر دینا چاہتے ہیں۔ میں خوارزم کی فوجی طاقت کا دھاراکتاف کی طرف موڑنا
گا۔ میں آپ کے ساتھ جہاد میں نہ کر سکتا لیکن میں آپ کے جہاد میں جان ڈال
سکتا ہوں۔ آپ کو طاقت دے سکتی ہوں۔"

سلطان محمود نے اسی مددگار کے ساتھ ابو الباس (امور) کو پیغام بھیج دیا کہ
وہ سلطان کی بن کے ساتھ شادی کر سکتا ہے۔
ایک مہینے کے اندر اندر شادی ہو گئی۔

اور یہ شادی اتنے بڑے طوفان کا باعث بن گئی جس نے عالم اسلام کو لڑا لڑا
مرف زمین پر لڑائی۔ جو سلطان محمود نے لڑائی میں لڑا جس میں دونوں
فریقہ اکابر لڑائی میں لڑا۔ اس ہولناک جنگ سے پہلے ایک ڈرامہ کھیل گیا جس کی
مدد ان کی خیریت پر ہی کر دی گئی۔

یہ بہت بڑا فیصلہ تھا۔ خوارزم کے دار الحکومت جرجانیہ میں جرجانیہ نے دن کا سفر
بازار لڑائی تھا۔ اس نے اپنے تمام تر جہاد کے قلعے کی دیواروں اور شہر کا
میں برس پر کھیر لیتے ہیں۔ دوسری راتوں کے ساتھ اسے کچھ جہاد میں موجود تھے اور

ایک اور بت جس پیدا ہوا (دراحد)

یہیں گے اپٹگین؟
”وقت آنے تک اپٹگین نے کہا۔“ خوارزم میں غزنوی آئے تو ان کی لاشیں
بھی نہیں ملیں گی۔“

”اس کا اختتام پہلے سے ہونا چاہیے۔“ سالار خرمطاش نے کہا۔
”فوج آپ کی کمان میں ہے۔“ امیر اپٹگین نے کہا۔ ”اے اپنے اثر میں
ہے۔“

”کیا میں یہ باتیں بیان کرنی چاہتا ہوں؟“ ابواسحاق نے کہا۔
”گھبراہٹ نہیں۔“ خرمطاش نے کہا۔ ”مجھے والے دنوں ہماری زبان نہیں سمجھتے۔“
”دائیں بائیں آواز جاسکتی ہے۔“ اپٹگین نے کہا۔ ”ابطحاض غریبی ہے۔۔۔“
ابواسحاق ایک آپ کی بیٹی کا ابوالعباس پر کوئی اثر نہیں؟
”ہے تو ہی۔“ ابواسحاق نے کہا۔ ”لیکن اب کیسے رہے گا محمود کی بہن بہت
چالاک عورت ہے۔ اب میری بیٹی کا آخر ختم ہو جائے گا۔“

”مجھے بیٹھے ہوئے دنوں آدمی ان کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔“ اپٹگین اور
اُس کے ساتھیوں نے جب بھی کچھ دیکھا، ان دنوں کو گھوڑوں کے کھیل تماشا میں
نوپایا گھوڑوں کے دوڑنے کا اور بہانوں کی چرخ دیکار کا شہر بہت زیادہ تھا۔ سلطان محمود
کے یہ دن حاکم اپٹگین اور دنوں سالار مل کر، باتیں سننے کی کوشش کرتے رہے
مگر انہوں نے موضوع بدل لیا تھا۔ ان کی باتوں سے یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ اس شادی
سے خوش نہیں اور وہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کریں گے۔
جس کا ہر گام آدمی رات کو ختم ہوا۔

امیر خرمطاش اپٹگین سالار ابواسحاق اور خرمطاش ایک کمرے میں بیٹھے تھے۔ دھواں
آہستہ سے کھلا اور ایک عورت اندر آئی جس کا چہرہ نقاب میں تھا۔ اندر آتے ہی اُس
نے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ وہ ابوالعباس کی بیوی ابواسحاق کی بہن ابجوری تھی۔
”رات کی باتیں معلوم ہو گئی ہیں؟“ ابجوری نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”گاہ کا کبھی

سراغ ساں کُن کی نظریں زمین کی تہوں میں بھی اور انسانوں کے سینوں کے اندر بھی
چل جاتی ہیں۔ وہ دھیلے ڈھالے جموں والے حق سے تاجر گتے تھے۔ دنوں اپٹگین
ابواسحاق اور خرمطاش کے پیچھے بیٹھے تھے۔ شعلوں کی مدد سے گھوڑے شروع ہونے
والے تھے۔ گھوڑے سواری کے کرتب دکھائے جانے تھے۔ تیغ زنی کے مظاہر میں اور
کشتیوں کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔

ابوالعباس ہمن کی آمد کا اعلان بڑے مزاج سے ہوا۔ ابوالعباس گاہ کا کبھی
کے ساتھ آ رہا تھا۔ کبھی درازت اور خوبصورت اور جوان تھی۔ اُس کی چال میں شاہ جلال
اور انداز میں تقلید تھا۔ ابوالعباس بھی خوب تھا۔ ان دنوں کے پیچھے ابوالعباس کی پہلی
دوبیاں آ رہی تھیں۔

”سلطان محمود نے اپنی بہن کے عوض خوارزم شاہ کو نہیں پورے خوارزم کو خریدنے
کی کوشش کی ہے۔“ خوارزم کے سالار ابواسحاق نے جو ابوالعباس کا سر بھی تھا،
ظہر کیا۔

اپٹگین نے دیکھ دیکھ دیکھ دیکھ دیکھ ہوئے تھے جو سلطان محمود کی جاسوسی
کے نظام کے اعلیٰ حاکم تھے۔

”آپ کہاں سے آئے ہیں؟“ اپٹگین نے مسکرا کر ان سے فارسی زبان میں پوچھا۔
دنوں مسکرائے اور سر ہلائے۔ یہ اشارہ تھا کہ ہم آپ کی زبان نہیں سمجھتے۔ حالانکہ
ان دنوں کی مادری زبان فارسی تھی۔ اپٹگین، خرمطاش اور ابواسحاق نے باری باری
ان سے اشاروں میں پوچھنے کی کوشش کی تو ایک نے کہا۔ ”کرک تاغ۔“ یہ شرق میں بہت
دُور ایک پہاڑی علاقہ تھا جس کی زبان کچھ اور تھی۔

”یہ ہماری زبان نہیں سمجھتے۔“ اپٹگین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ میں
میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔۔۔ ان ابواسحاق آپ کی کر رہے تھے؟

”میں کہہ رہا تھا کہ یہ شادی غزنوی اور خوارزم کی ہوئی ہے۔“ ابواسحاق نے کہا
”سلطان محمود اور اُس کی بہن اس نوجوان ہمن کی انگلیوں پر بنچائیں گے اور اسے پتہ
ہی نہیں چلے گا کہ خوارزم پر غزنوی کا قبضہ ہو گیا ہے۔ کیا آپ اس عورت کو برداشت کر

میرے باپ کا نہیں، خدا کا ہے... کیا تم اس سے انکار تو نہیں کرو گے؟ نظر آگئے والے
نیلے بُت فیکسوں کا اور باطل کو مذمت والوں کا شہر کہا کریں گی؟ اور کیا تم اس سے انکار
کرو گے کہ وہ اپنے ارد گرد کی تمام مسلمان مائیں اور ریاستوں کے حکمرانوں کے دلوں میں
کاشا بن کر اتر چکا ہے اور اسلام کی تاریخ کے اس درخشاں باب پر سیاہی اندینا چاہتے
ہیں؟

”مجھے انکار نہیں“۔ ابوالعباس نے کہا۔ ”مذکورہ رتبہ جو یہ ابھی پہنچ رہے ہیں
تم نے ان باتوں کے لیے آج کی رات کیوں منتخب کی ہے؟ کیا تم میرے درمیانوں اور
میرے اتنے پیارے خواہوں کو آج ہی رات میلن جگہ میں لے جانا چاہتی ہو؟
”اں... آج ہی رات“۔ کاہ کاہی نے کہا۔ ”ازدواجی زندگی کی پہلی رات
بڑی مقدس ہوتی ہے ابوالعباس! یہ رات منارے لیے نئی سنیں، ادیر رات میرے لیے
بھی نئی سنیں۔ میری سنیں وہ ماؤں اور خواہوں سے محروم نہیں کر دیں گی۔ اگر منارے خواہ
میرے وجود سے حسین میں تو میں ان کا سن یا مال نہیں ہونے دے دوں گی۔ مجھے دل کی
بات کہنے دے دو اور مجھے اپنے دل کی بات سمجھ لینے دے۔ ابھی ساری رات باقی ہے۔ ابھی
ساری طرح کی باتیں باقی ہیں۔ مذہبی دیر کے لیے میری سن لو...“

”آج کی رات جو ہم دونوں کے لیے ستر تون اور دماؤں کی رات ہے، غزنی کی
بزراد ماؤں اور بزراد بنوں کے لیے بڑی ہی اُماں اور فغان کی رات ہے۔ وہ اُن
بیٹوں اور اُن بھائیوں کے انتظار میں جاگ رہی ہیں جو کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ اللہ بکر
کے نعرے لگاتے بندوستان گئے تھے اور حق اور باطل کے خنزیر تصادم میں پس گئے۔
وہ خدا کے حضور سر فرود ہوئے کہ وہ جادھر گئے مسجدیں آباد رکھیں اور بُت خلتے زمین
سے ملا دیئے۔ وہ اللہ کے عظیم پیغام پر قریاں ہو گئے۔ میں آج رات کی ستر میں اُن کی
مذکر کرتی ہوں...“

”اور پھر انہیں یاد کر دو جو تخت و تاج کے ہوس کاہوں کی ہوس کی بھینٹ چڑھ
گئے۔ ہماری سر زمین خانہ جنگی کے خون سے لال ہو گئی تھی، اور اگر آج رات تم میری
باتیں غور سے سنیں تو گے تو یہاں بھائی کی تلوار بڑی، اگر مردان کاٹھا رہے گی۔ بھائیوں کی

کی جو خادرات کے لیے مقرر کی گئی تھیں، میں نے اُسے پسینہ اتھو میں لے یا تھا۔ رات
اُس نے مجھ کو اُس کے دروازے کے اتمہ کان لگائے رکھے تھے۔ اُسے کوئی دماؤں سے
بنا نہیں سکتا تھا کیونکہ اُسے دروازے پر ہی موجود رہنا تھا۔ اُس نے دروازے کا ایک
کوڑھ مارا کھلا رکھا تھا کچھ دیر بعد اُسے اندر بلا گیا تھا۔ اُس کی موجودگی میں بھی ابوالعباس
اور کاہی باتیں کرتے رہے تھے۔ سب سے پہلے میں آپ کو یہ بتا دیتی ہوں کہ کاہ کاہی
صرف یو بی بن کر نہیں آئی۔ وہ ایک پیغام اور ایک پھندہ بن کر آئی ہے۔ ابوالعباس
بھی اُسے صرف یو بی نہیں سمجھا، اُسے اپنے دل کی جگہ اور سراپا عشق کہتا ہے۔ خادرات نے
جو باتیں بتائی ہیں وہ نہیں آپ کو سنا دیتی ہوں۔“

کسی بادشاہ اور ملک کی رات کی خادرات کے لیے رات کی باتیں معلوم کرنا کوئی مشکل
کام نہیں تھا۔ خادرات نے الجوری کو جو باتیں بتائیں وہ کچھ اس طرح تھیں۔

”ابوالعباس! کاہ کاہی نے کہا۔ اگر تم نے میرے ساتھ حرف اس لیے
شادی کی ہے کہ تمہیں میری یو بی کی ضرورت تھی تو مجھے بتا دو۔ میں تمہاری محبت
کو سینے میں دفن کر کے اس پر آنسو بہا لیں گی۔“

”مجھے تمہاری ضرورت تھی“۔ ابوالعباس نے کہا۔ ”میرے لیے یو بیوں کی تو
کمی نہیں... کیا تم جب میرے بھائی کی یو بی تھیں تو کبھی مجھے اسی طرح چاہتی رہی ہو؟
”وہ محبت کچھ اندھنی ابوالعباس! کاہی نے جواب دیا۔ ”ایک بُت فیکس
سلطان کی بہن اپنے خاندان کو دھوکا نہیں دے سکتی۔ تم مجھے اچھے لگتے تھے۔ تمہاری
عادیں اچھی لگتی تھیں۔“

”تو میں یہ سمجھوں کہ تم نے میری زندگی اس لیے قبول کی ہے کہ میں تمہیں
اچھا لگتا تھا؟“

”صرف اس لیے نہیں“۔ کاہ کاہی نے کہا۔ ”جس طرح تمہارے لیے یو بیوں
کی کمی نہیں اسی طرح میرے لیے بھی خادرات کی کمی نہیں تھی۔ سلطنت غزنی میں ایک
سے ایک خوبصورت اور بہادر جوان تھا لیکن شادی و زوجیت قبول کرنے کی ایک وجہ
اور بھی ہے۔ میں منارے لیے صرف محبت نہیں لاتی، ایک پیغام بھی لاتی ہوں۔ یہ پیغام

— کاہ کا بچی نے کہا — ” یہ یہودیوں اور عیسائیوں کا خفیہ ہاتھ ہے اور اس میں کڑا سلی بھی شامل ہیں جن کے مرکز اور سرعز کو میرا بھائی ختم کر چکا ہے۔“

”کاہ بچی! — ابوالعباس نے گھبرا کر کہا — ”میں اسی ٹروپس قتل نہیں ہونا چاہتا۔“

”کسو میں قتل ہونا چاہتا ہوں لیکن اللہ کی راہ میں۔“ کاہ بچی نے کہا۔ میرا بھائی ہندوستان میں جا کر قتل ہونے کی سلسل کو شش کر رہا ہے۔ میں جا رہی ہوں بلکہ خدا چاہتا ہے کہ تم میرے بھائی کے مدد میں مدد ملو۔ میں اپنا سہاگ ترانہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ تم اس کو کہ سلطنت غزنی کے ساتھ اتحاد کرو۔“

”آج کل سلطان کو ایک طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔“ ابوالعباس نے کہا۔ ”اس کی جنگی طاقت بہت کمزور ہو گئی ہے۔“

”یہ غلط ہے۔“ کاہ بچی نے کہا۔ ”غزنی کی جنگی طاقت اتنی کمزور نہیں ہوئی جتنی تم سمجھتے ہو۔ غزنی میں خاصی فوج موجود ہے۔ ہندوستانوں کے دستے بھی

میں جنہیں ہندوستان میں نہیں لے جایا جاتا۔ انہیں یہاں لڑانے کے لیے تیار کیا گیا ہے۔ وہ جلد سے پاس بہت خوش ہیں اور اسلام قبول کرتے جا رہے ہیں سلطنت

غزنی سے ہزار ارض کار عارضی طور پر رفت میں شامل ہو گئے ہیں، اور جو کمی ہے وہ جلد سے پوری کی جائے گی۔ لہذا دل سے یہ خیال نکال دو کہ سلطان محمود کو اپنی سلطنت

کے دفاع کے لیے کسی طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔ البتہ تمہیں ایک مخلص اور طاقتور اتحادی کی ضرورت ہے۔“

ابوالعباس کمرے میں شلنے لگا کچھ دیر سوچ کر بولا۔ ”میں تمہارے بھائی سے اتحاد کروں گا لیکن اُس کی اطاعت قبول نہیں کروں گا۔ اگر اُس نے کہا کہ خلیے

میں اُس کا نام لیا جائے تو اس کی اجازت نہیں دوں گا۔... کاہ بچی! میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ تمہاری بہت کے علاوہ تمہارے ساتھ شادی کرنے

کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ میں اندرون اور بیرون خطرات میں اس کا گھر چکا ہوں کہ مجھے تمہارے بھائی کی مدد کی ضرورت ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ مدد سنی کا

حق ادا کرے گا۔“

کمانوں سے نکلے ہوئے تیر بھائیوں کے بیٹوں میں اترتے رہیں گے۔ آج کی رات مجھے اُن کی بھی باتیں یاد آ رہی ہیں جو اپنے بادشاہوں کی خواہشوں پر کٹ مرے تھے۔ تم ابھی جوان ہو ابوالعباس! میں ابھی جوان ہوں۔ آؤ، تھوڑی سی دیر جوانی کے اُبال کو اور عرصے کے جذبات کو الگ رکھ کر دو چار باتیں کر لیں۔... ”خاندان نے ابھی تک غزنی پر حملے کی کیوں نہیں سوچی؟ متبادر باب کیوں قتل ہو گیا تھا؟ کیونکہ اُس نے غزنی پر قبضہ کرنے کی نہیں سوچی تھی۔ اُسے کہا گیا تھا۔ وہ نہ مانا اور قتل کر دیا گیا۔ تمہارے بڑے بھائی کا دامغ خراب ہو چلا تھا لیکن اُس نے میرے ساتھ شادی کر لی۔ میں نے پہلی رات اُس کے ساتھ بھی باتیں کی تھیں۔ یہ باتیں اُس کے دل میں اتر گئیں۔“

”کیا تم نے بھی سنا تھا کہ میرے بھائی کو تمہارے بھائی سلطان محمود نے زہر دلوایا تھا؟“ ابوالعباس نے کہا۔ اور زہر دلوانے کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔“

”کیا تمہیں اس جھوٹ پر یقین آ گیا تھا؟“ کاہ بچی نے پوچھا۔ ”مجھے شک تھا۔“

”شک بھی نہیں ہونا چاہیے تھا۔“ کاہ بچی نے کہا۔ ”اپنی فوج سے چار پانچ گنا زیادہ فوج پر لڑنے والے سلطان کسی کو نہ ہر نہیں دیا کرتا۔ اُسے تمہارے بھائی کی موت کی ضرورت ہوتی تو وہ یہاں خود آتا۔ جبراً جانے کی اینٹ سے اینٹ بکادیتا اور تمہارا بھائی اُس کے قید خانے میں پڑا ہوا ہوتا۔ میں تمہیں یہ کہہ رہی تھی کہ تمہارے بھائی نے میری باتوں کا اثر لیا اور اُس نے غزنی کے ساتھ دشمنی مول نہ لی۔ یہ شک مجھے بھی ہے کہ تمہارے بھائی کو ایسا زہر دیا گیا تھا جو آہستہ آہستہ بیماری کی صورت میں ظاہر ہوا اور وہ مجھے یہ کہہ کر گیا۔ اگر اُسے زہر ہی دیا گیا تھا تو اُن لوگوں نے دیا تھا جو غزنی اور خوارزم کو لڑنا چاہتے تھے۔“

”وہ کون ہو سکتے ہیں؟“ ابوالعباس نے پوچھا۔

”وہ ہیں تو مسلمان لیکن ان سازشوں اور خاندانی جنگی سے مجھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے۔“

کا زیادہ تر حصہ ہزار اسپ میں اور میرے پاس بجا رہا ہے۔ اس فوج کو اپنے اثر میں لانا ہے۔۔۔۔ مجھے سمجھئے۔۔۔ میں شاید کوئی انتظام کر لوں گا۔ خانہ جنگی کے لیے فوج کو کوئی گھاگ استاد ہی تیار کر سکتا ہے۔“

خوارزم کے دار الحکومت جرجانیہ سے پچاس میل بد جنوب میں دیلے کے کنارے ہزار اسپ بہت بڑی چھادی تھی۔ وہاں فوج ایک مدت سے فارغ پڑی تھی۔ جنگ و جہل کا زمانہ تھا۔ خوارزم کی اس فوج نے رسوں سے کوئی لڑائی نہیں لڑی تھی۔ کمانڈروں اور سپاہیوں کے دماغ فارغ تھے۔ ان کے شب و روز سنی مذاق، گپ بازی اور بیکار مشاغل میں گزر رہے تھے۔ فوج کا جہان مذہب کی طرف کھم سی تھا۔ ایک مذہب ایک فخر پس کی واضح سیادہ سیدہ تھی، اور جو کندھوں سے پادوں تک لیے کرتے ہیں وہی ملوس تھا جس کا رنگ بزم تھا، فوجیوں کی بارکوں کے قریب سے گزرا۔ اُس نے سر پر بزرگ کا حاذی لیٹ رکھا تھا۔ حائلے پر سونے والوں کی قبعاں لٹکی ہوئی تھیں۔ حائلے کے علاوہ ایسی ہی سیماں جن کے حائلے کے کئی رنگ تھے، اس کے گلے میں بڑی بھولی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں لمبا عصا اور دوسرے ہاتھ میں ایک کتاب تھی۔ وہ دھاک مارتا بلند آواز سے بولتا جا رہا تھا۔ لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ۔ اس کے ساتھ ہی وہ عساذر سے زمین پر پٹھوٹا تھا۔ فوجیوں نے اس قسم کا فخر کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سپاہیوں کے ایک جوم نے اسے گھیر لیا۔ وہ رگ گیا اور آسمان کی طرف منہ کر کے بلند آواز سے بولا۔ ”دیا کے کنارے ٹوب جائیں گے۔ بہار پھٹ جائیں گے۔ آسمان آگ برسا ئے گا۔۔۔ لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ۔“

اُس نے اپنے گرد گھمڑے سپاہیوں کی طرف نہ دیکھا اور ایک طرف چل پڑا۔ اُس نے لا الہ الا اللہ کے دھاکوں کے ساتھ عساذر میں پراہا تو سپاہیوں نے اُسے راستہ دے دیا بعض سپاہی اس کے پیچھے چل پڑے۔ ایک سپاہی نے اس کے ہاتھ میں چاندی کا ایک درہم دے دیا۔ چند اور سپاہیوں نے اسے دینے کے لیے جیبوں سے

”میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں کہ وہ دعوتی کا حق ادا کرے گا۔“ کاہکی نے کہا۔ ”لیکن اصل ضرورت یہ ہے کہ اگر تمام مسلمان امارتیں کفر کے خلاف متحد نہ ہوں تو خوارزم اور غزنی اس محاذ پر دوش بدوش لڑیں۔“

”ایسا ہی ہوگا۔“ ابوالباس نے کہا۔

ابوالباس نے رومانی اور جہاں باقی شروع کر دیں۔ خادمہ نے الجوری کو بتایا کہ وہ دیکھ تو نہیں سکتی تھی، اُن کی باتیں سن سکتی تھی۔ خادمہ کا خیال تھا کہ اتنی خشک باتیں کرنے والی اور جہاد کا عقادینے والی عورت رومانی باتوں اور حرکتوں میں کوری ہوگی مگر اُس کی سہمی بھی رومان انگیز تھی اور باتیں ایسی کہ ابوالباس پر زلہ طاری ہو گیا جو گا۔ کاہکی کھٹکندی لڑک بگم گئی۔ خادمہ نے بتایا کہ اُس کی باتیں تو بہ شگن تھیں۔

اینگلیں نے خادمہ کو دینے کے لیے الجوری کو سونے کے دروینار دیئے اور اُسے کہا کہ وہ ان دونوں کی ہر ایک بات خادمہ سے پوچھتی رہے خواہ کوئی بات کتنی ہی غیر اہم کیوں نہ ہو۔

الجوری چلی گئی تو اینگلیں نے ابو اسلمی اور خمرطاش سے کہا۔ ہمارا خیال یہ نکلا۔ یہ شادی بلا مقصد نہیں ہوئی۔“

”یہ اتنا دیکھ نہیں ہوگا۔“ ابو اسلمی نے کہا۔ ”خوارزم شاہ ابوالباس کو جوانی اور رومانوں نے اندھا کر رکھا ہے۔ ہم اس کے وزیر ابوالمکارث کو ہاتھ میں لیں گے۔“ ابوالمکارث بہت خطرناک آدمی ہے۔ اینگلیں نے کہا۔ اُس کے ساتھ کوئی بات نہ کرنا۔ وہ ماسونی خاندان کا پروردہ اور وفادار ہے۔ جو کچھ کرنا ہے تب خود کرنا ہے۔ اگر ابوالباس زن مردن گیا تو اسے زیادہ دن زندہ نہیں رہنے دیا جائے گا۔ ابوالباس یہ کہ ہے۔ وہ کچھ نہیں سکا کہ محمود نے نہیں دے کر خوارزم کا سودا کیا ہے۔ ”بھیس فوج کو ہاتھ میں لینے کی ضرورت ہے۔“ سالار خمرطاش نے کہا۔

”فوج خوارزم شاہ کی وفادار ہے۔“

دارالحکومت جرجانیہ میں فوج بکھڑی ہے۔“ اینگلیں نے کہا۔ فوج

دوسرے دن خبر پھیل گئی کہ فیر کو دریا کے کنارے دیکھا گیا ہے جہاں اُس نے چھوٹا سا ایک خیمہ لگا رکھا ہے چند ایک سپاہی دریا کو چل دیئے۔ انہوں نے وہاں چھوٹا سا ایک خیمہ دیکھا جس کے قریب تین چار آدمی بیٹھے تھے سپاہی ان کے قریب چلے گئے خیمے کے اندر سے دھلکے صبی آدازیں آ رہی تھیں۔ لا الہ الا اللہ۔ لا الہ الا اللہ۔۔۔ خون کا طوفان ہے۔ ملک لو۔ ملک لو۔

بہر جو آدمی بیٹھے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ دریا ت بھر میاں بہہ رہی ہے اور فیر ان کا دریا میں ڈبو کر اس کی گہرائی دیکھتا رہا ہے۔ ان آدمیوں نے فیر کے پاؤں چھو کر پوچھا کہ کیا ہونے والا ہے فیر نے آسمان کی طرف دیکھا تو تین ستارے اُٹھنے لگے اور شرارے بکھرتے بہت دور دور جا پھٹے فیر نے منہ اوپر کیے ہوئے کہا۔ ابھی دم تہ ہے باز آجاء۔ خون کی خفیاں کوروں لو۔

ان آدمیوں نے سپاہیوں کو بتایا کہ وہ اس فیر کی کچھ خدمت کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ ان کی طرف دیکھتا ہی نہیں۔ سپاہی وہاں کھڑے فیر کی آدازیں سنتے رہے اور ان آدمیوں کو فیر کے متعلق جو کچھ معلوم تھا پوچھتے رہے اور فیر ان کے لیے خدا کا نام پکارتا رہا۔ یہ سپاہی جب بارگاہ میں گئے تو انہوں نے فیر کے متعلق کچھ نئی باتیں بتا کر منہ پھیلا دی۔ اُس روز کے بعد فیر کا چھوٹا سا خیمہ سپاہیوں اور شہر کے لوگوں کے لیے زیارت گاہ بن گیا۔ وہ وہاں جاتے اور خیمے کے سامنے کھڑے ہو جاتے۔ خیمے کے اندر فیر قرآن کی آیات بلند آواز سے پڑھتا اور لکارتے لگتا۔ خون کا طوفان آ رہا ہے۔ انسان انسان کو کھاتے گا۔۔۔ بادشاہ عورت کا غلام ہو گیا ہے۔

سلطان محمود غزنوی کے وہ دو حکم جو اس کے نظام جاسوسی اور سرِاغر سالی کے سرِاگر تھے۔ سلطان محمود کو بتا چکے تھے کہ انہوں نے ابوالعباس کی شادی کے جشن پر امیر الکبیر، سالار ابوالاسحاق اور سالار خرمشاک کی باتیں سنیں تھیں اور ان باتوں کی نیت ٹھیک نہیں۔ اس جشن کو ادا ہوا تین مہینے گزر گئے تھے سلطان محمود نے ان دونوں سے کہا کہ ابوالعباس کے محل میں ادھر جاؤ جہاں میں اپنے چند ایک کمرہ کار آدمی

درہم لکائے۔ وہ اسے بھکاری فیر کچھ بہے تھے لیکن فیر کے ہاتھ میں جو درہم تھا وہ اُس نے دانٹوں میں لے کر دھرا کر دیا اور اسے ہا میں اچھال کر دھڑ بھٹک دیا۔ باقی سپاہیوں نے جیسوں سے لکائے ہوئے درہم اپنی جیسوں میں ڈال دیے۔ اُس کی اس بے نیازی سے سب مرعوب ہو گئے۔

دو آدمی تیز تر چلے آ رہے تھے۔ انہوں نے سپاہیوں کے جوم کو روک لیا۔ ان میں سے ایک نے سپاہیوں سے کہا۔ تیرے پریشان نہ کرنا۔ اسے پیسے بھی نہ دینا۔ اس کے منہ سے جوبات نکل جائے وہ پوری ہو کے رہتی ہے۔ یہ غیب کا کوئی پیغام دے رہا ہے۔ یہ پندرہ سو سال بعد نظر آیا ہے تیسری بار جو گاہ پندرہ سو سال پہلے سرزمین زلزلہ آیا تھا۔ زلزلے سے ایک دو دن پہلے یہ فیر سرزمین کی گیسوں میں نظر آیا تھا۔ یہ اسی طرح لا الہ الا اللہ پڑھتا، عشاء میں پڑھتا تھا اور بلند آواز سے کہتا پھرتا تھا۔ 'سرمقذ کی زمین گناہگاروں کے بوجھ سے ٹھک گئی ہے'۔ اس کی بیکار کو کوئی بھی نہ سمجھ سکا۔ یہ وہاں سے غائب ہو گیا اور زمین اسے نندے ملی کہ آدھا سرمقذ تباہ ہو گیا۔ شراب خانے اور قہر خانے زمین سے مل گئے۔

ادب یہ میاں نظر آیا ہے۔ دوسرے آدمی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ اب معلوم نہیں دریا میں سیلاب آئے گا یا کوئی پہاڑ پھٹے گا یا آسمان سے آگ کس طرح بر سے گی۔ کچھ ہو گا ضرور کچھ ہونے والا ہے۔

سپاہیوں پر خوف طاری ہو گیا۔ ان کے رنگ زرد ہو گئے۔ کسی نے پوچھا کہ اس سے کس طرح پوچھا جائے کہ کسی تباہی آ رہی ہے یا کیوں آ رہی ہے؟ کیا یہی نہیں کہتی ہے؟ ان پڑھ اور تو ہم پرست سپاہیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہ آپس میں کھسکھسکرتے بالکل میں چلے گئے۔ تھوڑی سی دیر میں تمام ترفوج میں یہ دہشت ناک خبر پھیل گئی کہ ایک فیر تباہی کا پیغام دیتا پھر رہا ہے۔ خبر جوں جوں پھیلی گئی، زیادہ سے زیادہ دہشت ناک ہوتی گئی۔ بارگاہ میں یہی فیر موضوع بن گیا اور سب اس مسئلے کا حل سوچنے لگے کہ فیر سے کس طرح پوچھا جائے کہ کسی تباہی آ رہی ہے اور کیوں آ رہی ہے۔

نے اُن سے پوچھا۔

”آپ نے ہماری مدیکوں حاصل کی ہے؟“ ایک نے جواب دیا۔ ”صرف اس لیے کہ آپ فوج کو اپنا حامی بنا کر خوارزم شاہ فنا چاہتے ہیں مگر خوارزم کی فوج آپ کا یہ حکم ماننے کے لیے تیار نہیں کہ آپ جرجانیہ یعنی اپنے دارالحکومت پر حملہ کر کے دہان کی فوج کو شکست دیں اور ہزار اسپ اور ہتھیار لیں جو فوج قیم ہے وہ اپنے بھائیوں کے خلاف لڑے۔ ہم نے یہاں آکر جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ خوارزم کی فوج ابھی تک آپس میں لڑنا کو درکنار، اپنے کسی مسلمان بڑے کے خلاف بھی نہیں لڑی اور اس فوج کو یہ تربیت دی گئی ہے کہ مسلمان مسلمان کے خلاف نہیں لڑا کرتا۔ ہمیں سب سے پہلے ہزار اسپ اور ہتھیار لیں جو دستہ قیم ہیں ان کے دلوں سے اسلام کا رشتہ توڑنا ہے۔۔۔۔“

”تو ہم پرستی واحد ذلیل ہے جس سے کسی کے مذہب کو کمزور کیا جاسکتا ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ آلے وقت کے حالات اور ہونے والے بات و بات جاننا چاہتا ہے۔ انسان کی دوسری کمزوری سنسنی اور جذباتیت ہے جو انسان سنسنی خیز باتوں کو پسند کرنے لگتا اور عقل پر جذبات کو غالب کر لیتا ہے، اُسے نہایت آسانی سے اپنے سانپوں میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ انسان جتنا اُن پڑھ اور پسند ہوتا ہے وہ اتنا ہی جذبات سے مغلوب ہوتا ہے۔ انسان کی تیسری کمزوری یہ ہے کہ وہ لمبی عمر چاہتا اور سرنے تک جوان رہنا چاہتا ہے۔۔۔۔“

”ہم نے آپ کے کمزوروں اور پاپیوں کی یہ خامیاں ان دُفقیروں کے ذریعے بیدار کر دی ہیں۔ یہ دونوں فقیر اس فن کے ماہر ہیں۔ انہوں نے مذہب کا نام لے لے کر پاپیوں کے دلوں میں مذہب کی جگہ تو ہم پرستی بھردی ہے۔ دونوں فقیر آپ کے قرآن سے آیات پڑھ کر بات کرتے ہیں اور ان کی ہر بات قرآن کے اُلٹ اور اسلام کے منافی ہوتی ہے۔ ہمارے استادوں نے آپ کی فوج کے دلوں میں اسلام کی محبت قائم رکھتے ہوئے پڑوسی مسلمانوں کے خلاف شکوک اور دوسو سے بڑا کر دیئے ہیں۔۔۔۔“

”ہم عیسائی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لیکن ہمیں آپ کے مذہب کی ہر بات معلوم

نہی دی جو اس سازش کا سرخ لگاتے رہیں۔ اس حکم کے تحت تین چار آدمی جرجانیہ پہنچ دیئے گئے تھے مگر وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ اُن کا ریلہ کاہ کا بجی کے ساتھ بھی ہو گیا تھا اور وہ انہیں یہی اطمینان دیتی رہی کہ ابوالباس سلطان محمود کے خلاف نہیں ہو سکتا۔ جو کچھ تھا وہ ہزار اسپ اور ہتھیار لیں تھا۔ ہزار اسپ میں دیا کے کنارے فقر لوگوں خصوصاً فوجیوں کے دلوں پر چھا گیا تھا۔ دہان سے دوسو میل دور ہمارا میں دریائے زرافشاں کے کنارے ایک اور فقر مشہور ہو گیا جس نے دہان دیرے ڈال دیئے تھے لیکن وہ اکیلا نہیں تھا۔ اُس کے ساتھ چار پانچ مرد اور اتنی ہی عورتیں تھیں۔ اس فقر کی یہ کرامات مشہور ہو گئیں کہ وہ ایک دولی اور ایک تعویذ دیتا ہے جن سے انسان ہمیشہ جوان رہتا ہے اور اس کی عمر بڑی لمبی ہو جاتی ہے۔ ہر انسان لمبی عمر اور بڑھاپے میں بھی جوان کا طلبگار ہوتا ہے لیکن فوجی جو بچہ ہر وقت موت منڈلاتی رہتی ہے اس لیے وہ ایسے تعویذ کی ضرورت زیادہ محسوس کرتا ہے جو موت کو مال سکے چنانچہ ہمارے فوجی جو حق درحق اس فقر کے پاس جانے لگے۔ پھر دونوں فقروں نے لوگوں کو وعظ سنانے شروع کر دیئے۔ دونوں کے غظوں کا لب لباب یہ ہوتا تھا کہ تم اللہ کے سپاہی ہو اور ہمتارے پڑوس کی تمام ریاستیں اور امارتیں برائے نام مسلمان ہیں اور وہ تمہیں اپنا غلام بنا چاہتی ہیں۔ اگر تم نے کسی بڑی پر اس لیے بھروسہ کیا کہ وہ مسلمان ہے تو تم پر ایسی تباہی آئے گی کہ ہمتارا ہم دشمنانِ مٹ جائے گا۔

ان دونوں نے فہری اور دریشی کا ایسا دور
سپاہیوں کے دلوں میں اتر جاتا تھا۔ ایک لفظ

انہیں ایک رات اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے دُعا دہی بیٹھے تھے جو خوارزم کے رہنے والے نہیں تھے اور وہ مسلمان بھی نہیں تھے۔ دونوں فرنگی تھے۔

”آخر اس ڈھونگ سے آپ کیا نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں؟“ انہیں

ابوالعباس غزنی کو فوجی مدد دے دے گا۔ اس کے خلاف لڑے گا نہیں۔“
دو بڑی دلکش لڑکیاں ان تینوں کو شراب پلا رہی تھیں اور انگلیں پر شراب کا
نشان کم اور لڑکیوں کا خنار زیادہ طاری ہو رہا تھا۔ وہ بار بار ان لڑکیوں کو دیکھتا تھا۔ دونوں
فرنگی اس پر خوارزم شاہی کا نشانہ طاری کر رہے تھے۔

کاہ کاہی کے پاس غزنی سے ایک نیا ملازم آیا تھا۔ جسے نام کا اُدھر عمر آدھی
تھا۔ کاہی نے ابوالعباس کو بتایا تھا کہ یہ اُس کا خاص ملازم تھا جسے اُس کے بھائی سلطان
محمود نے اس کے پاس بھیج دیا ہے۔ ابوالعباس کو کبھی یہ ملازم بہت پسند آیا تھا۔ اُس
میں خاص قسم کی شائستگی، انفاست اور فائز تھی۔ وہ دوسرے ملازموں، خدمت
گاروں اور خادماں پر نگرانی کی اور انہیں اپنے قابو میں رکھنے کی ہدایت رکھتا تھا۔
ایک روز کاہی بارگاہ میں بیٹھی تھی اور جسے اُس کے سامنے سر جھکائے اور ہاتھ
نماز کی طرح باندھے کھڑا تھا۔ یہ انداز ایسا تھا جیسے وہ کاہی کی بات سن رہا ہو مگر وہ
سن نہیں رہا بلکہ رہا تھا اور کاہی سن رہی تھی۔

”کوئی گز بڑھ رہا ہے۔“ جسے کہہ رہا تھا۔ ”خوارزمشہر اسب سے جو املا میں
آئی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں کی فوج پر کوئی شیطانی اثر کام کر رہا ہے ہزار
اسب میں دریا کے کنارے ایک فیر نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں جو بڑی غوناک
پیشہ نگاریاں کرتا ہے اُس نے ایسا دھومک رچا رکھا ہے کہ سپاہی اس سے متاثر ہو رہے
ہیں۔ وہ قرآن پاک ہاتھ میں رکھتا اور سپاہیوں کو دُش اور غلط دیتا ہے۔“
”کیا یہ یقین کر لیا گیا ہے کہ وہ کوئی تارک الدنیا عالم نہیں ہے؟“ کاہی نے
پوچھا۔

”وہ عالم ہو سکتا ہے تارک الدنیا نہیں، اور وہ علم نہیں، البتہ پھیلا رہا ہے۔“
جس نے کہا۔ ”وہ غزنی کے خلاف زہر اُگاتا ہے اور قرآن کی آیات پڑھ کر
کہتا ہے کہ غزنی دُش اور زہر دے گی تمام مسلمان ریاستیں اور املا میں ہلے نام مسلمان
ہیں اور سچے مسلمان خوارزم کے لوگ ہیں۔“

ہے۔ ہم نے آپ کے سپاہیوں پر غم نہ ہی جنون طاری کر دیا ہے۔ ہمارے بہت سے
آدمی جو مسلمان ہی ہیں، آپ کی چھان بین گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ افواہیں پھیلاتے
ہیں اور وہ ہر پھل میں کہتے ہیں کہ خوارزم کو سلطان محمود سے صرف انگلیں ہی کاٹ سکتا ہے
خوارزم شاہ ابوالعباس اور اس کی بیوی کاہی کے خلاف اتنا زہر پھیلا دیا گیا ہے کہ
سپاہی انہیں ناپسند کرنے لگے ہیں چند دنوں میں ہی آپ کی فوج بغاوت کے لیے تیار
ہو جائے گی

”آپ کے دو نائب سالار جو ابوالعباس کے کڑے حامی تھے، انہیں ہم نے دو
جوان اور بڑی ہی خوبصورت عورتوں کے ذریعے اپنے اثر میں لے لیا ہے۔ آپ کو شاید
معلوم نہیں تھا کہ یہ دونوں آپ کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اب، وہ بھی آپ کو پسند کرنے لگے
ہیں۔ اس کے علاوہ آپ کو اگر کوئی اور مدد چاہیے تو ہمیں بتادیں۔ ہم آپ کو مالِ مدد دے
سکتے ہیں۔ بلکہ دے سکتے ہیں۔ جانور دے سکتے ہیں۔“

”ابھی نہیں۔“ انگلیں نے کہا۔ ”اگر آپ نے مجھے مددوی تو خوارزم شاہ کو
پتہ چل جائے گا۔ مجھے ایک بار اندازہ ایک موقع چاہیے تاکہ میں فوج کو اُس کے خلاف
بھڑکا سکوں اور اپنا حامی بنالوں۔ میں نے خوارزم شاہ کا تختہ الٹ دیا تو آپ سے مدد
لوں گا۔“

”اور میں ایک بار پھر کہہ دوں کہ میں آپ سے کچھ نہیں لینا۔“ دوسرے فرنگی نے
کہا۔ ”جیسے آپ کی صرف دو جگہ چاہیے پھر ہم آپ پر ثابت کریں گے کہ گھبراہٹ اور کھجور
میں کتنا پیار ہے۔ اس پیار میں سلطان محمود حاوی ہے۔ محمود کا خاتمہ ضروری ہے۔“
”میں بھی یہی چاہتا ہوں۔“ انگلیں نے کہا۔ ”محمود سلطنت غزنی کی توسیع

چاہتا ہے۔“

”آپ کو شاید معلوم ہو گا کہ آپ کی فوج کسی مسلمان ملک کے خلاف تو نہیں لڑے
گی؟ یہ غزنی کے خلاف، بالکل جانیں لڑے گی۔“ فرنگی نے کہا۔ ”یہ سلطان محمود کا بہن
کاہی کا اثر ہے۔ ہماری اس کمپنیں اُس گھرے کے اندر تک دیکھ سکتی ہیں جس میں ابوالعباس
اپنی دلی دیویوں کو فراموش کر کے کاہی کے جال میں اپنے ہوش کھو بیٹھا ہے۔“

شان ہیں۔" کاکھی نے کہا۔ "اور سلطان کو یہ بھی بتا دیا جائے کہ میرے کہنے پر ان دونوں فقیروں کو قتل کیا جا رہا ہے۔"

اس سے اگلی رات ہزار اسپ سے باہر دریائے اوکسس کے کنارے فخر کے خیمے کے باہر جوم چھٹ رہا تھا۔ رات بہت گزر گئی تھی۔ بعض آدمی عورتوں کے ساتھ دوڑتے گئے تھے جہاں انہیں کوئی دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہ آدمی سب کے چلنے کے انتظار میں اُدھر گھوم پھر رہے تھے۔ فخر شعل بھی کھانچے میں چلا گیا اور خیمے کے باہر صرف دو آدمی رہ گئے۔ وہ اس طرح بیٹھے رہے جیسے انہیں میس رہنا تھا۔ ان سے کچھ دور جو دو آدمی گھوم پھر رہے تھے، وہ ان دو آدمیوں کو دیکھتے رہے۔

"مسلم ہوتا ہے یہ فخر کے ساتھی یا ممانڈ ہیں۔" دور کے آدمیوں میں سے ایک نے کہا۔ "یہ یہاں سے نہیں جائیں گے۔"

"یہ خیمے کے اندر چلے گئے تو ہم اپنا کام نہیں کر سکیں گے۔" دوسرے نے کہا۔

"ایک طریقہ آزماتے ہیں۔" پہلے نے کہا۔ "تم ان کے پاس چلے جاؤ اور اپنے آپ کو گناہ ظاہر کر کے ان سے فخر کی باتیں اس طرح بوجھو جیسے تم فخر سے بہت متاثر اور مرعوب ہو۔ میں اپنا کام کر دوں گا۔"

دوسرا آدمی ان دو آدمیوں کے پاس جا کھڑا ہوا اور اپنے ساتھی کے کہنے کے مطابق ان کے ساتھ باتیں کرنے لگا۔ اُس نے جب کہا کہ وہ گناہ ہے تو دونوں آدمیوں نے اس کے ساتھ دل چسپی سے باتیں شروع کر دیں۔ اس نے کہا کہ فخر شاید سوتا ہو گا، اس لیے یہیں پرے چلے جانا چاہیے۔ ہماری باتیں انہیں بے اثر لگیں گے وہ انہیں پرے لے گیا۔ فخر نے خیمے کے دونوں طرف کے پردے کرا لیے تھے۔ اُس کا ساتھی جو اندھیرے میں کھڑا تھا، آہستہ آہستہ خیمے کی پھل طرف چلا گیا اور بیٹھ گیا، پھر میت کے بل لیٹ کر اُس نے پردے کے نیچے سے اندر دیکھا۔ دیسے کی روشنی میں اسے فخر نظر آیا۔ وہ شہزادہ (یا راجا) تھا اس آدمی، اس طرف اُس کی بیٹھ تھی۔ اس آدمی نے گھرتے ایک رستی کھول دی اور رستی اُٹھتے ہی لے کر پردے کے نیچے سے بھاگتا ہوا

اندھ چلا گیا۔ فخر کو خبر نہ ہوئی اس آدمی نے پاؤں پر سیٹھ کر رستی چھپے سے فخر کی گردن میں پھینکی۔ یہ پھندا تھا جو گردن میں پڑتے ہی تنگ ہو گیا۔ فخر کی آواز بھی نہ نکلی۔ پھندا اتنی زبردستی تنگ ہوتا گیا کہ فخر بُری طرح تڑپا اور اُس کا جسم جیسے جس ہو گیا۔ وہ آدمی اس اطمینان سے کہ فخر مر چکا ہے، خیمے سے نکلا اور کچھ دُور تک اُٹھوں کے بل چلا گیا۔

اس کا ساتھی فخر کے دو آدمیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ اُسے ملوکی آواز سنائی دی۔ وہ ان آدمیوں سے مصافحہ کر کے اگیا اور اپنے ساتھی سے آن ہوا، پھر دونوں اندھیر میں غائب ہو گئے۔

نکلادہاں سے بہت دُور تھا۔ یہ آدمی اُسی رات وہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہاں کے فخر کو قتل کرنا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ اُس کے ساتھ چند ایک آدمی بھی بہتے تھے۔ یہ دونوں آدمی اُسی وقت گھوڑوں پر بٹال کی سمت روانہ ہو گئے۔ اُن کی رفتار بہت تیز تھی۔ وہ دیا کے کنارے کارے جا رہے تھے۔ ایک جگہ دیا کا پاؤں بہت چڑا تھا جہاں دریا کی گہرائی کم ہوتی چاہیے تھی۔ انہوں نے وہیں گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ بعض گھوڑوں پر گہرائی اتنی زیادہ تھی کہ گھوڑوں کو تیرنا پڑا۔ اُن کے سامنے دو میل کی مسافت تھی۔

دوسرے دن ہزار اسپ میں اس خبر نے سنسنی پھیلا دی کہ فخر مر گیا ہے۔ یہ خبر بھی پھیل گئی کہ وہاں انہیں اسے مارا گیا ہے۔ شہروں کے لوگ اور فوجی دیسے کے کنارے جمع ہو گئے۔ وہاں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ فخر کو غزنی والوں نے قتل کیا ہے اور قاتلوں نے قرآن پاک کی بھی توحید کی ہے۔ اس خبر کو اس لیے سچ مان لیا گیا کہ فخر غزنی کے خلاف باتیں کیا کرتا تھا۔ اس خبر نے چھاؤنی کو جیسے رگ لگادی ہو۔ فزگی تحریک کاروں اور شہزادوں کے خفیہ گردہ نے دہشت ناک باتیں شہور کر دیں۔ ہر طرف خوف چھا گیا کہ فخر جس تباہی کی پیشین گوئی کیا کرتا تھا وہ اب آئی فوج کے کمانڈر بھی دُوسرے ہونے اور غزنی کے خلاف بھڑکے ہوئے تھے۔

نفسے میں بدست ہوجا رہا تھا۔ دونوں آدمیوں نے پرعل کی ترسی کھینچی اور اندر چلے گئے۔ فخر اور لڑکی نے ادھر دکھیا گراؤں کے منہ سے کوئی آواز نہ سنی۔ پہلے ہی ایک آدمی نے لڑکی کے منہ پر دوسرے نے فخر کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دونوں کو گرا دیا اور ہاتھ دبا لئے رکھے۔ لڑکی ایسے نومذمر کے آگے کچھ بھی نہیں سمجھتی اور فخر کی طاقت شراب نے سلب کر رکھی تھی۔ خنجر دونوں کے دلوں میں اتر گئے۔ دودھ دار دل کے منہ پر رکھنے گئے اور دونوں جلدی ہی ختم ہو گئے۔

ان کے دوسرا تھی باہر کھڑے تھے۔ ان میں سے ایک کے پاس تیل کا جھوٹا سا منہ تھا۔ ان کا کام ہو چکا تھا۔ انہیں اب نکل جانا ہے تھا لیکن منہ کے دلے آدمی نے انتقام سے بے تاب ہو کر فخر کے خیمے کے اندر اور دوسرے خیموں کے پردوں پر تیل چھڑکنا شروع کر دیا۔ اندر والے اتنی گہری نیند سوئے ہوئے تھے کہ انہیں پتہ نہ چل سکا۔ فخر کے خیمے کے دیسے سے ایک کپڑے کو آگ لگا کر تمام خیموں کو آگ لگا دی گئی۔ تیل کی وجہ سے خیمے فوراً ہی آگ کی لپیٹ میں آ گئے۔ اندر والوں کی چیخ و پکار بلند ہونے سے پہلے ہی چاروں آدمی گھوڑوں پر سوار ہو کر غائب ہو گئے۔

کاہ کا کبھی کو طرہ ہی اطلاع دے دی گئی کہ دونوں فخریوں کا کام تمام کر دیا گیا ہے مگر بھاریاں جو دسے معیم تھے، اُن کا رد عمل تھوڑی تھا۔ وہاں بھی یہی پردہ بگینہ دکھایا گیا کہ یغزنی مالوں کی کارستانی ہے۔ فوج غزنی اور سلطان محمد کے خلاف بھرپور اٹھی۔ سلطان محمود کو اطلاع میں دو تین دنوں کے وقفے سے ملیں۔ پہلی اطلاع اُسے وہی ملی جو کاہ کا کبھی کے ملازم نے اسے تفصیل سے سنائی تھی۔ اسی تفصیل سے سلطان محمود کو سنائی گئی۔ دوسری اطلاع یہ ملی کہ کاہ کا کبھی کے حکم سے دونوں فخریوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔ سلطان، متوجہ ہی رہا تھا کہ لڑے کیا کرنا چاہیے کہ جڑ جائز سے کا کبھی کا بھجوا دیا گیا اور آدمی غزنی پہنچا۔ اُس نے سلطان محمود کو بتایا کہ ابوالعباس کے صوبہ ہندو کے امیر الہنگین نے فخریوں کی پشت پناہی سے بغاوت کی تیاری مکمل کر لی ہے اور وہ سالار الملک ابوالاسحاق اور خورشید، نے ہندو اور ہزارا سب کے دستوں کو ابوالعباس

فخر کے قاتلوں نے دوسری کی سافٹ گھوڑوں کو تھوڑی تھوڑی دیر آرام دے کر ادھر سرپٹ رفتار پر لے کر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر تک لڑکی جب سوچ غروب ہو رہا تھا۔ ان میں سے ایک شہر میں گیا اور اپنے ساتھیوں سے ملا۔ کبھی نہ کی بہرہ میں شہر میں رہتے اور اہلوان امارت کی سرکاریوں کی اطلاعیں لیتے رہتے تھے۔ ان میں سے دو آگئے۔ انہیں بتایا گیا کہ کیا کرنا ہے۔

”ایسے فخر کا قتل آسان تھا۔ ایک نے کہا۔ یہاں ایک گروہ ہے فخر کو ہم نے دیکھا ہے۔ رات خیمے میں اکیلا ہوتا ہے لیکن دوسروں کے خیمے اس کے ساتھ گئے ہوئے ہیں۔“

”مشکل یہی ہے کہ دوسرے جاگ اٹھتے تو ہم کپڑے یا مانے جانیں گے۔“ ایک نے کہا۔ ”اپنے طرف کو یاد رکھو غزنی سے روانہ ہونے سے پہلے ہم سے لیا گیا تھا۔ یہیں جانیں قرآن کرئی نہیں گئے ہم سلطان کو دھوکہ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں لیکن ہم خدا کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ یہ فخر قرآن پاک ہاتھ میں لے کر مسلمانوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنادیا ہے۔ تم دیکھ چکے ہو کہ اس خیمے کے پیچھے فرنگیوں کا ہاتھ ہے اور کچھ ہورہا ہے اسلام کے خلاف اور اسلام کی تباہی کے لیے ہورہا ہے یہاں امیر الہنگین خوارزم شاہی کے لاکھوں قرآن پاک کی توہین کر رہا ہے ہمیں اپنے مذہب اور مقدس کتاب کی عظمت اور موسیٰ پر قرآن مجید کے چاروں نے گھوڑے دریا کے قریب خیل میں باندھے اور رات اُس وقت فخر کے خیموں کی طرف گئے جب لوگ وہاں سے جا رہے تھے۔ وہ لوگ نہیں گھومتے پھرتے رہے، حتیٰ کہ آخری آدمی بھی وہاں سے چلا گیا۔ اب وہاں تاریک گھوٹوں میں غوڑوں کی سرگرمیاں شروع ہو گئی تھیں۔ آدھی رات کے بعد خیموں کے اندر خاموشی طاری ہو گئی۔ چاروں اُس خیمے کی طرف بڑھے جس میں فخر سوتا تھا۔ پروے گرے ہوئے تھے اور اندر روشنی تھی۔ ان میں سے ایک کی گھوڑا کسی چیز سے لگی۔ یہ جھوٹا منہ تھا۔ اس آدمی نے فوراً پہچان لیا کہ اس میں مشعلوں اور دیوؤں کا تیل ہے۔ اُس نے منہ اٹھایا۔ دنا دنا فخر کے خیمے کے پردے کے ساتھ بیٹھ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں بڑے خنجر تھے۔ پردہ دراہنا کر دیکھا فخر نیم بہرہ تھا اور اس کے پاس ایک نیم بہرہ جوان لڑکی تھی۔ فخر شراب کے

کے کڑے تعقیب کر کے انہیں پھنسا لیا۔ اجلاس ایک بار پھر بلایا گیا جس میں ابوالعباس نے سب کو بتایا کہ اُس نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر سلطان محمود خوارزم پر حملہ کرے تو ترکستان کے فوجین سے مدد لی جائے۔ لہذا ان کے ساتھ دو تہائی اور تہائی ان کا معاہدہ کیا جائے اور اسے خفیہ رکھا جائے۔

یہ بھی نے ہی لکھا ہے۔ سلطان محمود کو اپنے جاسوسوں سے اطلاع ملی کہ ابوالعباس ترکستان کے ساتھ فوجی نوعیت کا معاہدہ کر رہا ہے۔ سلطان محمود اپنی ایک لاکھ لہری کی فوج اور پانچ سو اسی لے کر خوارزم کی سرحد کے قریب بلخ چلا گیا اور ابوالعباس کو پیغام بھیجا کہ وہ اس کی اطاعت قبول کرے ورنہ اُس کے ملک پر حملہ کر دیا جائے گا۔ ترکستان کے خواہن سلطان محمود کے مطالبے میں ابوالعباس کو فوجی مدد دینے سے گھبرائے۔ انہوں نے بلخ پر اگر سلطان محمود سے درخواست کی کہ وہ خوارزم پر حملہ کرے سلطان محمود کسی کی سننے والا نہیں تھا۔ نہ مانا اور اس نے اپنا مطالبہ برقرار رکھا۔ ترکستان کے خواہن نے ابوالعباس خوارزم شاہ کو اس پر رضامند کر دیا کہ وہ سلطان کی اطاعت قبول کرے اور خلیفے میں اس کا نام شامل کر لیا جائے۔ سلطان محمود اپنا مطالبہ برقرار ہونے پر اپنی فوج واپس لے گیا۔

دوسرے مورخین نے جن میں عظمیٰ ابن الاثیر اور گردیزی خاص طور پر قابل ذکر ہیں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے خیال رہے کہ عظمیٰ جس کا پورا نام ابوالنضر محمد العظمیٰ تھا، سلطان محمود کے دور کا واقعہ نگار تھا اور سلطان محمود نے اُسے کئی بار اپنا سفیر اور ایجنسی بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیجا تھا۔ اس کی کتاب کتاب التوحید میں اس کے ذاتی مشاہدات پر لکھی گئی ہے اور محمود غزنوی کے حالات و واقعات پر ایک مستند ستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔

اس کے مطابق ابوالعباس سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے سے ہچکچایا تھا کیونکہ اُسے اپنی آزادی سلب ہو جانے کا خطرہ تھا۔ اُس کے ذہن نے اُسے بتایا تھا کہ سلطان کی اطاعت قبول کرنے میں اتنا خطرہ نہیں تھا اپنی فوج کی بغاوت میں ہے۔ ابوالعباس سے اطاعت قبول کرنے کا فیصلہ کاہن کا بھی نے کر لیا تھا۔

کے خلاف فتنہ کر دیا ہے۔ ابوالعباس کی حمایت میں وہی فوج ہے جو اُس کے دامان حکومت چڑھانے میں ہے گران چند ایک دستوں کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔

سلطان محمود نے اسی وقت ابوالعباس کے نام پیغام لکھوایا جس کا الفاظ موزوں کے مطابق کچھ اس طرح تھے۔ "میرا خیال ہے کہ آپ اپنے ملک کی اس صورت حال کو نہیں سنبھال سکیں گے۔ آپ فوج لے کر تاجر بہار میں بیٹھیں اس کے کہ آپ کا کٹہر اٹ دیا جائے یا آپ باغیوں کے ہاتھوں قتل ہو جائیں، کچھ آپ کی مدد کو پہنچ جانا چاہیے لیکن یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے کہ آپ خود مختار اور آزاد رہتے ہوئے سلطنت غزنی کی اطاعت قبول کر لیں اور خلیفے میں میرا نام شامل کر دیں۔ میں آپ کی آزادی برقرار رکھوں گا۔ اس سے آپ کو یہی فائدہ پہنچے گا کہ آپ کو میری مدد حاصل ہوگی اور میں اپنی فوج کے بہترین دستے آپ کے دامن حکومت میں آپ کی خوارزم شاہی کی حفاظت کے لیے رکھ سکوں گا۔ میں آپ کو خبردار کرتا ہوں کہ آپ کو اگر مشورہ لینے کی ضرورت ہو تو اپنے وزیر البراکمارش سے مشورہ لیجیے گا۔ اگر آپ نے اپنے وزیر البراکمارش سے ادبائے سالاروں سے مشورہ لیا تو آپ کو گڑھ کیا جائے گا۔ آپ اس قدر تاجر بہار میں کہ آپ کو بھی معلوم نہیں کہ آپ کے اندر گود کیا امور رہے اور مجھے سینکڑوں میل دور غزنی میں پہنچ کر کیسے کہ آپ تنہا رہ گئے ہیں۔ میں اُمید رکھوں گا کہ آپ سوچنے میں زیادہ وقت صرف نہیں کریں گے۔"

مشہور مؤرخ عظیمی نے لکھا ہے کہ خوارزم شاہ ابوالعباس کو جب یہ پیغام ملا تو اُس نے اپنے وزیر اور مشیر دل کا اجلاس بلایا جس میں البراکمارش، سالار البراکمارش اور سالار خورشید بھی تھے۔ ابوالعباس نے سلطان محمود کی اطاعت قبول کرنے کی حمایت کی۔ اُس نے پیغام کو نہ دکھایا۔ اجلاس میں عرفیہ سلام پیش کیا کہ سلطان محمود نے اُس کی اطاعت قبول کرنے اور خلیفے میں اُس کا نام شامل کرنے کو کہا ہے۔ اجلاس میں سب نے اس کی مخالفت کی۔ عظیمی نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس پیغام کا اطلاع فوج کو بھی مل گئی اور فوج نے اس کی مخالفت میں بغاوت کر دی۔ ابوالعباس نے پابھیوں میں سونے

دیا۔

چند دنوں بعد شام کو ابوالعباس اپنے خاص کمرے میں بیٹھا تھا کہ ایک قلعہ بندے آکر اسے بینام دیکر ترکستان کے چار خوانین آئے ہیں۔ اُن کے ساتھ امیر الینگین بھی ہے۔ انہوں نے جیسے دالے بلغ میں قیام کرنا پسند کیا ہے۔ امیر الینگین نے اُن کی عزت افزائی کے لیے مشورہ بھیجا ہے کہ خوارزم شاہ میاں آکر لڑنے کا استقبال کریں۔ ابوالعباس نے سواری تیار کرنے کا حکم دیا۔ گاہ کاہی کو پرہ چلا کر ابوالعباس کہیں جا رہا ہے تو دودھی آئی اور پوچھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ ابوالعباس نے اُسے بتا دیا۔ کاہی نے اُسے جانے سے روکا۔

”ترکستان کے وہاں آئے ہیں“ اُس نے کاہی سے کہا۔ میں ان کی عزت کرنا چاہتا ہوں۔ الینگین اُن کے ساتھ آیا ہے۔

”نہ جاؤ“ کاہی نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ الینگین نے تاحہ کیوں بھیجا ہے؟ خود کیوں نہیں آیا؟

”تم گھبراہٹ کیوں ہو کاہی؟“

”مخدا کے لیے نہ جاؤ ابوالعباس! میرا دل ادب رہا ہے۔“ کاہی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میں نے یہ نہیں جانے سے کبھی نہیں روکا۔ نہ جاؤ۔ مصروفیت کا سبب نہ کرو۔ کیا میں عورت ہوں؟

”آج ایک عہد کی بات مان جاؤ۔“ کاہی کے آنسو نکل آئے۔ نہ جاؤ۔ مجھے کوئی خطرہ نظر آ رہا ہے۔

ابوالعباس نے سن کر کہا۔ صحبت میں اتنا دہمی اور جذباتی نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے میری حیثیت سے نہ گراؤ کاہی! وہ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔

گاہ کاہی بہت ہی جذباتی ہو گئی تھی، یہاں تک کہ ابوالعباس باہر نکلا تو وہ اُس کے پیچھے دوڑی مگر ابوالعباس کی کچھ مخالفوں کے جلو میں جا چکی تھی۔ کاہی کی جذباتی حالت ایسی کچھ نہیں ہوتی تھی۔ اُس کا ملازم اور خادما اُسے بھلانے لگے۔ ان کی گھبراہٹ

”میں آپ کو نصیحت دلاتی ہوں کہ میرا بھائی آپ کی آزادی سلب نہیں کرنے گا۔“ کاہی نے اُسے کہا۔ ”وہ آپ کو اپنا اسماعیلی بنانا اور آپ کو بغاوت سے بچانا چاہتا ہے۔“

”میں سمجھ نہیں سکا کہ کون بغاوت کر رہا ہے۔“ ابوالعباس نے کہا۔ ”مجھے اپنی فوج پر اعتماد ہے۔“

”مگر فوج میں آپ کا اعتماد ختم کر دیا گیا ہے۔“ کاہی نے کہا۔ ”کس نے ختم کیا ہے؟“

”آپ کے امیر الینگین نے۔“ کاہی نے کہا۔ آپ کے سربراہ اسحاق نے خراسان کے دوران کے دربارہ فرنگی دوستوں نے۔ آپ کی بادشاہی سلطان محمود کی مدد کے بغیر قائم نہیں رہ سکے گی۔ مجھ سے دھوکے فریب کی توقع نہ رکھو ابوالعباس! اپنی خوش فہمیوں کے دھوکے میں نہ رہو۔ سلطان کی اطاعت قبول کر لو۔

ابوالعباس نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی اور خطبے میں سلطان محمود کا نام شامل کرنے کا اعلان کر دیا۔

جب یہ شاہی حکم نامہ ہزار اسب لہر بخارا پہنچا تو وہاں جیسے جنگل کو آگ لگ گئی ہو۔

الینگین نے بخارا کی فوج کے چھوٹے بڑے کمانڈروں کو بلا کر انہیں کہا کہ بغیر جس تباہی سے خیردار کرتے رہے ہیں وہ غزنی کی فوج کی صورت میں آ رہی ہے۔ ہم اس تباہی کو روک سکتے ہیں مدد ہم سب اور بخارا کی ستورات غزنی کی مدد سے صفت اور لیٹری فوج کی غلام ہو جائیں گی۔ ہندوستان سے زوردار ہرات ٹوٹ کر لانے والا سلطان محمود اب خوارزم کو ٹوٹنے اور یہاں کی بیویوں کو لونڈیاں بنا کر غزنی لے جانے آ رہا ہے۔ اُسے خوارزم شاہ ابوالعباس خود ہلا کر ملے۔ یہیں سب سے پہلے خوارزم شاہ ختم کر کے فوج کی حکومت قائم کر لی ہے۔ اپنے سپاہیوں سے کہہ دو کہ بغیر تمہیں غیب کی باتیں بتانے آئے تھے اور جنہوں نے تمہاری قسمت بدل دینے کا وعدہ کیا تھا، اُن کے قاتل تمہاری قسمت کو تباہ کرنے آ رہے ہیں۔

ہزار اسب میں ابوالعباس اور خراسان نے بھی اپنے دستوں کو ایسی طرح بھرکا

اور بے چینی بڑھتی گئی۔

زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ محل کے ارد گرد بہت سے گھوڑے دوڑنے کی آوازیں اور نعرے سنائی دینے لگے۔ کابگی اس امید پر دوڑتی باہر گئی کہ ابوالعباس آگیا ہے مگر یہ فوجی سوار تھے جو محل کو گھیرے میں لے رہے تھے اور وہ نعرے لگا رہے تھے۔ ”زن مرید خوارزم شاہ کو ختم کر دیا گیا ہے.... غزنی کا غلام جہنم ماحل ہو گیا.... خوارزم شاہ الپتغین زندہ باد۔“

کاہ کابگی کا دل بگڑ گیا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ خدایا! میں محل میں اندھ بپا ہو گیا۔ سب سے پہلے ابوالعباس کے ذریعہ ابوالہارث کو قتل کیا گیا۔ شیریں کو باہر نکال کر ان کے سر تن سے جدا کر دیئے گئے۔ محل کے اندر اور باہر ہزارا سب اور ہزارا کے فوجی دستے پھیل گئے۔ الپتغین کے حکم سے نوٹ مارا۔ جوئی۔ ابوالعباس کے حامیوں کو کھڑا جارا تھا اور انہیں باہر لے جا کر قتل کیا جا رہا تھا۔ جرجانیہ میں جو دستے تھے، ان میں سے دو نے مزاحمت کی کوشش کی، لیکن ان کی نفی اتنی تھوڑی تھی کہ ان سے فوراً ہی ہتھیار ڈالوائے گئے۔ انہیں مزاحمت کا حکم دینے والے ایک نائب سالار اور اس کے ماتحت کمانڈروں کو قتل کر دیا گیا۔

الپتغین نے خوارزم شاہ کی حیثیت سے قعر شاہی میں داخل ہوا۔ وہ خود ساختہ بادشاہ تھا۔ اس نے حکم دیا کہ تمام ملک میں اس کی خوارزم شاہی اور ابوالعباس کی موت کا اعلان کر دیا جائے۔

ابوالعباس کو اس دھوکے سے باہر بلا کر ترکستان کے خولانین آئے ہیں، قتل کر دیا گیا تھا۔ بغاوت بہت جلد کامیاب ہو گئی۔ یہی اور گردیزی کے سلطان یردلق ۵۱۵ھ (۱۱۱۷ء) کا ہے۔ فوج محل کی حدود میں داخل ہوئی تو کاہ کابگی کے خاص ملازم نے جو ماحصل غزنی کا جاسوس تھا، اس کو خطرے میں دیکھا اور دوڑتا ہوا اس کے کمرے میں گیا۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ”میں نے لئے رکھا تھا۔ لئے موت لے چکی تھی۔“ ملازم نے اسے قتل کر دیا اور اسے واپس لے

نکال لے جلنے کی پوری کوشش کر رہے گا۔

کاہ کابگی نے اپنا شانہ لباس اتار کر ہلکا سا کپڑا پہن لیا اور سر پر دھنی لے لی۔ ملازم نے اسے اس لباس میں دیکھ کر کہا کہ وہ اسے ابھی نکال لے جائے گا، مگر وہ کمرے کے دروازے میں ہی پہنچے تھے کہ باقی سالار ابوالہارث اسکانی کی بیٹی ابجوری آگئی۔ وہ ابوالعباس کی دوسری بیوی تھی۔

”تمہاری خوارزم شاہی ختم ہو چکی ہے کابگی! ابجوری نے طنز یہ کہا۔ بھاگ کے کہاں جا رہی ہو! باہر نکھو کی تو قتل ہو جاؤ گی یا تمہیں فوجی گھسیٹ کر لے جائیں گے۔ اب حکومت تمہاری نہیں فوج کی ہے۔ میں تمہاری حفاظت کا انتظام کر رہی ہوں۔ میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں حرم میں داخل کر دوں گی۔ وہاں تمہیں قتل نہیں کیا جائے گا۔ اگر چاہو تو میرے باپ کے ساتھ شادی کر لو۔ تم غزنی نہیں چھو گئی۔“

”ابجوری!“ کابگی نے بے خوف آواز میں کہا۔ ”مجھے غزنی جانے کی کوئی جلدی نہیں۔ غزنی والے یہاں آجائیں گے۔“ وہ اچانک گرج کر بلی ”نیکل جاؤ یہاں سے.... میں اب بھی شہزادی ہوں۔ سلطان غزنی کی بہن ہوں، اور تم کس باپ کی بیٹی ہو؟.... نیک حرام سالار کی جسے بادشاہ کی جوس نے اپنے انکھام سے بے خبر کر دیا ہے۔ جادو، انہیں کہو مجھے قتل کر دیں۔ مجھے قید میں ڈال دیں، پھر اپنا، اپنے باپ کا اور خود ساختہ خوارزم شاہ کا انجام دیکھ لینا۔“

ابجوری ہونٹوں پر طنز مسکراہٹ لیے باہر نکل گئی۔ ملازم نے کاہ کابگی سے کہا کہ آؤ، یہاں سے بچنے کی کوشش کریں۔

”نہیں جیس!“ کابگی نے کہا۔ ”میں فرار نہیں ہوں گی۔ میرا اس فریب کا خوارزم شاہ کا سامنا کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اُدھر کو چل پڑی۔ جیس کو اپنے پیچھے آتا دیکھ کر رہ کر گئی اور بولی۔ ”مجھے خدا کے سپرد کرو۔ تم مسلمان کرنے آ کر شش کر دو کہ کوئی غزنی اطلاع دینے چلا گیا ہے یا نہیں۔ اگر کچھ پتہ نہ چلے تو تم چلے جاؤ۔“

اصطبل سے گھوڑا لے لو۔“

امید لے کر آئے ہو کہ فوج کے چھاتے کے نیچے بیٹھ کر خوارزم سے بستا ہو گئے تو میں تمہیں خبردار کرتی ہوں کہ وہ لوٹنا جلدی آئے گا جو تمہارے اس چھاتے کو اڑا لے جائے گا۔ اس سدا پر وہی بیٹھ سکتا ہے جو اس کا اہل ہو۔ تم ماموں خانہ لان کے جوتے چاٹ چاٹ کر امارت کے رُتبے تک پہنچے تھے۔ اب تمہاری قسمت میں قید خانے کا ہر خانہ لکھ دیا گیا ہے۔

”لے جاؤ اسے۔“ الینگین نے اُس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ اسے اسی کے کمرے میں رکھو اور باہر سپرد کھڑا کر دو۔ اسے اُسی کمرے میں جس میں اس نے پورا ایک سال ازدواجی زندگی کی راتیں گزاری ہیں، نظر بند کر دو۔ میں سلطان محمود کو سینما بھجوں گا کہ اگر تم نے خوارزم پر حملہ کیا تو میں اپنی بہن کی چھوڑی ہوئی لاش لے لی۔ اسے ریخاں میں رکھوں لیکن اسے تکلیف نہ ہو۔ میں یہ نہیں کہہ لانا چاہتا کہ خوارزم شاہ الینگین نے ایک بے بس عورت پر ظلم کیا تھا۔

”آنے والی سلیس تبدیلی قبر پر بھی منت بھیجا کریں گی۔“ کاہکی نے کہا۔ جس فوج کو کفر کے خلاف حق کے سر کے لڑنے تھے اُس سے تم نے اپنے ہی ملک کو فوج کر لیا ہے اور اس فوج کو تم نے حکمران بنا دیا ہے۔ یہ فوج ایک دن بھی لڑنے کے قابل نہیں رہے گی۔ کسی نے کاہکی کو بازو سے پکڑا اور اُسے اُس کے کمرے میں لے گئے۔

اُس وقت کے ایک مشہور مورخ اور مبصر الفضلی نے اپنی کتاب ”آثار المورزما“ میں لکھا ہے۔ ”پندرہ تا تک الینگین خوارزم کا انتہائی ظالم و کثیر بار بار۔ تمام تر خوارزم پر اُس نے دہشت طاری کئے رکھی۔ اپنے آپ کو اسلام کا علمبردار اور پابلسن کہتا رہا لیکن جس کے منہ سے ذرا سی بھی مخالفانہ بات نکل جاتی تھی، اُسے قتل کر دیتا تھا۔ فوج گھیسوں میں گھومتی پھرتی رستی بجز لوگوں کی باتیں سنتے رہتے۔ شک پر بھی لوگوں کو پکڑ کر قید میں ڈال دیا جاتا یا جلاد کے حوالے کر دیا جاتا تھا۔ ایسا سہ خور و نوش اور آسودہ زندگی صرف فوج کے لیے رہ گئی تھی۔“

الینگین اُسی تخت نامند پر بیٹھا احکام دے رہا تھا جس پر تھوڑی دیر پہلے تک ابو العباس بیٹھا رہا تھا۔ دربار میں کچھ لوگ دست بستہ کھڑے احکام سن رہے تھے۔ سب فوجی تھے۔ شہری انتظامیہ کا کوئی ایک بھی آدمی نہیں تھا۔ وزیر ابو الحارث بھی نہیں تھا۔ دربار میں شور مچا تھا۔ سب پر نام طاری ہو گیا۔ الینگین نے دیکھا۔ کاہکی اُس کی طرف آرہی تھی۔

”اوہ! کاہکی! الینگین نے زیر لب کہا۔“ اُس کے متعلق تو میں نے کچھ سوچا ہی نہیں۔“ اُس نے کاہکی سے مخاطب ہو کر کہا۔ کاہکی! میں جانتا ہوں تم جان بخشی کے لیے آئی ہو۔ تمہیں شاید احساس نہیں کہ اپنے خاندان کو تم نے مروا ہے۔ تم نے اُس پر جادو طاری کر کے اسے غری کا غلام بنایا تھا۔ خوارزم کے لوگ اور خوارزم کی فوج کسی غیر ملکی کی غلامی برداشت نہیں کر سکتی۔ قوم اور فوج مجھے گھسیٹ کر اس مندر لائی ہے۔ میں اب اُنہی کے کہنے پر اس سند سے اُنہوں کا۔ قوم نے مجھے جو فرض سونپا ہے وہ مجھے ہر قیمت پر پورا کرنا ہے۔“

”میں جان بخشی کے لیے نہیں جان دینے کے لیے آئی ہوں۔“ کاہکی نے کہا۔ ”میں نے جو کچھ کیا وہ اللہ کی خوشنودی کے لیے کیا۔ تم نے خود بھی قرآن پاک کی تعین کی ہے اور فرنگیوں سے بھی لڑی ہے۔ خدا تمہیں بخشے گا نہیں۔ اپنے گناہ کو چھپانے کے لیے تم یہ جھوٹ بول رہے ہو کہ تمہیں قوم اور فوج گھسیٹ کر لائی ہے۔ اگر تم قوم کے اتنے ہی محبوب اور خدا کے اتنے ہی برگزیدہ آدمی ہو تو تم نے گل ملی میں اور شہر لڑا، کے ہر دروازے پر سپرے کیوں کھڑے کر دیے ہیں، انہیں باہر کیوں نہیں آنے دیتے، شہر میں خاموشی کیوں ہے، تو تم بتا رہے ہو کہ تم کے نعرے کیوں نہیں لگاتے، ہر طرف فوج ہی کیوں نظر آرہی ہے؟“

کسی درباری کی آواز گرجی۔ ”تمہارے بات کرو، خوارزم شاہ سے مخاطب ہو۔“

”میرا خاندان مارا گیا ہے۔“ کاہکی کہتی پئی گئی۔ ”خدا تو نہیں مارا گیا، اگر تم یہ

تھا اور باقی ریگستان جو صحرائے غز کہلاتا ہے۔ قاصد کو جاتے اور واپس آتے ایک مہینہ لگ گیا۔ وہ کاکھی کی رملی کے پیغام کا یہ جواب لایا کہ الپتگین کو خوارزم شاہ سلیم کیا جائے اور اس کے ساتھ جنگ نہ کرنے کا سہارہ کیا جائے۔

الپتگین نے اپنی کورہ کو دکھایا تھا جس میں کاکھی کو رکھا گیا تھا۔ اس کے حکم پر دروازہ کھول کر لے دیکھا گیا تھا کہ کاکھی کو قید خانے میں نہیں بلکہ اس کے اپنے کمرے میں رکھا ہوا ہے۔ یہ اطلاع ان چھاپہ مندوں کے کام آئی جنہیں یہ خطرناک کام سونپا گیا کہ وہ کاکھی کو دیاں سے فرار کرائیں۔ کاکھی کا ملازم جنہیں غزنی آگیا تھا۔ وہ اس کمرے اور اس کے گرد و پیش سے اچھی طرح واقف تھا چاہے چھاپہ مندوں کو منتخب کیا گیا۔ پانچواں جنہیں تھا۔

پانچواں غیر معمولی رفتار سے جڑ جانی پہنچ گئے۔ ان کے پاس ایک گھوڑا نالو تھا۔ انہوں نے ایک سرائے میں قیام کیا۔ ان میں سے ایک کو جنہیں نے ساتھ لیا اور اسے محل کے باہر تک لے گیا۔ شہر میں انہوں نے فوجیوں کو گھومتے پھرتے دیکھا۔ اس سے اگلے روز وہ سرائے سے نکلے تو انہوں نے خوارزم کی فوج کا لباس پہن رکھا تھا اور ان کے ہاتھوں میں جو نیزے تھے ان پر خوارزم کے جھنڈے کے رنگوں والے کپڑے کی جھنڈیاں بندھی ہوئی تھیں۔ یہ دیاں کے سوار دستوں کا اہتمامی نشان تھا۔ وہ سرائے کے سوا دیوار کی طرح گزریں تانے اور سینے پھیلانے ہوئے جا رہے تھے۔ گھوڑوں کی چال بتاتی تھی کہ یہ فوج کے سدھائے ہوئے گھوڑے ہیں۔ شہر میں انہیں کسی جگہ فروجی نے جن میں بعض سوار بھی تھے۔ ان پانچوں نے انہیں مسکرا کر انہی کی زبان اور انہی کے پسے میں سلام کیا۔ شہری فوج سے اتنے دُورے ہوئے تھے کہ انہیں دیکھ کر پرے ہٹ جاتے اور سلام کرتے تھے۔ وہ خوارزم کی فوج کا لباس اور نیزوں کی جھنڈیاں اپنے ساتھ لائے تھے اور ان کے گھوڑے فوج کے تھے۔ وہ خود بھی فوجی تھے اس لیے انہیں اداکاری نہ کرنی پڑی۔

جنہیں کی راہنمائی میں وہ محل کے صدر دروازے تک پہنچے۔ وہ بہت بڑا خطہ سول لے رہے تھے۔ پکڑے جانے کی صورت میں انہیں معلوم تھا انہیں کیسی سزا

یہ چار سینے سلطان محمود کی کرتار ہے۔ اسے اس کامیاب بغاوت کی اطلاع آٹھویں منزل کی تھی۔ اس کے سامنے دو سٹے تھے۔ ایک یہ کہ وہ اتنی زیادہ فوج اور رسد سے حملہ کرنا چاہتا تھا کہ پورے خوارزم کو ایک ہی ہتے میں لے لے۔ کشتیر کی شکست کے زخم ابھی پرری طرح طے نہیں تھے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو فرار کرنا چاہتا تھا۔ انارالوز راؤ میں لکھا ہے کہ اس نے اپنی بہن کا مسئلہ اپنی مشہور قی کوئل کے سامنے رکھا۔ سب مشیر اور سالار بھڑکے ہوئے تھے۔

”میرا سینہ انتقام کی آگ سے جل رہا ہے۔“ سلطان محمود نے شاہ قی کوئل سے کہا۔ ”میرا بہن کوئل ہو گیا اور میری بہن بیوہ ہو گئی ہے ساگر میں اتھامی کاروان کا فیصلہ خود کیا تو یہ میری ذاتی رنجش کا بدلہ ملے گا۔ تاریخ یہ کہنے کی کہ میں نے ذاتی انتقام لینے کی خاطر وہ مسلمان فوجوں کا خون بہا دیا ہے۔ آپ صحت حال سامنے رکھ کر مجھے سوزہ دیں۔ یہ بغاوت فرنگیوں نے کرائی ہے اور ایک اسلامی ملک کو تباہی کے رستے پر ڈال دیا ہے۔ کچھ عرصے بعد خوارزم پر فرنگی چھا جائیں گے اور آپ کچھ کہیں کہ اس کے نتائج غزنی کے لیے اور اسلام کے لیے کیا ہونگے۔“

”کاکھی غزنی کی آبرور ہے۔“ وزیر نے کہا۔ ”اسے دیاں سے نکالنا ہم سب کے لیے ضروری ہے۔ اگر ہم نے حملہ کیا تو کاکھی قتل ہو جائے گی اور اس کے ساتھ نہ مسلم کیا سلوک ہو۔“ الپتگین کو پیغام بھیجا جائے کہ وہ کاکھی کو باعزت طریقے سے واپس کر دے۔ اگر نہ کرے تو چھاپہ مندوں کے ذریعے اسے فرار کرایا جائے اور اس کے بعد خوارزم پر فوج کشی کی جائے۔“

سب نے اس کی تائید کی۔ کچھ اور شورے پیش ہوئے، پھر ایک بلان سدا ہو گیا۔ ایک اپنی کراس پیغام کے ساتھ جڑ جانی پہنچ دیا گیا کہ کاکھی کو باعزت طور پر راکر گیا۔

غزنی اور جرجانیہ کے درمیان سات سو میل کا فاصلہ تھا جس میں آدھا علاقہ پہاڑی

یا اونٹ ساتھ لائے تھے۔ جو خود آسکے انہوں نے اپنے گھوڑے سے دیئے۔
اُس نے جب کُڑج کا حکم دیا اُس وقت اُس کی فوج کی تعداد (مورخ بیہقی کے مطابق)
ایک لاکھ (سوار اور پیادہ) تھی اور پانچ سو تھی تھے۔

وہ فوج کو بلج لے گیا۔ اس سے آگے بڑھی وسیع و عریض صحرائے تبتا۔ سلطان نے
صحرے پہنچے گا۔ اہتمام کر رکھا تھا کہ بیس ہزار بڑی کشتیاں تیار کر رکھے تھیں کہ فوج کے مقام پر
دریا کے کنارے رکھ دی تھیں۔ دینے اور کس کا رُخ خوارزم کی طرف تھا۔ سلطان کی
فوج گھوڑے، اونٹ، اونٹ وغیرہ کشتیوں میں سوار ہو گئے۔ سامان بھی لادیا گیا۔
یہ بیڑہ دریا کے بہاؤ کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ یہ کشتیوں کا سب سے بڑا بیڑہ تھا جو کبھی باہر
نے کبھی دیا میں ڈالا ہو۔

یہ بیڑہ ہزار اسب سے آگے نکل گیا اور خوارزم کے دارالحکومت۔ جانیہ سے تھکی
دور جا رہا۔ تمام فوج کشتیوں سے اتر آئی اور عارضی طور پر خیمہ زن ہو گئیں۔
لکھا ہے کہ انکسین کہ جب سلطان محمود کی آمد اور اس کی بگلی طاقت کو اطلاع ملی تو اُس
نے سلطان کے پاس اپنے اعلیٰ صلیح نامے کی شرائط کے ساتھ بھیجے کہ سلطان محمود نے
صلح کی جو شرائط بتائیں وہ اتنی سخت تھیں کہ انکسین۔ رزیا، گھبرایا۔ اُس نے
خوارزم کی تمام تر فوج اکٹھی کی تو اس کی تعداد پچاس ہزار تھی۔ اُس نے تین چار
بڑے ہی قابل اور تجربہ کار سواروں کو صرف اس لیے مراد دیا تھا کہ وہ ابوالباس
کے حامی تھے۔ کچھ فوجی مشیر بھی اس کے ہاتھوں سے گئے تھے۔

جنگ کی ابتدا سلطان محمود کے۔ یہ نقصان دہ اور بہت بڑی ہوئی۔ اُس کی فوج
کے ہراول دستے اس کے مشہور اور بڑے ہی تجربہ کار سالار ابو عبد اللہ محمد الطائی کی
زیرِ کمان فوج کے بڑے کیمپ سے دور آگئے خیمہ زن تھے۔ صبح کی نماز کا وقت تھا
اور تمام تر فوجی باجماعت نماز پڑھ رہی تھیں۔ خوارزم کے سالار خضر طاش کے دستے
قریب ہی تیار کھڑے تھے۔ شاید خضر طاش کو معلوم تھا کہ سلطان محمود کے حکم کے مطابق
خبرگاہ میں فوج باجماعت نماز پڑھا کرتی ہے۔ اُس نے یہی موقع سوزوں سمجھا اور
سوار دستوں سے حملہ کر دیا۔

ملے گی۔ وہ خود اہمادی سے دروازے میں داخل ہو گئے۔ وہاں کے بہو راجوں
نے انہیں اپنی فوج کے سوار سمجھتے ہوئے نہ روکا۔ جس انہیں ایک راستے سے
اُدھر لے گیا جہاں گاہ کا کبھی کا کمرہ تھا۔ محل کی اندرونی دنیا میں بھی کئی جگہ فوجی نظر
آئے۔ وہ اللہ کا نام پلٹے پلٹے پڑھتے گئے۔

جہیں نے ایک جگہ اپنے ساتھیوں کو روک لیا اور ایک سوار اور فالتو
گھوڑے کے ساتھ محل کے کئی حصے میں غائب ہو گیا۔ وہ دونوں گھوڑوں سے
اُترے اور گاہ کا کبھی کے کمرے والی غلام گردش میں چلے گئے۔ آگے سنتری کھڑا تھا۔
یہ گاہ کا کبھی کا کمرہ تھا۔ جہیں نے سنتری سے کہا دروازہ کھولو۔ خاتون کو خوارزم
شاہ انکسین کا پیغام دینا ہے۔ سنتری نے دروازہ کھول دیا۔ دونوں سنتری کو
دھکیل کر اندر لے گئے اور تلواروں کی نوکیں اُس کے پیٹھ سے لگا کر اُس کی ددی
اُڑوائی، پھر اُس کے منہ میں کپڑا ٹھونس کر اُس کے ہاتھ پاؤں رستوں سے باندھ
دیئے۔ گاہ کا کبھی سے کہا کہ وہ فوراً یہ ددی پہن لے۔

وہ جب باہر نکلے تو کابھی ددی میں لبوس تھی۔ چھاپہ ماروں نے دروازہ بند
کر کے چھٹی چڑھادی اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ فالتو گھوڑا کابھی کے لیے لے جایا گیا
تھا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے چلے اور فوجی شان سے فوجی ترتیب میں محل کے صدر
دروازے سے بھی نکل گئے۔ شہر سے گذرتے اُن کی چال دبی رہی۔ وہ اُسی باوقار
پہل سے شہر سے بھی نکل گئے۔ شہر جب دھڑک اُٹھا۔ اونٹ میں ہو گیا تو انہوں نے
گھوڑوں کو ایڑ لگادی۔ گاہ کا کبھی گھوڑا سواہی کی ماہر تھی۔ اُس نے چھاپہ ماروں کو
احساس نہ ہونے دیا کہ وہ عورت ہے اور مردوں کی طرح آتا لبا اور اتنا کھن سفر
نہیں کر سکے گی۔

سلطان محمود فوج کی کمی بہت حد تک پوری کر چکا تھا۔ اما سوں سے مسجدوں
میں کچھ عرصے سے اعلان کرانے جا رہے تھے کہ فوج کی کمی پوری کرنے کے لیے
رضا کلادوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ ہزار رضا کار فوج میں آگئے۔ وہ اپنے گھوڑے

کشتیوں پر سوار ہو کر جڑجانیہ کی سمت چلے جانا اور جڑجانیہ کے قریب جا کر کشتیوں سے نکل کر شہر چھوڑنا تھا۔ دوسرے دن سلطان محمود نے کوئی حرکت نہ کی۔ وہ تاثر یہ دینا چاہتا تھا کہ وہ ابھی چلے کے لیے تیار نہیں۔ البتگین فوجیوں کو ضرب میں اتاریں تھا۔ اُس کا ایک سالار خورشید جو چکا تھا۔ سالار ابواسلمی کو اُس نے دیا کے قریب کہیں ریزرو میں رکھا تھا۔ دوسرے قابل سالاروں اور نائب سالاروں کو وہ قتل کر چکا تھا۔

وہ سلطان محمود کی چال نہ سمجھ سکا، نہ اُس نے سلطان کی فوج کی تقسیم دیکھی۔ اُس نے اپنے دشمن کی ترتیب اور تنظیم کا بھی جائزہ نہ لیا اور اس خوش فہمی میں حملہ کر دیا کہ غزنی کی فوج ابھی نہیں میں ہے۔ پندرہ ہجری ۸۴۸ھ (۳ جولائی ۱۰۱۷ء) کا دن تھا۔ اُس وقت غزنی میں الفحل نے اس معرکے کی جو تفصیل لکھی ہے، اس کے مطابق البتگین نے اپنی فوج کی قیادت خود کی۔ وہ سب سے آگے تھا۔ اُس نے دائیں بائیں کا خیال رکھتے بغیر سامنے سے حملہ کیا۔

اس وقت کی دیگر تحریروں کے مطابق البتگین کے پیادوں نے بے جگری کے مظاہرے کئے اور بڑی بہادری سے لڑے۔ وہ غزنی کے خلاف لغرے لگا رہے تھے اور انہیں خد کے بھیجے ہوئے غیب کی خبریں دینے والے فقیروں کا قاتل کہہ رہے تھے۔ ان کے دلوں میں سلطان محمود اور غزنی کی فوج کے خلاف بڑی کادش سے نفرت پیدا کی گئی تھی۔ وہ نفرت میدان جنگ میں بے پناہ قوت بن گئی تھی۔ اگر فتح صرف بہادری سے لڑنے اور قہر و غضب سے کشت و خون کرنے سے حاصل ہو سکتی تو فتح البتگین کی تھی، لیکن چالیس سلطان محمود کی فوج تھیں۔

لیک تو سلطان نے گھوڑے سے اتر کر دو رکعت نفل پڑھے اور خدا سے مدد مانگی، دوسرے اُس نے البتگین کے دائیں پہلو پر ہاتھیوں سے حملے کا حکم دیا۔ ابھی ایک ہاتھی میدان جنگ میں نظر نہیں آئے تھے۔ ہاتھی پہلو سے آئے۔ تمام ہاتھی چنگ لڑ رہے تھے۔ نوازرم کی فوج بھی ہاتھیوں کے خلاف نہیں لڑی تھی۔ سپاہی گھبرا گئے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ ہاتھی جتنا ہیبت ناک لگتا ہے، اتنا ہی کمزوریوں کا جال ہے۔ ہاتھیوں

ابو عبد اللہ محمد الطائی جس کا نام یخون میں احرام اور ہیبت سے ذکر آیا ہے، انتہائی مشکل حالات میں معرکے لڑنے اور جیتنے والا سالار تھا۔ میدان جنگ میں جنگی چالوں اور اعلیٰ قیادت کے لحاظ سے سلطان محمود کا ہم پلہ تھا مگر اُس پر ناز کی حالت میں حملہ ہوا۔ دسے جیتے تھے اور ایک جگہ جمع تھے۔ انہیں یہ عقیدہ تھا کہ ان کی ہیبت نہ لی اور سلطان محمود کی فوج کے بہترین دسے مارے گئے۔ سالار الطائی اپنے چند ایک کمانداروں اور سپاہیوں کے ساتھ پیچ نکلا۔

سلطان محمود کو اطلاع ملی تو اُس نے قلب کے باڈی گارڈز کو خورشید کے دستوں کے تعاقب میں بھیج دیا۔ اطلاع یہ ملی تھی کہ خورشید، محمد الطائی کے دستوں کو کھینچا ہوا نکل گیا ہے۔ باڈی گارڈز کا دست فوج کے چنے ہوئے سپاہیوں کا دست تھا۔ گھوڑے بھی چنے ہوئے تھے۔ خورشید دور نہیں گیا تھا۔ اُس کے اور اُس کے دستوں کے حوصلے بلند ہو گئے تھے۔ وہ پہلے بلے کی کامیابی پر خوش ہو رہے تھے اور ذرا آرام کے لیے رُک گئے تھے۔

یہ ریگستان تھا۔ انہیں گرد کے بادل اٹھتے دکھائی دیئے۔ خورشید نے گرد سے اندازہ لگایا کہ غزنی کے بہت سے دستے جوانی چلے کے لیے آرہے ہیں۔ اُس نے حملہ نہ کرنے کی تیاری کا حکم دیا۔ سوار گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ سلطان کے بائیں گانڈ کا دست گھیرے میں لینے کی ترتیب میں ہو گیا۔ خورشید کے سواروں نے گھیرے سے نکلنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ دوڑتے گھوڑوں کی اڑائی ہوئی گرد سے انہیں سلطان محمود کے حملہ آور دستوں کی صحیح نفی کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ وہ آگے بڑھ کر لڑنے کی بجائے پیچھے ہٹنے اور نکل بھاگنے کے لیے لڑ رہے تھے۔

اس معرکے کا فیصلہ بہت جلد ہی ہو گیا۔ خورشید کپڑا گیا اور اس کے دسے کو بہت بڑی شکست ہوئی۔

سلطان محمود نے رات کو اپنی فوج کو کھینچ کر اپنے منظم لڑا۔ فوج کے ایک حصے کو دیا کے کنارے بھیج دیا۔ اس حصے کو ہاتھیوں کا ہاتھ لگا کر اٹھا کر دیا۔ انہیں

دیے لیکن زیادہ گھرے پانی میں نہ گئے۔ سلطان محمود نے اگر صورت حال دیکھی تو اُس نے گھوڑ سواروں کو دریا سے نکل آنے کا حکم دیا۔

اُس وقت کے ایک دماغ نگار ابن اسفندیار نے لکھا ہے کہ دارالکومت جرجانیہ کے لوگ چار ہینوں میں ہی انگلیں کی فوجی حکومت سے اس قہر حال ہو گئے تھے کہ ہر کسی پر گرفتاری کا خوف طاری رہتا تھا۔ بدلتی ایسی کہ عدل و انصاف پایید ہو گیا۔ سیاہی کی بات حکم کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان لوگوں کو ہتہ چلا کہ دریا میں غزنی اور خوارزم کی فوج کی لڑائی ہو رہی ہے اور پھر صحرائی لڑائی سے بھاگے ہوئے پابیسوں سے ہتہ چلا کہ انگلیں اور غلطاش پکڑے گئے ہیں تو شہر کے لوگ ہنرے، ابھالے، تلواریں، اور جو ہر تیار ہاتھ لگا اٹھا کر گھروں سے نکل آئے اور اُس فوج پر لوٹ پڑے جو شہر لوہہ محل کے دفاع کے لیے وہاں موجود تھی۔

دریا کی یہ سب سے بڑی لڑائی سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے اس طرح ختم ہوئی کہ خوارزم کے سالار ابوالاسمان کو جو دریا کے کنارے پکڑے ہیں اپنے دستوں کو احکام دے رہا تھا، شہر کے گلوں کی بنیاد کی اطلاع ملی تو وہاں سے فرار ہو گیا۔ بعد میں اس کے اپنے پابیسوں نے اُسے پکڑ کر غزنی کی فوج کے حوالے کر دیا تھا۔ لوگ فوج کے خلاف اس قدر بھڑکے ہوئے تھے کہ ان میں سے بعض دریا پر چلے گئے اور غزنی کی فوج کی مدد کی۔

سب سے زیادہ بھڑکا ہوا تو سلطان محمود تھا۔ ابن اسفندیار اور ذہبی کہتے ہیں کہ سلطان دریا کے کنارے گھونٹا دوڑا اور تیر اندازوں کو احکام دیتا تھا۔ اُس کے منہ سے جھگڑا چوت رہی تھی۔ رات بھر غزنی کی فوج قیدیوں کو پکڑتی اور اپنی لاشوں اور زخموں کو سنبھالتی رہی۔ سلطان بھی رات بھر جاگتا رہا۔ اُس کے پاس خوارزم کے ایسے شہری اور فوجی حکام آگئے تھے جنہوں نے اُن افراد کی شانہ سی کی جو ابوالعباس کے قتل میں شامل تھے اور جنہوں نے اُس کا تختہ الٹنے میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کیا تھا۔ رات سے ہی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔

کے دائیں اور بائیں پیادہ دستے اور پیچھے گھوڑ سوار تھے۔ ہاتھی بوڑے آ رہے تھے اور زمین بل ہی تھی۔ انگلیں نے اپنی فوج کو جوش دلایا مگر سیاہی کھر گئی۔ دو ہاتھی قلعہ میں چاہتے جہاں انہیں ستارہ قلب نے بہت مقابلہ کیا مگر انگلیں کے بادی کاروں نے چھوڑ گئے۔ شام تک معرکے کا فیصلہ ہو گیا۔ انگلیں بھاگ نکلا لیکن اُسے پکڑ لیا گیا۔

جرجانیہ دارالکومت تھا۔ اس پر قبضہ لازمی تھا۔ سلطان محمود نے فوج کے اُس حصے کو جسے اُس نے دریا کے کنارے بھیج رکھا تھا، کشتیوں میں سوار ہو کر جرجانیہ کی طرف جانے کا حکم بھیج دیا۔ یہ فوج جن کشتیوں میں سوار ہوئی اس کی تعداد کم بیش چار ہزار تھی۔ کشتیاں جب جرجانیہ کے قریب پہنچیں تو سامنے سے تقریباً تین ہزار کشتیاں آ رہی تھیں۔ صبح طلوع ہو رہی تھی۔ انگلیں کے سالار ابوالاسمان کی فوج تھی جسے انگلیں نے ریزہ ریزہ کر دیا تھا مگر اُسے آگے بلانے کی ہمت نہ ملی۔ ابوالاسمان نے اپنے طور پر دیکھ لیا تھا کہ غزنی کی کچھ فوج دریا کے کنارے حکم کا انتظار کر رہی ہے۔ وہ اس چال کو سمجھ گیا۔ اُس نے اپنی فوج کو کشتیوں میں سوار کیا اور جرجانیہ سے آگے آگیا۔

سلطان محمود کی کشتیاں آگے بڑھیں تو دیکھا کہ دشمن دریا کی جنگ کے لیے تیار ہے۔ دونوں فوجیں دریا میں ٹکرائیں۔ کشتیاں قریب کر کے سیاہی ایک دوسرے کی کشتیوں میں کود کر دست بہ دست معرکہ لڑ رہے تھے۔ کشتیاں ایک دوسری سے ٹکرا رہی تھیں۔ الٹ بھی رہی تھیں۔ دریا سرخ ہوتا جا رہا تھا۔

سلطان محمود کو تیر رفتار قاصد نے اطلاع دی کہ دریا میں لڑائی ہو رہی ہے۔ قاصد سیلوں کا تھا۔ پیادہ دستے اتنی جلدی نہیں پہنچ سکتے تھے۔ سلطان نے گھوڑ سوار اور شہسوار دستوں کو بھیج دیا اور خود اُن کے پیچھے گیا۔ یہ دستے جب دریا کے کنارے پہنچے تو دریا میں دودھ بھرا ایک دوسری فوج کی کشتیاں ایک دوسری میں گڈمڈ تھیں۔ شہسواروں نے دریا کے کنارے سے کشتیاں پہچان پہچان کر تیر چلائے۔ بعض گھوڑ سواروں نے یہاں تک شجاعت کا مظاہرہ کیا کہ گھوڑے دریا میں ڈال

...تیس سرکاری خزانے سے اس لیے تو اب اس اور دہلی ملتی رہی کہ اپنے ملک اور مذہب کے دفاع میں اپنی جانیں لڑا دے مگر تم نے اپنے فرائض کو نظر انداز کر کے اپنے ہی ملک پر قبضہ کر لیا اور اپنے مذہب کی آڑ میں قوم کا جینا حرام کر دیا... نہیں ہارے جاؤ اور انہیں کوٹے لگاؤ۔

شہر کی آبادی اُس میدان میں اُمڈ کر آگئی جہاں الپتگین ابوالاسحاق اور خراسان کو کوڑے لگائے جانے تھے۔ اب یہ تم نہیں تھے۔ رات کو اور انہیں بابر میدان میں لانے تک ان کے بہت سے ساتھی بکڑے گئے تھے۔ وہ بھی میدان میں ان کے ساتھ کھڑے تھے۔ چار چار کوٹے لاکر نومند سپاہیوں سے انہیں کوڑے لگوائے گئے۔ ان کی چھین لوگوں کے غروں میں دب گئی تھیں سلطان خود بھی وہیں تھا۔ یہ سہمی، غلجی اور گردیزی تھے جس کو سلطان محمود نے کوٹا زنی بند کرادی۔ انہیں جب ہوش آیا تو انہیں ایک چوڑے پر کھڑا کر دیا گیا اور لوگوں سے کہا گیا کہ ان کے قریب سے گذر کر انہیں دیکھو۔ لوگوں نے انہیں قریب آکر اس طرح دیکھا کہ ان پر تھوکا اور زمین پر زمین پر سے مٹی اٹھا کر ان پر پھینکی۔ انہیں گالیاں دیں، لعن طعن کی اور میدان کے ارد گرد جا کھڑے ہوئے۔

اس کے بعد سلطان محمود نے ایسا حکم دیا کہ ہر طرف سناٹا ماری ہو گیا۔ کسی کو جیسے یقین نہیں آتا تھا کہ یہ سلطان محمود نے حکم دیا ہے۔ حکم یہ تھا کہ ان کے بازو کی پھول سے کاٹ دے، سپاہی دوا ریں پیسے آئے۔ مجبور نے ادھر ادھر بھاگنے کی کوشش کی نہیں کیوں۔ سلطان کو ہلکا پلکا کر کشش مانگی مگر سلطان کے اعصاب پر دونوں فوجوں کے وہ سپاہی چھاتے ہوئے تھے جو ان کی طبع کے نتیجے میں مارے گئے تھے۔ تمام مجبوروں کے بازو کاٹ دیئے گئے۔

سلطان نے اسی پر بس نہ کی۔ اُس نے پہلے ہی پندہ بیس ہاتھی منگو کر ایک طرف کھڑے کر رکھے تھے۔ اس نے حکم دیا کہ ان پر ہاتھی چھوڑ دو۔ ہر ہاتھی پر ایک بہارت سوار تھا۔ ہاتھی دھڑتے آئے۔ مجبوروں کے پاؤں میں ٹیریاں تھیں۔ ان سے

اچھے روز الپتگین اسالار ابوالاسحاق اور سالار خراسان کو سلطان کے سامنے پیش کیا گیا۔ اُس دہر کے تین بھروسوں اور تاریخ نویسوں۔ بیہوشی، غلجی اور گردیزی نے اُن سزاؤں کی جو ان تینوں کو اور ان کے معاونین اور مشیروں کو سلطان نے دیں، تفصیل لکھی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ سلطان محمود کو اتنے قہر اور غضب میں کبھی نہیں دیکھا گیا تھا۔ اُس نے ان لوگوں کو جو سزائیں دیں، ان کے تصور سے سلطان خود بھی کانپ اٹھا۔ جو گا۔ وہ ظالم اور تبار سلطان نہیں تھا لیکن وہ اپنے قابو میں نہیں رہا تھا۔

”تم تینوں صرف ابوالعباس کے قاتل نہیں ہو“۔ سلطان محمود نے ان تینوں سے کہا۔ دو بولتا تھا تو اُس کے منہ سے تھوک کے چھینٹے اڑتے تھے۔ یہ غصے کی انتہا تھی۔ اُس کے ہاتھ بھی غصے سے کانپ رہے تھے۔ اُس نے کہا ”تم ان ہزاروں آدمیوں کے قاتل ہو جو دونوں کی لڑائی میں دونوں طرف سے مارے گئے ہیں۔ اپنی فوج کے جانی نقصان کا حساب کرو۔ یہ فوج نہ تمہاری ہے نہ میری۔ یہ اسلام کی فوج تھی۔ یہ اللہ کے سپاہی تھے جنہیں تم نے اپنے سروں پر سمانے کے لیے ایک دوسرے کا قاتل بنادیا۔“

سلطان محمود غصے سے اٹھ کھڑا ہوا اور گرج کر بولا۔ ”تم نے خون دیکھا ہے جو سحرانے جو سب لیا ہے، تم نے وہ خون دیکھا ہے جو دنیا میں بہا گیا ہے، تم نے سب لیا ہے۔ تڑپ تڑپ کر سرتے زخمیوں کو دیکھا ہے، فریادوں کی آمد سے سخت پریشانے والو اسی کی بات کرنے والوں کی گردنیں کاٹنے والو ہاتھ میں قرآن لے کر لوگوں کو قریب دینے والو! اپنے آپ کو سب مسلمان کہہ کر سب مسلمانوں کا خون پانے والو! تم خدا کی موجودگی کو بھول گئے تھے۔ تم بھول گئے تھے کہ خدا اپنے مظلوم بندوں کی فریادیں سنتا ہے۔ تم نے اپنی قوم کی قسمت سوریوں اور عینائوں کے ہاتھوں میں دے دی۔ تمہاری عقل پر اور تار سے ایمان پر فرنگی عورت، مزدو جہرات، شراب اور حکومت کا ظلم طاری ہو گیا تھا۔ تم نے اپنا ایمان بچا۔ ایمان فرشتوں میں بُت شکن ہوں اور تم باطل کے بُت ہو۔ میں تمہیں اُسی طرح توڑ کر ریزہ ریزہ کروں گا جس طرح میں نے ہندوستان کے بُت توڑے ہیں

گدیہ، گیند اور کتے لاشوں کی ہڈیاں لوج رہے تھے۔ سلطان محمود کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اُس نے ناکہ کے لیے ہاتھ اٹھائے اور جب اُس نے ہاتھ منہ پر پھیرے تو ہاتھ آنکھوں پر ہی رہنے دیئے۔ وہ سکیاں لے رہا تھا۔

وہ آہستہ آہستہ صرف چل سکتے تھے۔ وہ ہاتھوں سے کپنے کے لیے ادھر ادھر ہوئے لیکن بہادروں نے ہاتھوں کو گھما پھرا کر سب کو کھل ڈالا۔ تین چار بار ہاتھی ان کے اوپر سے گذرے گئے۔

اس کے بعد ان تمام کی کچل کچل ہوئی لاشیں اٹھوا کر ابوالباس کی قبر تک لے جانی گئیں اور ان کی گردنوں میں رت سے ڈال کر کٹری کے اُن کھیل کے ساتھ لٹکا دیا جو اسی مقصد کے لیے دہلی پہلے ہی گاڑ دیئے گئے تھے۔

چند دن اور کوئی نہ کوئی بکڑا جاتا رہا۔ اُس کا جرم ثابت ہونے پر اُسے سی سزا دی گئی، پھر کچھ دھڑبند کر دی گئی۔ سلطان محمود نے الطغش کو خوارزم کا خوارزم شاہ بنادیا اور ابرار سلطان جاذب کو اُس کا نائب مقرر کیا اور خوارزم کو سلطنت غزنوی میں شامل کر لیا۔ ان دونوں نے جاسوسی اور ہجری کے نظام کو بڑے دیوانہ سہلی اشراف مملوکات لٹکا جاتا تھا خوب استعمال کیا۔

سلطان محمود کا یہ حکم آج کی انٹیلیجنس کا کام کرتا تھا۔ اس میں کام کرنے والوں کو مشرف کہا جاتا تھا۔ دشمن کے ملک میں اس ملک کے جس باشندے کو اپنا تجربہ لکھتے بنایا جاتا، اُسے بھی مشرف کہتے تھے۔ یہی نے لکھا ہے کہ مشرفوں کو سلطان محمود بے دریغ بخوارزم اور الادنس اور العات دیا کرتا تھا۔ ان کے اہل دیال کو وہ الگ دیکھنے دیتا تھا۔ اس موقع کے مطابق سلطان محمود کے مشرف اتنے ہوشیار تھے کہ اپنے دشمن ملک کے بادشاہ کی سالیس بھی کنیا لے کر لے جاتے تھے۔

الطغش ابرار سلطان جاذب نے اس محکمے کے بڑے ہوشیار اور ذہین مشرف غزنوی سے بلائے، کچھ خوارزم سے لے کر اراک زمین و درختوں کی کاروائیوں کا سربراہ نکالا جو ہندو اور عیسائیوں نے ابھی تک جاری رکھی ہوئی تھیں۔ انہیں اور ان کے مقامی کنبہوں کو گورنر کر کے دیہی سرائیں دی گئیں جہاں انکے زمین و غیرہ کو دی گئی تھیں۔ شہریوں کے بنیادی حقوق بحال کر کے اُن میں خود اعتمادی پیدا کی گئی۔

سلطان محمود جب غزنوی کو واپس جارا تھا تو صغریٰ اُس جگہ تک گیا جہاں دونوں فوجوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ وہ بہت دیر دہلی کھڑا اور ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ دہلی ابھی تک

طوفان جو غزنی سے آیا

سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں ان ریاستوں کی بڑی آب و تاب تھی مگر سلطان ان پر تسلیم کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ تھا سرتک کے نت توڑ کردار اپنی چوکیاں قائم کر گیا تھا۔ پنجاب کا ملراج بھیہم پال نڈر بھی اُس کا باا بجزار تھا۔ چھوٹے چھوٹے رلے اور رلے تو سلطان محمود کے نام سے بھی ڈرتے تھے۔

۱۰۱۴ء میں جب سلطان محمود نے خوارزم کو سلطنت غزنی میں شامل کر لیا تو سترائیں ہندوؤں کا سالانہ اجتماع تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے تمام تر ہندوستان کی آبادی سترائیں آگئی ہو شہر میں بڑے مندر میں اور دریا کے کنارے مرد اور عورتیں جیوٹھیوں کی طرح نکل آئی تھیں۔ کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ شہر کے باہر چھوٹے بڑے ہزاروں محلے نصب تھے۔ شہر سے دو تین میل دور جنگل میں کہیں کہیں رنگارنگ کپڑوں کے محل کھڑے نظر آتے تھے۔ یہ راجوں ماراجوں کے شامیانے اور تباہی تھی۔ ان کے ارد گرد ان کے سماندھنوں کے خیمے تھے۔ ان کے ساتھ ہاتھی اور گھوڑے بھی تھے۔ راجے ہمارا بے بھی ستر کی پرارتھنا اور جن کے اشنان کے لیے آئے تھے۔

زیادہ دیر اور دلکش قیام گاہ ماراجہ تنوج راجا پال کی تھی اور اسی ہی قیام گاہ پنجاب کے ماراجہ بھیہم پال نڈر کی تھی۔ ان کے اندر جا کر کوئی کہ نہیں سکتا تھا کہ یہ شامیانے اور تباہی میں بظاہر رنگ خالو سون ہندوؤں اور برہمنی پرور نے کل کاماں باندھ رکھا تھا۔ راجوں ماراجوں کی بیویاں اور ناچنے گانے والیاں بھی ساتھ تھیں مگر ستر کے بندتوں کے تہ تیہ کو کبھی کورس و سرود کی محفل گرم کرنے کی جرات نہیں ہوتی تھی۔ یہاں تو ہر سال میلے کا سال ہو کا تھا ہر کے آئے ہوئے لوگ بھی ناچا اور گایا کرتے تھے مگر اب جیوٹھیوں جیسے اس نجوم پر اداسی بھی طاری تھی اور بدبخت بھی۔

اس اداسی اور بدبختی کا باعث سلطان محمود غزنوی تھا۔ ہندوؤں کے لینے "محمود خوف اور نفرت کا ایک نام بن گیا تھا۔ ہندوؤں کی زبان پر سی الفاظ تھے۔ "ہوٹھو دیوا در کشن واسد یو کے قہر سے تم بچ نہیں سکو گے"۔ یہ بھاری اور باہر سے آئے ہوئے لوگ بھی ایک آواز سننے لگے۔ "دیوی دیوتاؤں کی تعین کر کے تم زندہ کس طرح ہو۔ ہزاروں کو سوتے اور پیٹ بھر کر کھاتے کس طرح ہو۔ جب تک تم غزنی کی اینٹ

دیکھو کے جنوب شرق میں تقریباً دو سو میل دگرگھا کے دائیں کنارے پر قنوج کا ایک شہر ہے۔ سلطان محمود غزنوی کے زمانے میں قنوج ایک طاقتور ہندو ریاست کی راجہ خانی تھی۔ وہاں کے ہمارا جہ کام راجا پال تھا۔ درخ لکھتے ہیں کہ شمال ہند میں قنوج کے راجکاروں کو باعزت مقام حاصل تھا۔ وہی سے اتنی بچا سی میل جنوب میں جنگل کے کنارے ستر کا شہر ہے جو ہندوؤں کے مطابق چلہ ہزار سال سے مقدس چلا آ رہا ہے۔ ان کا کرشن ہمارا ج ستر میں ہی پیدا ہوا تھا۔ آج بھی ہر سال دھرم سے ہندو ستر جاتے اور عبادت کرتے ہیں۔

ستر میں ایک بڑے مندر کے علاوہ چند اور چھوٹے مندر تھے۔ یہ تراشے ہوئے پتھروں سے تعمیر کیے گئے تھے۔ ان کے کمرے، راہداریاں اور اندرونی راستے بھول بھلیوں جیسے تھے۔ شہر کے اندر مضبوط دیوار تھی اور ایک قلعہ بھی تھا۔ ستر الگ ریاست نہیں تھی۔ ان کے دفاع کا ذمہ واری قنوج کے ہمارا جہ راجا پال اور پڑوس کی ایک اور چھوٹی سی ریاست مابن کے حکمران رائے کوئل چند نے سنبھال رکھی تھی۔ کچھ اور رائے اور راجے میں بھی تھے جنہوں نے ستر کے دفاع کے لیے اپنی اپنی فوجی نفری دے رکھی تھی۔

ستر سے ملتی ریاست مابن گھنے جنگلوں کا علاقہ تھا۔ راجہ مان کام مابن تھا۔ یہ بھی جن کے دائیں کنارے پر واقع تھا اور یہ ستر سے پچیس میل کے لگ بھگ دور تھا۔

دے کر کہا کہ ہمارے ساتھ رہو۔ کوئی ہرن نظر آیا تو اسے بھگا۔ ہنّے۔ تم دوڑتے گھوڑے سے ہرن کو ایک تیر میں گرا لینا۔ اگر تیر خطا گیا تو گھوڑا ہم لے لیں گے۔ انہیں زیادہ دور نہ جانا پڑا۔ ایک جگہ سات ہرن کھڑے تھے۔ مہاراجہ کے کہنے پر اُس کے آدمیوں نے شور مچایا تو ہرن بھاگ اُٹھے مگر ناکھن ناکھن ان کے پیچھے گھوڑا ڈال دیا۔ اُس کے پیچھے مہاراجہ نے بھی گھوڑے کو اپڑ لگادی۔ ہرن ہوا میں اُچھلنے اور اُڑنے لگے مگر ناکھن نے گھوڑے کی باگ اپنے دانتوں میں پکڑ لی۔ کہاں آگے کر کے اس میں تیر ڈالا اور تیر چھوڑ دیا۔ ایک ہرن اڑان بنا جست سے زمین پر آیا تو اوپر نہ اُٹھ سکا اور اُٹھ کر دوڑ پڑا۔ اس کے ساتھ اُس کے نکل گئے۔ اور مگر ناکھن کا گھوڑا اس تک پہنچ گیا۔ تیر ہرن کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گیا تھا۔

”میں بھی رائے کی فوج کا کمانڈر ہوں۔“ مہاراجہ راجا پال کو اُس نے بتایا۔ مگر بھی رائے نے ایسی بڑی شکست کھائی کہ اُس کی آدھی فوج مری گئی اور آدھی غرنی والوں کی قیدی ہو گئی۔ میل مل پھیکا پڑ گیا۔ میں لاہور کی فوج میں چلا گیا مگر یہ فوج بھی غرنی کے مسلمانوں سے شکست کھا گئی۔ اب لاہور کا راجہ محمود غزنوی کا بابا بھڑار ہے۔ میں سپاہی ہوں۔ کمانڈری کے عہدے پر تھا۔ میں کسی غیرت مند مہاراجے کی فوج میں شامل ہونا چاہتا ہوں۔ میں نے سنا ہے کہ تنوچ کے راجپوتوں میں غیرت ہے۔ میں اس جنگ میں آپ سے ہی ملنے آیا تھا۔“

مہاراجہ نے اس کے ساتھ کچھ باتیں کیں تو اُس نے محسوس کیا کہ یہ خبر بد جوان حرف تیر اور تلوار کا دھنی نہیں، اس میں عقل بھی ہے۔ مہاراجہ اس سے آنا متاثر نہ ہوا کہ اُسے اپنے محافظ دوتے میں رکھ لیا۔ مگر ناکھن بر قوی اور مذہبی جذبات غالب تھے۔

وہ محمود غزنوی اور دوسرے مسلمانوں کے خلاف زہر آلود لغرت کا اظہار کیا کرتا تھا۔ اُس کی زبان میں کچھ ایسی چاشنی تھی کہ مہاراجہ راجا پال نے اُسے اپنا دیہاسی ذاتی محافظ بنا لیا جیسے آج کل ملکوں کے سربراہوں کے اے۔ ڈی۔ سی ہوتے ہیں۔ اس کے لیے زرق برقی لباس سلوا گیا۔ وہ جب دیوار میں مہاراجہ کے پیچھے کھڑا ہوتا تھا تو اس کے پاس رنگدار برہمن رہتی تھی جس کے پھل پر سونے کا پال چڑھا ہوا تھا۔ مہاراجہ جہاں جاتا

سے لٹ نہیں بجا دو گئے اور محمود کے خون سے کشن واسد یو کے پاؤں نہیں دھو گئے اور دوتاؤں کا قہر لے گا نہیں۔ اب گنگا جمل اور جہاں جمل تیس پاک نہیں کر سکتا۔ کشن واسد یو (کشن مہاراج) کے پاؤں پر ماتھے دگڑنے والے اب اس بُت کی آنکھوں میں دیکھنے سے ڈرتے تھے۔ وہ جب بُت کے پاؤں پر ماتھا رکھتے تو ان کے آنسو بہنے لگتے تھے۔ مندر کی گھنٹیوں میں بھی اداسی تھی۔ بچوں والی عورتیں اتنی ڈری ہوئی تھیں کہ اپنے بچوں کو دیوتاؤں کے قہر سے بچانے کے لیے ان کے قدموں میں اپنے زیورات اتار کر رکھ دیتی تھیں۔ مرد بُت کے آگے ماتھا جوڑ کر تھیں کھاتے تھے کہ وہ اپنے مندر میں اور دیوتاؤں کی توبہ کا انتہا لیں گے۔ بعض بلند آواز سے کہتے تھے کہ اب محمود آیا تو وہ اسے اور اس کی فوج کو زندہ واپس نہیں جانے دیں گے۔

راجا پال مہاراجہ تنوچ جب کشن واسد یو کے بُت کی پوجا کرنے اندر گیا تو اس کا خاص محافظ مگر ناکھن بھی اُس کے ساتھ تھا۔ مگر ناکھن گھٹے ہوئے دل کشن جہم کا دروازہ قہر اور خور آدمی تھا۔ اُس کے چہرے پر صمت اور جلال کی سرخی تھی۔ اُس کی سکر بیٹ میں کشن واسد یو کی آنکھوں میں جادو کا اثر تھا۔ وہ شہسوار تھا۔ تیغ زنی اور تیر اندازی میں اُسے جہماریت حاصل تھی، وہ کم ہی کسی میں تھی۔ اُسے مہاراجہ راجا پال کے پاس آئے دو سال ہو گئے تھے۔ اُس نے پہلی ملاقات میں ہی مہاراجہ کا دل سوا لیا تھا۔ یہ ملاقات جنگ میں اُس وقت ہوئی تھی جب مہاراجہ ٹھکانہ کھیل رہا تھا۔ مہاراجہ نے ایک ہرن پر تیر چلایا تو ہرن تیر کان سے نکلتے ہی بھاگ اُٹھا اور تیر خطا گیا۔ اچانک مگر ناکھن سامنے آ گیا۔ مہاراجہ کے محافظوں نے اُسے دھن سے ہٹانے کو بڑا بھلا کہا۔ اُس نے مسکرا کر مہاراجہ سے کہا کہ میں اُڑتے ہرن کو تیر سے نہ گرا سکوں تو تیر گھوڑے لیا جائے اور مجھے دھتے دے کر یہاں سے چلا گیا جائے۔

ہرن جب تیر دوڑتا ہے تو اتنی لمبی جوکڑیاں بھرتا ہے جیسے اُڑا رہا ہو۔ اس کا ایک ایک بُت پیمپس میں گڑبسی ہوتی ہے اور وہ زمین سے سات آٹھ انچ اوپر اُٹھ جاتا ہے۔ مہاراجہ راجا پال نے دیکھی اور مذاق کی خاطر اُسے تین کان اور صرف ایک تیر

جگن ناتھ اس کے ساتھ ہوتا۔ وہ مدارج کی شان و شوکت کا حصہ بن گیا تھا۔
راجپال کی تین رانیاں تھیں جگن ناتھ کے فرائض میں رانیاں کی حفاظت بھی شامل تھی۔
کوئی رانی نہیں جاتی تو جگن ناتھ بھی گھوڑے پر سوار گھوڑا گلاڑی کے ساتھ ساتھ جاتا
تھا۔ اس طرح جگن ناتھ سجادت کی ایک چیز بن گیا تھا۔
مدارج راجپال بڑے مندر میں بت کی پوجا کے لیے اندر گیا تو جگن ناتھ بھی اُس
کے ساتھ تھا۔ مدارج نے شن واسدلو کے پاؤں پر جو سنگ مرمر کے تھے، ہاتھ مار گڑا۔
اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور عہد کیا کہ وہ محمود غزنوی کا سر اس مندر میں اس بت
کے قدموں میں کاٹے گا۔

”اے میں عہد کرتا ہوں۔“ جگن ناتھ نے ہاتھ جوڑ کر بت سے کہا۔ ”اگر ہم
سلطان محمود غزنوی کو یہاں نہ لاسکے تو میں اپنا سراپہ ہاتھوں کاٹ کر تیرے قدموں
میں رکھ دوں گا۔“

مدارج نے جو تک کر جگن ناتھ کو دیکھا۔ جگن ناتھ انھیں بند کیے، ہاتھ جوڑے
ہوئے جگن ناتھ بڑے پنڈت نے دونوں کے آگے سلگتے ہوئے لوہان کی
لمٹری گھائی۔ مدارج نے لوہان کی راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ جگن ناتھ نے بھی انگلی سے
راکھ اپنے ماتھے پر لگائی۔ مدارج نے اپنے گلے سے ہار اتاراجو بست تہمتی تھا، اور یہ
بت کے پاؤں پر رکھ دیا۔

”مدارج!۔“ بڑے پنڈت نے راجپال سے کہا۔ ”ہری کرشن کو ان پٹھے
موتیوں کی نہیں، موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے خون کے قطرہوں کی ضرورت ہے۔ یہاں
اپنے بیوتوں کا خون مانگ رہا ہے۔ بھارت ماما کی بے عزتی کا انتقام نہ لینے والے مدارج
کو بن باسی ہو جانا چاہیے۔“

”انتقام لیں گے۔“ مدارج تنوچ نے بت کی آنکھوں میں دیکھ کر کہا۔ ”غزنی
کے محمود کا سر اس مندر کے دروازے پر لٹکا رہا کرے گا۔“

دن کے وقت دیوار بنانے والوں کا اتنا ہجوم رہتا تھا کہ پانی میں کہیں کھڑا ہونے

کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ عورتوں کو روک دیا جاکر نہانا پڑتا تھا۔ دیہاتیں نہانا عبادت کا ایک لازمی
حصہ تھا۔ ہندوؤں کے عہدے کے مطابق گنگا اور جناگانی سامنے گناہ دھوٹاتا ہے۔
بعض ہندو بہروں پانی میں کھڑے عبادت کرتے رہتے ہیں۔ راجوں مدارجوں کی رانیاں
اور دانتائیں جو ان کے ساتھ آتی ہوتی تھیں، وہ دیہات کی عورتوں کی موجودگی میں دیہاتیں
نہانا پسند نہیں کرتی تھیں۔ وہ رات کو جایا کرتی تھیں۔

ایک شام مدارج تنوچ راجپال کی سب سے چھوٹی رانی چیا کل نے مدارج سے
کہا کہ وہ جنا اٹھان کے لیے جا رہی ہے۔ مدارج اسے روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے
جگن ناتھ سے کہا کہ وہ شام گھری ہونے کے بعد چیا رانی کو دیہا پرے چلے۔ وہ بڑی دونوں
رانیاں کو ایک رات پہلے دیہا پرے جا چکا تھا۔ خود اندھیرے میں دور کھڑا تھا۔ رانیاں
سنا کے آئیں تو انہیں واپس لے آیا تھا۔ چیا ان کے ساتھ نہیں گئی تھی۔ وہ نوجوان
تھیں اور بہت خوبصورت۔ دوسری دونوں رانیاں پرانی ہو چکی تھیں۔ مدارج انہیں
اس لیے ساتھ رکھتا تھا کہ وہ اُس کے بیٹوں کی ماہیں تھیں۔ مدارج بڑے باغالب تھی۔
پرانی رانیاں اس سے کچی کچی رہتی تھیں۔

چیا کوئی دو سال پہلے جب اُس کی عمر سو لسترو سال تھی مدارج کے پاس تھیں کے

طور پرانی تھیں۔ اس کا باپ کوئی امیر کبیر آدمی نہیں تھا۔ اس کے خاندان میں جنس کی
دولت تھی اور چیا اس جنس کا نمونہ تھی۔ مدارج راجپال کے ایک جاگیردار کی نظر چیا پر
پڑی تو اس نے اُس کے باپ کو بہت سی رقم دے کر لڑکی بیوی کے طور پر لے لی تھی۔
شادی کی رسم ادا کی گئی تھی۔ جاگیردار چیا کو تنوچ لے گیا اور مدارج کو پیش کر دی۔ مدارج
نے اسے عزم میں رکھنے کی بجائے اس کے ساتھ باقاعدہ شادی کر لی۔ مدارج کی عمر
پچاس سال سے اوپر ہو گئی تھی۔ چیا اُس کی رگوں پر سوار ہو گئی اور پہلی دونوں رانیاں
محل کی پرانی چیزوں میں شمار ہونے لگیں۔

شام کا اندھیرا گہرا ہوا تو چیا اپنے محل غماخ سے نکل۔ اس کے ساتھ ایک خادمہ
بھی تھی۔ جگن ناتھ باہر اٹھار کر رہا تھا۔ چیا اپنی خادمہ کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔
جگن ناتھ ان کے پیچھے کچھ جا رہا تھا۔ وہ باہر سے آئے ہوئے لوگوں کے خیموں اور خیموں

کے ڈیروں سے دوڑ نکل گئے تو دیا کا نہ کارہ قریب گیا جہاں چپا کو نہ ملتا تھا۔ یہ جگہ خاصی ٹھہرتھی۔ اُدھر رہتا تو جانے کی اجازت نہیں تھی چپا رانی نے اپنی خادمہ سے کہا کہ وہ اُدھر چلی جائے جاں لوگوں کی عورتیں سنلکی ستھیں لیکن ناتھ دیا سے کچھ دور لگ گیا۔

خدا مراد بھرے میں غائب ہو گئی۔ چپا دیا کے قریب چلا گیا اور خدا دیر بعد واپس آگئی۔

”ادھر آ جاؤ لیکن!“ اُس نے کہا۔ ”وہ چلی گئی ہے۔ میں نے اُسے کھو دیا ہے کہ بھدی واپس نہ آئے یہ۔“

لیکن ناتھ اُس کے قریب چلا گیا۔ اندھا دیا اور جھاریوں اور درختوں کی لوث بھی تھی۔ دُور دیا کے کنارے شعلے اُٹھ رہے تھے۔ مرے ہوئے دو تین ہندوؤں کو جلایا جا رہا تھا۔ دیر میں دیکشتیاں بھی جا رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے جلتی ہوئی دو شعلیں تیرتی جا رہی ہوں۔ چپا نے لیکن ناتھ کو اپنے قریب بٹھالیا اور سر اُس کے زانوؤں پر رکھ کر زمین پر لیٹ گئی۔

”تم نہ ہوئے تو میں اس سارا بچہ کو زہر دے دیتی یا خود ہر کھا لیتی۔“ چپا نے لیکن ناتھ کی انگلیوں میں اپنی انگلیاں اکھٹاتے ہوئے کہا۔ ”مگر میں مارا جاؤں گے ساتھ اسبابا ہے کہ اسے تم چھوڑنا نہیں چاہتے۔ تمہیں یہ عمل اور اس کی نوکری ابھی لگتی ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ میں رانی ہوں لیکن تم ساتھ دو تو میں متلاشی خاطر بن باسی۔ نہ کے دکھاؤنگی۔ جنگ میں کٹیا میں رہتی ہوں۔“ سے کیوں نہیں نکلتے؟ مجھے یہاں سے نکالتے کیوں نہیں؟ ہم کب تک چور دوں کی طرح ملتے رہیں گے۔“

”یہ بات تم مجھے ایک سو مرتبہ کہ چکی ہو۔“ لیکن ناتھ نے کہا۔ ”اور میں تمہیں ہر بار یہی کہتا ہوں کہ ذرا صبر سے کام لو۔ میں تمہیں یہاں سے نکال لے جاؤں گا۔۔۔ اور میں پھر کہتا ہوں کہ میرے ساتھ نکل چلو گی تو یہ عمل تمہیں بہت یاد آئے گا۔ میں دو گز زمین کا بھی مالک نہیں۔ میرے پاس کچھ بھی نہیں۔ ہماری حیثیت غریبوں کی سی ہوگی۔ ہم جہاں پکڑے گئے وہاں قتل کر دیئے جائیں گے۔“

”تم بھیرہ سے آئے ہو جہاں مسلمانوں کی حکومت ہے۔“ چپا نے کہا۔ ”اگر ہم بھاگ کر دکان چلے جائیں اور مسلمان ہو جائیں تو کیا مسلمان ہمیں اپنی حفاظت میں نہیں رکھیں گے؟“ چپا رانی نے دانت پیس کر کہا۔ ”مجھے اپنے مذہب سے بھی نفرت ہوتی جا رہی ہے۔“ وہ اٹھ بیٹھی اور بولی۔ ”میں بہاراد کو آسانی سے زہر پلا سکتی ہوں۔“

پھر تم مجھے اپنے ساتھ لے چلو گے؟ وہ سر گیا تو ہمیں کون پکڑے گا؟ وہ چتا میں جلی دیکھ رہی ہو۔“ لیکن ناتھ نے اُن شعلوں کی طرف اشارہ کیا جو مرے ہوئے ہندوؤں کو چاٹ رہے تھے۔ ”مارا جاؤں گے تو تمہیں کی جونا پڑے گا۔ تمہیں زندہ اپنے خاندن کی جلتی چتا پر کھڑ کر دیا جائے گا۔۔۔ کچھ پر بھروسہ کرو چپا! میں تمہیں دھوکا نہیں دے گا۔“

”تم نے بھیرہ میں غزنی کی فوج کے خلاف لڑائی لڑی ہے۔“ چپا نے کہا۔ ”کیا وہ فوج بہت زبردست ہے؟ ہمارے دیس کے راجپوت مسلمانوں کو شکست نہیں دے سکتے؟“

”غزنی کی فوج بہت زبردست ہے۔“ لیکن ناتھ نے جواب دیا۔ ”مسلمان فوج کی تعداد اتنی کم ہوتی ہے، وہ اتنی ہی زبردست ہوتی ہے۔۔۔ اور جب کبھی مسلمانوں نے لیکنوں بٹھایا ہے اور اُس سے باج وصول کر رہے ہیں، سلطان محمود گھزنوی سے شکست کھا کر واپس جا رہا تھا تو اُس کے پاس بہت تھوڑی فوج تھی اور وہ سب زخمی تھی۔ یہ فوج مارا جاؤں بھیم پال کے علاقے سے گزری تو سارا بچہ کو جرات نہ ہوئی کہ اس مری ماری ہوئی فوج پر حملہ کر کے سلطان سمیت اسے قید کر لیتا۔“

”لیکن ناتھ!“ چپا رانی نے کہا۔ ”تم مذہب کے عاشق ہو۔ بڑا نہ جانو تو کہو۔ ہمیں ہندو ڈرتے ہیں کہ ہمارے جن دیوتاؤں کے بت مسلمانوں نے توڑ دیئے اور جو مندر جاڑ دیئے ہیں وہ تمہارا زنا کریں گے۔۔۔ اتنا غصہ نہ کر گیا ہے، میں نے تو دیوتاؤں کا تمہیں گرتا نہیں دیکھا۔ ابھی تو غزنی کی فوج تمہارے طریق پر لڑ رہی ہے۔ میں نے سنا ہے کہ مسلمان ایسے خدا کی عبادت کرتے ہیں جو کسی کو نظر نہیں آتا۔ میل خیال ہے کہ وہی خدا پہلے ہے۔ ہم نے کھانیر کے دشمن دیو کی بہت باتیں سنی تھیں۔ ہم نے

ناتھا کہ دشمنوں کے بھاری کسی میدان میں شکست نہیں کھا سکتے مگر اس دیو کو غنائی کے سلطان سے بیکاری بچا سکتے نہ دیو نے اپنے آپ کو بچایا۔۔۔ کیا تم ان دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہو؟

”تم اپنی زندگی سے اس قدر اگائی ہوئی ہو کہ اپنے مذہب سے نفرت کرنے لگی ہو۔ لیکن نامتھ نے اُس کے دشمن جیسے ظالم بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”مذہب کے خلف جوجی میں آئے کہو، میری محبت پر شک نہ کرنا۔“

”اپنی محبت کی خاطر تم مجھے کسی بھی امتحان میں ٹال دو، پوری اٹریڈ گی۔“ چلنے کہا۔ ”مگر اس مذہب کے نام پر میں کوئی قربانی نہیں دے سکتی۔“
خادم کھانسی چلی آ رہی تھی۔ چارائی اٹھ کھڑی ہون اور چل پڑی۔ لیکن نامتھ وہیں چھپا رہا۔ ذرا دیر بعد چپے اُسے رائیوں کی طرح آواز دی اور خادم کے ساتھ آگے آگے چل پڑی۔

دوسرے دن ماراج اچھا پا۔۔۔ لیکن نامتھ نے کہا کہ وہ آج چھٹی کرتے اور آزاری سے کوئی بھڑا نہ آئے۔ انہوں نے اپنے پرے سے اور کمرے تلوار لٹا کر سیلا دینے بھی کیا۔ لیکن بڑا جوشیلا، بخوسلا اور سینا سیلا کے گرد جمع ہوئے تھے۔ اور جوشیلا اور بخوسلا، نامتھ کو آڑت کا حال معلوم کر رہے تھے۔ لیکن بڑا دھوڑوں نے مجھے رگڑ رکھے تھے اور لوگوں کو مجھ پر رگڑا کر پیسے اکٹھے کر رہے تھے۔ کیسے، رگڑی اور کیسے، رگڑی گے اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔

لیکن نامتھ ہر لمحے میں ڈراما کرتا اور آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے دو سادھو بیٹھے تھے۔ ان کے منہ سر دھانپے ہوئے تھے۔ لیکن جوں ہی رائی اٹھ لی ہوئی تھی۔ سر کے بال لیے اور رکھ سے اٹے ہوئے تھے۔ ان کا دھاڑا بھی تھیں۔ ان کے ارد گرد جمع زیادہ تھا۔

بب بڑا نامتھ اس جگہ میں جا رہا تو ایک آدمی نے سادھوؤں سے کہا۔۔۔
”بڑی مہاراج! لیکن ان لمبھ مسلمانوں کے متعلق کچھ بتائیں جو سب ڈراما سے آتے ہیں اور

ہمارے مندروں کا بتایا چار کر کے چلے جاتے ہیں۔“

”مسلمان لمبھ ہیں۔“ ایک سادھو نے کہا۔ ”کون بھی ہیں۔ انہیں دھن کا لوبھ ادھر لانا ہے۔ لوٹتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ وہ ہمارے کسی دیوی دیوتا سے نہیں ڈرتے۔ وہ نہیں جانتے کہ نارائن اور دھرم بھارت نے دشمنوں اور سادھوؤں کے کردار کی جو خبر دی ہے وہ سچ ہے۔ دیوتا کا کردار مسلمانوں پر ضرور پڑے گا لیکن ابھی ہم پر پڑ رہا ہے۔ غزنی کا بادشاہ محمود بڑا ظالم اور زبردست ہے۔ وہ سیلاب کی طرح آتا ہے اور اُس کے سامنے کوئی فوج نہیں ٹھہر سکتی۔ ہاتھی بھی بھاگ جاتے ہیں۔ اُسے دیوتاؤں کا طغیان بھی نہیں روک سکتا۔ اُسے سب کچھ نہیں روک سکتا۔“

وہ مسلمانوں کو رگڑا بھی کر رہا تھا اور ان کی دہشت بھی طاری کرتا جا رہا تھا۔ اُس نے لوگوں کو غزنی کی فوج کا کچھ ایسی ہولناکیاں سنائیں کہ سننے والوں کی آنکھیں خوف سے ابل کر باہر آنے لگیں۔ لیکن نامتھ سن رہا تھا۔ سادھو نے بولتے بولتے اُسے دیکھا۔ ان کا نظریں نہیں۔ سادھو کا زبان ڈرامی رنگ اور پھر مدیا ہو گئی۔ اُس نے اب اپنے سامعین کو دیوتاؤں کے کردار (قہر) سے بچنے کے طریقے بتانے شروع کر دیئے۔ لیکن نامتھ وہاں سے ہٹ گیا۔

وہ ٹپٹے ٹپٹے ایک پرانے مندر کی سیڑھیوں پر جا رہا تھا۔ اُس نے دیکھا کہ وہی دو سادھو آ رہے تھے لیکن نامتھ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مندر خال اور دیران تھا۔ اس کا کچھ چہرہ کھنڈر چکا تھا۔ اُسے آواز سنائی دی۔ ”ساش!“
وہ رکا نہیں۔ اُس نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اُسے پھر آواز سنائی دی۔
”ساش!“

وہ سیڑھیاں چڑھا گیا۔ دونوں سادھو تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے اُس تک پہنچ گئے۔ ایک نے کہا۔ ”میرا ساش!“
وہ رکا گیا۔ اُس کے چہرے پر غصے کے آثار نظر آئے۔ ”کون سی نہیں ہے؟“
رہا۔ زبردست۔ سادھو نے کہا۔

”ہم تینوں کا یہاں ٹھہنا ٹھیک نہیں۔“ تاشقین نے کہا۔ ”قیس! تم ذرا گھرو
بھرو۔ ہم رات کو کہیں اکٹھے ہوں گے۔“
”ہشام! قیس کے چلے کے بعد امیرن تاشقین نے ہشام سے کہا۔ ”تم بہت بڑے
بیوقوف ہو۔ کیا تم مقامی لوگوں پر اس قدر اعتماد کر سکتے ہو کہ تم نے مجھ جیسے آدمی
کو بے نقاب کر دیا ہے؟ اس شخص کو تم نے کسی کام میں آزمایا ہے؟ اس نے کوئی
بڑا کام کیا ہے؟“

”آدمی قابل اعتماد ہے۔ ہشام نے کہا۔“ اسے ابھی کوئی نازک کام نہیں دیا
گیا۔“

”خدا کرے یہ قابل اعتماد ثابت ہو۔“ تاشقین نے کہا۔ ”لیکن ہمارا کام ہم سب
کے لیے بہت خطرناک ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ اس کام میں کس طرح اپنی خواہشات
اور اپنی کمزوریوں کو دبا کر رہنا ہے۔ یہ طاقت انہی میں ہوتی ہے جس میں ایمان بواہد
جس میں جذبہ ہوجو ہم میں ہے۔ ہندوستان کے ہر مسلمان پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ یہ
لوگ ایک زمانے سے ہندوؤں کے دبدبے میں رہ رہے ہیں۔ انہوں نے ہندوؤں کی
شہزاد اور ان کی توہم پرستی کے اثرات قبول کر لیے ہیں۔ یہ لوگ اپنی کمزوریوں اور
مہندریوں کے تحت ہندوؤں کو خوش کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہاں کے
مسلمان قابل اعتماد ہوں بھی تو بھی انہیں میرے دہجے کے آدمیوں سے واقف نہیں ہونا
چاہیے۔ ہندو دراصل اس بات پر انہیں قائل کرتے اور ان کے گھر جلاتے اور ان کے گھر میں
میں گھس کر تلاشی لیتے ہیں۔“

”میں اسے پکار کر دوں گا۔“ ہشام نے کہا۔

”اس نے مجھے مہاراج کے ساتھ دیکھ لیا ہے۔“ تاشقین نے کہا۔ ”اسے
کسی نے نہ لایا تو آیت سے گھر آکر لایا میں اگر مجھے پکڑا دے گا۔ میں اس کے لیے
بہت موثر شکار ہوں۔ ذرا غور کرو کہ میں تنوج کے مہاراج کا ذاتی محافظ ہوں اور
سب مجھے مکن نامہ کہتے ہیں۔ مجھے جس نے پکڑ دیا اسے مہاراج ہیروں اور جواہرات
کی صورت میں انعام دے گا۔“

”ہشام سمرقند!۔“ اُس نے سادھو کی طرف دیکھ کر گزشتہ کی ”اگر اس پاس
کئی نہیں، پھر بھی تمہیں میرا نام لے کر مجھے نہیں بلانا چاہیے تھا۔ تم انڈی ہو گیا، یہ نہیں
بیٹھ جاؤ۔ میں اپنی پھیلی پھیلا ہوں۔ میرا ہاتھ پکڑ کر دیکھتے رہو اور بائیں کرتے
رہو۔۔۔ تم دونوں کے علاوہ اور کون ہے یہاں؟“

”آدمی اور میں۔“ ہشام نے جو سادھو کے بھیس میں غزنی کا جاسوس تھا جواب
دیا۔ ”قیس کی طرح درویش شرفیہ؟۔ وہ بھی سادھوؤں کے بھیس میں ہیں۔“

”مُشرِف اٹل جنس کے مقامی لکھنؤ، کو کہا کرتے تھے سلطان محمود غزنوی کا اٹل
جنس کا جو نظام کام کر رہا تھا اس میں مقامی مسلمانوں کو مُشرِف کے طور پر رکھ لیا جاتا
تھا اور انہیں بڑی اچھی اُجرت دی جاتی تھی۔ یہ سادھو دراصل غزنی کا جاسوس ہشام
سمرقند تھا۔ اُسے سلطان سے سمجھنا اس شخص پر بھیجا گیا تھا کہ وہاں سارے ہندوستان کے
ہندو جمع ہوں گے، لہذا وہ مقامی مُشرِف ساتھ لے جا کر وہاں سادھوؤں کے بھیس
میں لوگوں میں دہشت پھیلانے۔ ہشام کے ساتھ دوسرا سادھو سلطان کے علاقے کا
قیس نام کا ایک آدمی تھا۔ اُس کے ساتھ دو آدمی اور تھے جو سمجھنا کے ہجوم میں کہیں
گم اپنا کام کر رہے تھے۔“

ہشام نے جتنی نامہ کو جو دراصل امیرن تاشقین تھا، پہچان لیا تھا۔ درویش غزنی
کے علاقے کے رہنے والے تھے۔ ہندوستان میں ان کی پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ قیس
تاشقین کو سن جانتا تھا۔ تینوں اس علاقے کے زبان اور رسم و رواج سے بڑی اچھی
طرح واقف تھے۔

”کہاں ٹھکانا ہے؟“ ہشام نے تاشقین سے پوچھا۔ ”کچھ ہاتھ لگا؟“

”میں جا رہا ہوں۔“ تاشقین نے کہا۔ ”ہندوؤں کو کہا تھا۔ اب جلد ہوں۔“

”آپ ہم سے چھپاتے ہیں؟“ قیس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں نے آپ کو ہمارے
تنوج کے ساتھ دیکھا ہے۔ آپ شاید اُس کے محافظ بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو ذرا سا بھی
شک نہیں ہوا تھا کہ آپ ہمارے آدمی ہیں۔ میں آپ کو پیراؤں لانا چاہوں۔“

فوج کی ہشت پھیلانی جائے۔ ہشام نے کہا۔
 ”تم اب چلے جاؤ۔“ شاقین نے کہا۔ ”اور متغالی مشرفوں کو اتنا زیادہ اعتماد
 میں نہ لو۔ انہیں استعمال کرنے کی کوشش کرو۔“

شام ہوتے ہی اُفتی پر بادل جمع ہونے لگے تھے۔ اُسی رات ہمارا جوں اور
 راجوں کو ہمارا جہ فوج کی قیام گاہ میں اکٹھے ہونا تھا۔ ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ خوشنما
 قنالوں میں گھری ہوئی اور رنگارنگ شامیانوں سے ڈھکی ہوئی وہ جگہ خاصی وسیع تھی۔
 نارج گانے کا بھی انتظام تھا۔ کھانا اور شراب پیش کرنے کے لیے ہم عریاں جوان عورتیں تھیں۔
 راجوں اور ماراجوں کے ساتھ مدعو تین تین رانیاں بھی تھیں۔ بعض ماراجوں کے
 ذاتی محافظ ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ امیر بن شاقین بھی ہمارا راجا پال کی نشست
 کے پیچھے مگن تھا۔ کھانے کے بعد وہیں کھڑا تھا۔ کھانے کے دوران چپارانی اُسے کبھی کبھی
 دیکھتی تھی مگر شاقین منہ کے بُت کی طرح کھڑا تھا۔
 کھانا ختم ہوا تو ساندل کی آواز بلند ہوئی اور ایک رفاہی ایک طرف سے تل کی
 طرح نمودار ہوئی۔

”بند کرو اس باپ کو۔“ ایک آواز دھماکے کی طرح گرجی۔
 ساز خاموش ہو گئے۔ رفاہی وہیں سے لوٹ گئی۔ سب نے دیکھا۔ بڑے
 مندر کا پنڈت اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ یہ اُسی کی آواز تھی۔ اُس کے ہونٹ کانپ رہے
 تھے۔ راجوں اور ماراجوں اور ان کی رانیاں پر سناٹا طاری ہو گیا تھا۔
 ”کیا تم اس کی خوشی منانے اکٹھے ہوئے ہو کہ ہمارا بھیم پال جو اپنے آپ کو نڈر کہلاتا
 ہے، غزنی کے پالی اور پلید سلطان کا باغبار ہو گیا ہے؟“ پنڈت نے غصے سے
 کانپتی ہوتی آواز میں کہا۔ ”کیا تم اپنے دیوتاؤں کی توہین پر خوشی منا رہے ہو؟ کیا
 تم اس لیے ناچنے والوں کو ساتھ لائے ہو کہ ہمارے مذہب پر مسلمانوں نے گھوڑے
 دوڑا دیے ہیں یا اس لیے کہ راجپوتوں کا خون سرد ہو گیا ہے؟ تم خود مانا جو۔“ پادوں
 سے گھٹکھرباندھ لو۔ چوڑیاں چڑھا لو۔“

”اگر تم اس شخص سے خطہ محسوس کرتے ہو تو میں اسے آج ہی ختم کر کے اس کی لاش
 غائب کر دیتا ہوں۔“ ہشام نے کہا۔ ”مجھے اپنی عقلی کا احساس ہو گیا ہے۔“
 ”محض شک میں کمی کی جان نہ تو۔“ شاقین نے کہا۔ ”اس پر نظر رکھنا اور
 اسے پکا کر لینا۔“

”ہمارا کام انہیں پسند آیا؟“ ہشام نے پوچھا۔ ”لوگوں کو ان کے اپنے ہندوؤں
 لے ڈرا دیا ہے۔ اگر کوئی کسر رہ گئی تھی تو وہ ہم چلدا دیوں نے پوری کر دی ہے۔
 یہ لوگ سادھوؤں، سنیاسیوں اور جوتھیوں کی جھوٹی باتوں کو بھی سچ مان لیتے ہیں۔ ہم
 نے ان کے دلوں میں ڈال دیا ہے کہ محمود غزنوی اپنے ساتھ جیسے جن بھوت لاتا ہے جوں نول
 کو کھاجاتے اور ملعونہ کی دیواروں کو سمار کر دیتے ہیں۔ سیاں کی باتیں اپنے بھٹوں کو
 فوج میں نہیں جانے دیں گی۔۔۔۔ تم کیا کر رہے ہو؟“

”ہمارا جہ فوج کی نیت اور ارادے دیکھ رہا ہوں۔“ شاقین نے جواب دیا
 ”سنت غصے میں ہے۔ جن راجوں اور ہمارا جوں نے ہم سے شکست کھائی ہے انہیں
 برا بھلا کہتا رہنا ہے یہاں سب آئے ہوئے ہیں۔ ان کا اجلاس ہو گا تب یہ پتلے
 گا کہ یہ لوگ کیا کرنا چاہتے ہیں۔“

”سلطان ابھی کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں۔“ ہشام نے کہا۔ ”معلوم نہیں تیس الملاح
 لی ہے یا نہیں۔۔۔۔“

”کہ سلطان کو خوارزم میں بڑی خوریز لڑانی لڑنی پڑی ہے۔“ شاقین نے ہشام
 کا جواب دے کر کہتے ہوئے کہا۔ ”مجھے الملاح مل چکی ہے۔ سلطان کو لامبور سے الملاح ملی
 تھی کہ ہمارا بھیم پال نڈر تنوچ کے ہمارا جہ کو سلطان سے فیصلہ کن ٹکر لینے پر آمادہ کر رہا
 ہے۔ مجھے سیاں یہ دیکھنا ہے کہ تنوچ کا ہمارا جہ کیا فیصلہ کرتا ہے۔ کیا یہ سب لوگ
 غزنی پر حملہ کریں گے یا سلطان کو مشتعل کر کے اپنی فوجیں کسی اور جگہ اکٹھی کر لیں گے اور
 سلطان کو شکست دینے کی کوشش کریں گے۔ مجھے سیاں کے ہمارا جوں کی فوجی طاقت
 دیکھنی ہے اور یہ بھی کہ وہ اس طاقت کو کس طریقے سے استعمال کریں گے۔“
 ”شاید اسی لیے میں کہتا ہوں کہ مسٹر ایس ہندو اکٹھے ہوں تو ان میں غزنی کی

”میں صاف کرو ماراج!“ ایک راج نے اٹھ کر اور ہاتھ جوڑ کر کہا۔
”ہم آج یہ جیل کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں کہ غزنی کی فوج کو ہتھ کے لیے شکست دینی ہے۔“

”تم سب پر ہری کرشن ماسیو کا قہر آیا ہی چاہتا ہے۔“ پنڈت نے کہا۔
”تم نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام سچا اور بندہ موت جھوٹا مذہب ہے۔ تم نے
مہابھارت میں اسلام کا بیج بھر دیا ہے۔ تم نے مہدین قائم کو زندہ کر دیا ہے۔
تم دیوتاؤں کے قہر سے بچ نہیں سکتے۔“

بادل کی گرج سنائی دی۔ پنڈت انہیں لعنت ملامت کرتا رہا۔ بادل بار
بار گرجنے لگے۔ پنڈت راجوں مہاراجوں کو دیوتاؤں کے تہرے ڈرار ہاتھ۔ فانیس
بڑی ندر سے پس اور شامیانے اوپر کو اٹھئے۔ اس کے بعد کپڑوں کے اس محل کو بھٹکان
شکل ہو گیا۔ طوفان فوراً ہی بند ہو گیا۔ جلتے ہوئے فالوں گر پڑے۔ تیل بکھر گیا اور
اسے آگ لگ گئی۔ بجلی اتنی ندر سے کرنی جیسے زمین و آسمان پھٹ گئے ہوں۔ فالوں
نے زمین پر بھی ہونی دسی کو آگ، لگادی تھی۔ طوفان نے ایک طرف سے قنات گرا دی اور
اسے بھی آگ لگ گئی۔

پنڈت کی آواز سنائی دی۔ ”یہ دشمنوں کا قہر ہے۔“ اور سب بھاگ اٹھے۔
پھر منہ برسنے لگا۔ یہ طوفان باد و باراں تھا۔ بجلی بار بار کڑکتی اور بادل بڑی رور
سے گرجتے تھے۔ طوفان کی جھپٹ بڑی ہی ڈراؤنی تھیں۔ ہاتھی بھگاڑنے اور گھوڑے
خوف سے ہنسنے لگے۔ بارش نے آگ بجھا دی اور طوفان شامیانے، فانیس اور
یہیے اڑانے لگا۔ راجوں مہاراجوں کے محافظ اپنے آٹاؤں اور ان کی رانیوں کو کسی
منوڈ جگہ لے جانے کے لیے دوڑے۔ مہاراج راجپال کی پکار بار بار سنائی دی تھی
”جگن ناتھ! جاپارانی کو مندر میں لے جاؤ۔“

مندر دُور تھا۔ بھگت اور افراتفری تھی۔ سب غم کی طرف دھڑے جارہے تھے۔
جنگل کے درخت چیخ اُٹھ چکا رہے تھے۔ شبن ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے تھے۔ ماضی
نے جیسا کو پہلے ہی اپنی ناہی سے لیا تھا اور اُسے بازوؤں میں اٹھائے ہوئے شہر

کی طرف لے جا رہا تھا۔

شہر کے اندر گرد باہر سے آنے ہوئے ہندوؤں کے ہزار ہائے نصب تھے۔
بعض ہندوؤں کے بغیر آسمان تلے پڑے تھے۔ وہ اپنا سامان طوفان کے رحم و کرم پر
چھوڑ کر شہر کو بھاگے جا رہے تھے۔ شہر والوں نے ان لوگوں کو پناہ میں لینے کے لیے
اپنے گھروں کے دروازے کھول دیئے تھے۔ طوفان کا زور ابھی بڑھ رہا تھا۔ بجلی چمک
کر کڑکتی تھی تو انسانوں کی جھپٹ سنائی دی تھیں۔ بچے چیخ رہے تھے، عورتیں چیخ چلا رہی
تھیں اور طوفان کی جھپٹ انسان کی جھپٹوں کو جیسے ہرپ کرتی جا رہی تھیں۔

یہ طوفان ایک قیامت تھی۔ اس قیامت خیز طوفان میں شام سرد نہ کاسا تھی تھیں
دیہات کی طرف سے شہر کو آ رہا تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ اُسے طوفان کے زلزلوں، بارش کی بوجھاؤں
اور دھڑکنوں کی جھپٹوں میں ایک لہریں سنائی دی جو کسی بچے کی ماحورت کی معلوم ہوا تھی۔
قیس رگ گیا۔ جل چکی اور کڑکی۔ اُسے اس جگہ میں قریب ہی ایک مدخت کے تنے کے
ساتھ کئی انسان نظر آیا اور وہی چیخ پھر سنائی دی۔ وہ ادھر کود رہا۔ وہاں ایک عورت
اکیلی بیٹھی کانپ رہی تھی۔
”مت ڈرو۔“ قیس نے اُس کے پاس بیٹھنے ہوئے کہا۔ ”اب تم اکیل نہیں
ہو۔“

وہ ایک نوجوان لڑکی تھی۔ شام کے بعد وہاں پر نہانے گئی اور طوفان نے آگھرا۔
جب بھگتے تو وہ اپنی ساتھیوں سے کھٹ گئی۔ قیس کو دیکھتے ہی اُس کے ساتھ لپٹ گئی۔
بجلی اب کے اتنی زور سے کڑکی کہ قیس بھی جو ایک دیر مرد تھا اُسے ہوکے رہ گیا۔ لڑکی
کا چیخ بجلی کے دھواکے سے زیادہ بلند تھی۔ کچھ قریب ہی ایک مدخت پر گری۔ لڑکی قیس
کے ساتھ اس طرح اور زیادہ چپک گئی جیسے اُس کے وجود میں سما جانے کی کوشش کر
رہی ہو۔

ادھر بڑے مندر سے نکھ اور گھڑیاں بجنے لگے۔ نکھ ایک نیلہ بیویوں تھے۔ ان

لڑکی جو دس سے سری چارہ سی تھی، ادوئی آئی اور قیس کے اوپر گر پڑی۔ اُس نے قیس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لے کر کہاں کی سی دیتا بی سے پوچھا۔ تم تھیک ہو یا ابو..... بروننا۔ اور قیس اٹھ کھڑا ہوا۔

وہ ایک قدیم مندر کے کھنڈر تھے جو زمین سے خاصے بلند تھے۔ قیس اور ہشام امیر بن تاشقین سے پیسے ملے تھے۔ قیس بیڑھیاں چڑھنے لگا۔ لڑکی اُس کے بازوؤں پر بٹھی۔ وہ اڑکئی۔ کہنے لگی کہ وہ خود اوپر جائے گی۔ طوفان کا زور ابھی ٹوٹا نہیں تھا۔ لیکن قیس کو ہاتھوں کے نیچے پڑا دیکھ کر لڑکی کی جرات اور طاقت واپس آگئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کی کمر میں بازو ڈالے بیڑھیاں چڑھ گئے اور تاریکی میں ایک کمرے میں داخل ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے کو نفرت نہیں آتے تھے۔ لڑکی نے ٹوٹل کر اُس کے پاؤں پکڑ لیے اور اُس کے پاؤں پر سر رکھ کر اُس کا شکر یہ ادا کیا۔

”مجھے گناہگار نہ کر د لڑکی!“ قیس نے اُس کا سر اٹھاتے ہوئے کہا اور جذبات سے وہ اتنا مغلوب تھا کہ اُس کے منہ سے نکل گیا۔ ”ہمارے مذہب میں یہ گناہ ہے کہ انسان کسی انسان کے آگے سجدہ کرے۔ سجدہ صرف خدا کے آگے کیا جاتا ہے۔“

”تم مسلمان ہو؟“ لڑکی نے چونک کر پوچھا۔

”اگر میں کہہ دوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ سے ویسی ہی نفرت کر دو گی جیسی ہندو مسلمانوں سے کرتے ہیں؟“

”نفرت؟“ لڑکی نے حیرت سے کہا۔ ”تم نہ؟“ ”تم نہ؟“ ”تم نہ؟“ ”تم نہ؟“ ”تم نہ؟“ ”تم نہ؟“ ”تم نہ؟“

”میں تمہارے مذہب کی توہین نہیں کرنا چاہتا۔“ قیس نے کہا۔ ”لیکن یہ میرے خدا کا تہرہ ہے جو پتھر کے دیوتاؤں (زور اُن کی پوجا کرنے والوں) پر گر رہا ہے۔ یہ خدا کا اشارہ ہے۔ مجھے اسی خدا نے طاقت دی ہے کہ تمہیں ایسے سخت طوفان میں اسے اٹھایا ہوں۔“

کی بے سُر کی آوازیں ایسی تھیں جیسے پھڑپھڑے درہے ہوں۔ پنڈت اور بیماری کش واسیلو کے بت کے آگے سجدہ دینا ہو گئے۔ ہر ہر مادی اور بے جگہ نشین ہرے ”مادی اور بلا پناہ ہوں۔“ سب اسے دیتا مائل کا تہرہ کہہ رہے تھے۔ گھروں میں جنہوں نے بت اور سورتیاں رکھی ہوں تھیں وہ ان کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گرا گرا کر گرنے لگے۔ مگر یہ دیوتاؤں کا تہرہ تھا یا خدا کا، یہ بڑھاپا ہی جا رہا تھا۔ سکھوں کی آوازوں نے طوفان کی چیخوں کو زیادہ بھیجا ایک بنا دیا۔

راجے، بہاراجے، اُن کے محافظ اور بڑے بڑے دلیر سوسے خوف سے پتھر پتھر کھلب رہے تھے۔ وہ اس کو طوفان (شیو) جنوں، بھوتوں، چڑیلوں اور بد روحوں کا غور زور لے کر کھ رہے تھے۔ اس طوفان میں جو لگا تھا دنیا کو ختم کرنے آیا ہے، قیس ایک ہندو لڑکی کو بازوؤں پر اٹھائے ایک پڑنے دیوان مندر کی طرف جا رہا تھا۔ لڑکی نے بازو اُس کے گھٹے میں ڈال رکھے تھے اور گال پتوں کی طرح اُس کے گالوں کے ساتھ دبائے ہوئے تھے۔ اُس پر نیم غشی طاری تھی۔ نکل کے دھماکے سے وہ بے کمر ہوش میں آجاتی تھی۔ طوفان قیس کے پاؤں اٹھا رہا تھا۔ اوپر سے دھڑکتے ٹپ ٹپ ایک ایک کر آئے پڑنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ کچھ نہیں پھسلا، گرا کر اُس نے لڑکی کو سنبھالے رکھا۔

ایک بار بادل بڑے تہرے گرجے اور اس کے ساتھ ایسی بھیجا ایک چنگھاڑ سنانی دی کہ قیس ٹپ گیا۔ اُس کی مردانگی جواب دے گئی۔ بجلی چمکی تو اُسے اپنے سامنے دو ہاتھی دکھائی دیے جو سونڈیں اوپر کئے ہوئے جگھڑاتے چلے آ رہے تھے۔ یہ کسی ہبلادہ کے ہوں گے۔ وہ دُور نہیں تھے پچیس تیس قدموں کا فاصلہ تھا۔ دونوں ہاتھی سنت ڈسے ہوئے سیلو بہ سیلو دُور سے آ رہے تھے۔ قیس کے جسم سے کنگریوں کی بوچھاڑوں جیسی

بارش اور بے پناہ ہند ہواؤں نے طاقت چوس لی تھی، ابھر بھی وہ بائیں کو دوڑا اور پھسل کر گر پڑا۔ لڑکی اُس کے نیچے تھی۔ ہاتھی اوپر آ گئے۔ قیس نے لڑکی کو دھک دے کر دُور پھینک دیا اور خود کھٹے جانے کے لیے تیار ہو گیا لیکن اُس نے زور دے کر لڑھکنی لی اور اُس ایک طرف ہو گیا کہ ایک ہاتھی کا پاؤں اُس کے سیلو کے ساتھ پڑا اور ہاتھی آگے نکل گئے۔

تھی کہ قیس جوان آدمی تھا جس کے جسم کے پچھلے گوشے سے بھرے ہوئے ادبیت اچھے لگ رہے تھے اور اس جوان مرد نے رات آتی جوان لڑکی کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔

”اب تمہارے ماں باپ کو تلاش کرنا ہوگا“ قیس نے کہا۔ ”اٹھ چلیں۔“
اُدشا نے ابھی تک حیرت زدہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ ابھی اٹھنا نہیں چاہتی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں شکر کے علاوہ کوئی اور تاثر بھی تھا۔ قیس کے دوبارہ کہنے کے باوجود وہ خاموشی۔ قیس کہتا ہوا اُس کے قریب جا بیٹھا۔
”تم نے مجھے زندگی دی ہے۔“ اُدشا نے کہا۔ ”کیا مجھے باقی زندگی کا کھدے دے سکتے ہو؟“
قیس نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میرے لیے یہ واقعہ معمولی نہیں کہ رات تم نے مجھے طوفان سے بچایا ہے۔ اُدشا نے کہا۔ اور بات یہ بھی معمولی نہیں کہ تم نے میری عزت بھی بچائی ہے مگر تم مجھے اُس بڑے سے نہیں بچا سکو گے جس کے ساتھ میری شادی کی بات ہو رہی ہے۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔“ ہندو عورت کی زندگی مرد کے قدموں میں بسر ہوتی ہے۔ ماں باپ جس کے ساتھ چاہیں باندھ دین اور خاندان سے جڑے تو عورت اُس کے ساتھ زندہ جل جاتی ہے یا اسے ہر دریا سیال تھرا بھیج دیا جاتا ہے۔ میں اپنی ایک بہو سہیلی نے ملی ہوں۔ وہ دو سال سے یہاں ہے۔ کہنے کو وہ پاک زندگی بسر کر رہی ہے۔ زیادہ دقت عبادت میں گزارتی ہے مگر اُس کی رائیں کسی کی پندت کے کمرے میں گنبدی ہیں۔... مجھے اپنے

ساتھ لے چلو۔ تمہاری باندھی بن کے رہوں گی۔“
قیس کیا تھا؟ ایک جوان آدمی تھا۔ اسی حسین لڑکی اُسے اپنا آپ پیش کر رہی تھی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے اوپر حیرت کے ہوئے تھا۔ لڑکی نے اُس کی زنجیریں توڑ دیں۔ اُس نے کہا۔ ”میں امانت میں خیانت نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن تمہاری خواہش کو بھی نہیں ال سکتا۔... اُدشا میرے دل سے پوچھ تو ہیں تیس کسی کے بھی حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تم میرے دل میں اتر گئی ہو۔... اٹھو۔ چلو چلیں۔“

قیس سا دھوؤں کے بھیس میں دیا کے کنارے گیا تھا۔ اُس کا اکل بس پہلو اٹل والا ایک لنگوٹ تھا۔ بارش نے اس کے جسم سے راکھ، داڑھی اور سر کے بالوں میں ڈالی ہوئی مٹی اور راکھ و موڈال تھی۔ لڑکی نے اس سے پوچھا کہ وہ نہنگ کیوں ہے۔ اُس نے بتایا کہ وہ دریا میں نہانے گیا تھا۔ طوفان کپڑے اڑا کر لے گیا اور وہ اسی طرح بھاگ آیا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ وہ مسٹر اکامیلہ دیکھنے آیا تھا۔ اُس نے لڑکی سے پوچھا کہ کہاں کی رہنے والی ہے۔ اُس نے بلند شہر کی کوئی جگہ بتائی۔ اُس کا پورا کنبہ آیا ہوا تھا۔ اس کا باب بھی ساتھ تھا۔ انہوں نے اس شہر سے باہر اپنا غیر نصب کیا تھا۔ قیس نے اُسے بتایا کہ اب وہاں ذخیرہ ہو گا۔ اُس کا کنبہ اور رات اسی گھنڈر میں گزرا بی ہو گا۔

”میں تیس ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔“ لڑکی نے رک رک کر کہا۔ ”تم مرد ہوا اور میں نوجوان لڑکی ہوں۔ میری ابھی شادی نہیں ہوئی۔... میں رات میں گزرائی ہے۔“
— لڑکی کے بومیں اٹھنا تھی۔ قیس سمجھ گیا۔ اُس نے کہا۔ ”میں تیس اپنے لیے نہیں تمہارے ماں باپ کے لیے اٹھا لیا ہوں۔... میں تم سے ایک وعدہ لیتا ہوں۔ کسی کو یہ پتہ نہ چلے دینا کہ میں مسلمان ہوں، وہ نہ ہندو میرے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ میں اپنا نام جگدیش بتاؤں گا۔“

لڑکی جس نے اپنا نام اُدشا بتایا تھی، ہر شرط ماننے کو تیار تھی۔ اُس نے بڑا پاک وعدہ کیا۔ پھر رات گھنڈے لگی۔ اُدشا کی اس کھ بار بار کھلتی تھی۔ اُسے اب طوفان کا نہیں اُس مرد کا ڈر تھا جس کے ساتھ وہ اس گھنڈر میں تنہا تھی۔

آخری بار اُدشا کی اس کھ کھلی تو کمرہ روشن تھا۔ کوئی کھڑکی اور روزانہ نہیں تھا۔ دروازے کے کواڑ نہیں تھے۔ دن کی روشنی اندر آ رہی تھی۔ قیس دروازے میں بیٹھا اُسے دیکھ رہا تھا۔ رات کا طوفان رات کے ساتھ ہی رخصت ہو گیا تھا۔ قیس کے چہرے پر حیرت تھی اور ایسی ہی حیرت اُدشا کے چہرے پر بھی تھی۔ قیس اس لیے حیران تھا کہ اُس نے اس قدر خوبصورت اور اتنی دلکش لڑکی کبھی نہیں دیکھی تھی اور اُدشا اس لیے حیران

قیس نے کسی خیال سے اس کے ساتھ فوجوں کی باتیں شروع کر دیں۔ اُدشا کے باپ نے سلطان محمود کی بات چھڑادی اور اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اُسے شکست دینے کے لیے زندہ ہے۔ وہ چونکہ خاندانی اور پیدائشی فوجی تھا اس لیے وہ فوجوں اور لڑائیوں کی باتیں کرتا رہا مگر قیس کے دل و دماغ پر اُدشا سوار تھی۔ اس کے باپ نے جب لڑکی دینے سے انکار کر دیا تو قیس کو یوں لگا جیسے اُس کے سینے سے اُس کا دل نکلا جا رہا ہو، یا جیسے اُس سے اتنی حسین لڑکی چھینی جا رہی ہو۔ اس کا نظری کمزوریاں اور نفسانی خواہشات اُس کے جذبات اور اُس کی عقل پر غالب آگئیں۔ اگر اُدشا کا بیٹا اُسے دھتکار دیتا یا اُدشا کو ساتھ لے کر دہلی سے چلا جاتا تو قیس اس کیفیت سے دوچار نہ ہوتا۔ یہ شخص اس کے ساتھ بڑے پیار سے انداز میں دوستانہ باتیں کر رہا تھا اور قیس سوج رہا تھا کہ وہ اس شخص کو کسی طرح راضی کرے۔

اُدشا کے باپ نے غزنی کے جاسوسوں کا ذکر کیا اور کہا کہ "یہ لوگ ہم میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ وہ محمود کو راز کی ایسی باتیں بتاتے ہیں کہ وہ ہم پر دہیں ضرب لگاتا ہے جو ہماری کمزوریاں ہوتی ہیں۔ ہماری فوجوں میں غزا کے جاسوسوں کو پکڑنے کا انعام مقرر کیا گیا ہے۔ اگر مجھے کوئی مسلمان جاسوس نظر آجائے تو میں اُسے زندہ اپنے بلوے کے حوالے نہیں کروں گا۔ اُس کا سر کاٹ کر لے جاؤں گا۔"

قیس کا دماغ پھر گیا۔ اُدشا باپ کے پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کا بٹن نے قیس پر اشارہ کر دیا۔ کہنے لگا "اگر میں آپ کو وہ تین جاسوس پکڑا دوں تو آپ مجھے وہ انعام دے دیں گے جو میں نے مانگا ہے؟"

"تم کیسے پکڑاؤ گے؟"

"مجھ سے اور کچھ نہ پوچھیں" قیس نے کہا۔ "آپ انہیں پکڑیں اور انہیں زندہ رکھیں۔ ان کے ذریعے آپ غزنی کے بہت سے جاسوس پکڑ سکیں گے۔"

"کب؟" اُدشا کے باپ نے قیس کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا۔ "کہاں ہیں وہ؟"

"ابھی... آج ہی۔" قیس نے جواب دیا۔ "وہ یہیں ہیں۔ اگر نہ ملیں تو آپ میری گردن کاٹ سکتے ہیں۔"

وہ جب باہر آئے تو مندر کی بندی سے اس میں بڑا ہی بھیاں تک منظر دکھائی دیا۔ جہاں غصوں کی کئی تھی وہاں اب دیرانہ تھا۔ یہ لوگ ادھر ادھر اپنا سامان ڈھونڈ رہے تھے۔ نیچے گرے ہوئے اور پھٹے ہوئے تھے۔ درختوں سے ٹٹن ٹٹن ہونے لگے اور پانی ہی پانی تھا۔ قیس اُدشا کو ساتھ لے کر بیٹھیاں اُتر گیا۔ وہ تھوڑی ہی دیر گئے کہ انہیں بھی ہی بلند آواز سنائی۔ "اُدشا!"

دو فلنگ گئے۔ اُدشا نے کہا۔ "میرا باپ ہے۔ اب ہم بھاگ نہیں سکیں گے۔"

ایک دروازہ، چوڑے چکے سینے والا آدمی جس کی گھنٹی منہ میں اُس کے آدھے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی، دوڑتا آیا اور اُدشا کو گلے لگالیا۔ اُدشا نے اُسے قیس کے متعلق بتایا کہ اُس کا نام بگدرش ہے اور اُسے اس نے پکڑا ہے اور رات اُس نے اُسے اس مندر کے ایک کمرے میں رکھا اور اس پر پہرہ دیتا رہا ہے۔ اُدشا نے رات کی ساری بات سنائی۔

اُدشا کے باپ نے قیس کو گلے لگالیا اور بولا۔ "مُنہ سے مانگو۔ کیا انعام دوں۔ سونا مانگو، میرا گھوڑا مانگو۔"

"میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ قیس نے کہا۔ انعام کا کوئی لالچ نہیں۔ اگر انعام دینا ہی ہے تو مجھے اپنا بیٹا بنا لیں۔ آپ نے اپنی بیٹی کسی کو تو دینی ہے۔ یہ کرم مجھ پر کریں۔ اپنی بیٹی سے پوچھ لیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔"

اُدشا کا باپ خاموش ہو گیا۔ کچھ سوج کر بولا۔ "میں تم جیسے بہادر دل کی قدر کرتا ہوں۔ بہادر جسم بہت خوبصورت ہے۔ یہ مرد کا جسم ہے۔ میں فوجی عہدیدار ہوں۔ میں خاندانی باہی ہوں۔ میں اپنی بیٹی قیس سے کرکتن فوج میں لے جانا پسند کرتا ہوں۔ لیکن ایک فوجی عہدیدار سے بات چل رہی ہے۔ میں زبان سے پھر نہیں سکتا۔ کچھ اور مانگو۔"

"آپ کون سی فوج میں ہیں؟" قیس نے پوچھا۔

"بلند شہر کے راجہ کی فوج میں۔" اُدشا کے باپ نے جواب دیا۔

کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں۔ شام نے اپنی جگہ جا کر اپنے جسم سے رکھ دھوئی، سر اور دھوئی کے بال صاف کئے۔ کپڑے پہنے اور سر پر ہندوؤں کے طرز کی کپڑی باندھ لی۔ اُس نے کُرتے کے اندر خیر چھپایا اور قیس کی تلاش میں نکل پڑا۔

بہت دیر بعد اُسے قیس نظر آگیا۔ وہ اُدشا کے باپ کے ساتھ ایک قدیم عمارت کے سردار کے برآمدے میں ستون کے ساتھ بیٹھا تھا۔ شام دوسری طرف سے اس کھنڈر میں داخل ہوا اور دیے پاؤں اُس کمرے تک چلا گیا جس کے برآمدے میں قیس بیٹھا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی جس کے کوارٹسین تھے، ان دونوں کی پیٹھ پیچھے تھی۔ شام اس کھڑکی کے پیچھے بیٹھ گیا۔

”آپ یاروس نہ ہوں، وہ نظر آجائیں گے۔“ قیس اُدشا کے باپ سے کبر رہا تھا۔
”وہ تین ہیں۔“ قیس نے کہا۔

”لیکن جو تھے کے تعلق میں اب بھی نہیں مان رہا کہ وہ سارا راجہ تنوے کا ذاتی محافظ ہے۔“ اُدشا کے باپ نے کہا۔ ”تم کہتے ہو کہ تم اس کے سامنے نہیں جاؤ گے، اور میں ہوتا ہوں کہ میں ہمارا راجہ کے خاص آدمی پر کس طرح الزام عائد کروں گا کہ وہ غزنی کا جاسوس ہے۔۔۔ دہارا راجہ تنوے کا لائق نہیں سوجھ لوں گا۔“ قیس نے کہا۔

”شام نے اپنے کُرتے کے پیچھے سنہ خیر نکالا۔ اس کی نوک زبر میں کبھی پہلی تھی جسم پر اس کی خراش ہی کافی تھی۔ اس کا زبر سارے جسم میں پھیل جاتا تھا۔ شام کھڑا ہو گیا۔ فاصلہ صرف پانچ فٹ تھا۔ اُس نے پوری طاقت سے خیر پھینکا۔ خیر قیس کی پیٹھ میں اتر گیا۔ وہ اٹھا کھڑکی پر گر پڑا۔ شام اُس کمرے سے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

اُدشا کا باپ سمجھ گیا کہ خیر کس طرف سے آیا ہے۔ وہ کھنڈر کے اندر دوڑا گیا۔ شام دوسری طرف جان نکلا۔ اُدشا کا باپ کھنڈر میں قائل کر ڈھونڈ رہا تھا۔ شام برآمدے میں آیا اور قیس کی پیٹھ سے خیر نکال کر اُسی طرف چلا گیا جہاں سے آیا تھا۔ اُدشا کا باپ اُسے کھنڈر کے اندر اور باہر ڈھونڈتا رہا۔ قیس مڑ چکا تھا۔

اُس رات بڑے مندر کے چندت نے تمام راجہوں کو مندر میں بلایا۔

”اور اگر مل گئے اور وہ واقعی جاسوس نکلے تو اپنی بیٹی کا ہاتھ سمندر کے بڑے مندر میں بتا دے ہاتھ میں دے دوں گا لیکن راجہ سے انعام میں خود لوں گا۔ مجھے ترقی مل جائے گی۔ مجھے زیادہ آدمیوں کی کمان مل جائے گی۔“
”مجھے منظور ہے۔“ قیس نے کہا۔ ”میرے ساتھ چلو۔“

قیس تمام رات غائب رہا تھا۔ شام اور اُس کے دو اور ساتھی اُسے صبح سے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے ساوھوؤں کے بھیس میں طوفانی رات ایک مندر میں گذاری تھی۔ قیس شام کو واپس نہیں آیا تھا۔ اب ساتھی اُسے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک ہندو فوجی عہدیدار کو ساتھ لے آئیں۔ ڈھونڈ رہا ہے۔ اب دہاں کی کو ڈھونڈنا آسان نہیں تھا۔ لوگ شہر میں معلوم نہیں کہاں کہاں جا چکے تھے۔ ہر طرف کچھ اور پانی تھا۔

دوسرے رات شام سر قند کو اپنا ایک ساتھی ملا۔ اُس نے بتایا کہ اُس نے قیس کو دیکھا ہے۔ وہ ساوھوؤں کے بھیس میں نہیں بلکہ اُس نے اپنے کپڑے پہن رکھے ہیں جو اُس کے اپنے معلوم نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ایک آدمی ہے جو شکل و صورت قد بُت اور تلوار سے فوجی معلوم ہوتا ہے۔ اُردو فوجی نہیں تو کبھی آدمی منگلوک ہے اور وہ ہندو لگتا ہے۔ شام نے اُسے کہا کہ اپنے دوسرے ساتھیوں سے کہہ دے کہ غائب ہو جائیں۔

اُن کے اس ساتھی نے قیس کو دیکھا اور خود اُسے نظر آئے بغیر دہاں کھسک آیا تھا۔ یہ لوگ ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتے اور ضرورت سے زیادہ احتیاط کیا کرتے تھے۔ قیس کو اُدشا کا باپ اپنے ساتھ لے گیا تھا اور وہاں رات کو اُس نے اپنے کنبے کے ساتھ پناہ لی تھی۔ دہاں اُسے اپنے کپڑے پہنائے تھے اور اُسے اُس کے ساتھیوں کی تلاش میں لے گیا تھا۔

شام کو متاثرین کی باتیں آئیں۔ اُس نے کہا تھا کہ مقامی سُرخ رُوں پرانا زیادہ اعتماد نہیں کرنا چاہیے کیونکہ ہندوؤں کے زیر سایہ رہتے ہوئے یہاں کے مسلمان ہندو

دے جاتے ہیں کہ ان کے دلوں میں تہاڑی نفرت بھری ہوئی ہے۔ وہ ہمارے مذہب کو چھوٹا سمجھتے ہیں۔ اب آپ کو ثابت کرنا ہے کہ مذہب ہمارا سچا ہے۔ آپ کو غزنی کی فوج پر قہر بن کر کرنا ہے۔

ہندت نے راجوں مہاراجوں کو اسلام کے خلاف بھرپور شہرہ بنا کر ہری کشن واسدیو نے اسے اشارہ دیا ہے کہ اب مسلمانوں کو فیصلہ کن شکست ہوگی۔ ہندت بیٹھ گیا تو لاہور کے مہاراجہ جیم پال، قنوج کے مہاراجہ راجا پال، ومان بن کے راجہ کوئل چند کے علاوہ ہندو شہزادہ چندا، چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے راجوں کی وہ تاریخی کانفرنس ہوئی جس کے بعد سلطان محمود غزنوی کو ہندوستان پر تیار کرنی لینا کرنی پڑی۔ اُس نے اپنی تاریخ کی ایک ایسی پیش قدمی کی جسے آج تک تاریخ دان اور فنِ حرب و ضرب کے یورپی مہتر خارج تمسین نہیں کر رہے ہیں۔ ایک سو رنخ سر آرم سٹین نے لکھا ہے ”محمود غزنوی غزنی سے سمٹھر ٹمٹھ تلے سر کرتا، تیز و تند طغیانی کی طرح آیا اور مسٹر اور قنوج کو اجاڑ گیا۔“

اُس وقت کی تحریروں سے یہ ثابت ملتا ہے کہ اُس کی ان فتوحات کے پیچھے اُس کی انسانی بنس (دیوانِ شغلی اثرانِ سلوکیات) کا ہاتھ تھا۔ اُس نے ان مہاراجوں کی تیلی کی اطلاع قبل از وقت اور مکمل معلومات مل جانے پر برق رفتار پیش قدمی کی اور انہیں آدھ بوجھا۔

لاہور کا مہاراجہ جیم پال نے اور کالہنجر (کوئل کشن) کا راجہ جاکلی بھی سلطان محمود کے ہاتھ لڑتے اور ان میں یہ مسلحہ ہوا تھا کہ جیم پال غزنی کے خلاف کوئل کی کاروائی نہیں کرے گا اور بدلت ضرورت غزنی کی فوج کو ہندوستان میں جس مدد کی ضرورت ہوئی، اسے گا۔ یہی مسلحہ کالہنجر کے راجہ نے کیا تھا۔

یہ دونوں مہاراجے ۱۰۱۰ کے موسمِ برسات میں سمٹھر کے بڑے سندھ میں بہت سے راجوں مہاراجوں کے ساتھ بیٹھے سلطان محمود کو فیصلہ کن شکست دینے اور غزنی کی اینٹ سے اینٹ بجانے کا منصوبہ تیار کر رہے تھے۔ جیم پال ٹڈر نے اس کانفرنس

”میں نے آپ سب کو سونے اور چاندی کا یہ انبار دکھانے کے لیے بلایا ہے۔“ ہندت نے انہیں سونے کے زیورات اور نقدی کے ڈھیر دکھاتے ہوئے کہا۔ ”کل رات میں آپ کے پاس تھا جب طوفان آیا تھا۔ مجھے دوسرے ہندوؤں نے جو اُس وقت ہری کشن کی فوج کر رہے تھے، بلایا ہے کہ دیوتا کی آنکھیں پہلے سینہ ہوئیں پھر سرخ ہو گئیں، پھر ان آنکھوں سے شرار نکلے اور فوراً بعد بادل کی پیل گرج سنا دی۔ یہ گھنٹیاں اپنے آپ بجنے لگیں۔ دیوتا کی آنکھوں کا رنگ قرمزی ہو گیا اور بلی کرکے لگی، پھر طوفان آگیا۔“

”یہ وہ وقت تھا جب مہاراجہ قنوج کے فالوس گر پڑے تھے اور اگل لگ گئی تھی۔ کیا آپ دیوتاؤں کے اس اشارے کو نہیں سمجھتے، رات کا طوفان دیوتاؤں کا قہر تھا۔ رات کو ہی لوگ مندر میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ رات بھر یہاں مانتے رگرتے رہے ہیں۔ مجھے صاف اشدہ طلبے کہ جب تک غزنی کے سلطان کا سر کاٹ کر ہری کشن دسلیل کے قدموں میں نہیں رکھا جائے گا، یہ قہر ہم پر پڑتا رہے گا۔ رات کو ہی لوگ مارے گئے ہیں۔ یہی انکا آپ کا ہوا۔“

”میں اپنے لوگوں کو بتاتا رہا ہوں کہ جب تک اسلام کے لیے ہندوستان کا راستہ کھلا ہے، دیوتاؤں کی آنکھیں اگل برساتی رہیں گی۔ میں نے لوگوں کو بتایا کہ مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے شکست دینے کے لیے بہت بڑی فوج کی اور ان میں مکمل ضرورت ہے۔ یہ دیکھو غور توں نے اپنے زیورات اور مدد ملنے اپنی قدمی میرے آگے ڈھیر کر دی ہے۔“

یہ بدلت آپ کے حوالے نہیں کر دیں گے۔ آپ افسوس جب غزنی کی فوج کے خلاف لڑ رہی ہوگی اُس وقت میں آپ کو آپ کی فوجوں کے اخراجات سے آزاد کر دوں گا۔ تمام فوج سمٹھر کے اس مندر سے پورا ہوگا۔ آپ کی شکست میری شکست ہے۔ دیوتا مجھ سے جواب مانگیں گے کہ میں نے آپ کے دلوں میں اپنے مذہب کی برتری اور محبت اور اسلام کی نفرت پیدا نہیں کی۔“

”فتح وہ اہل حاصل کر سکتے ہیں جن کے دلوں میں اپنے دشمن کی اور اُس کے مذہب کی نفرت ہو نفرت ایک قوتِ برقی ہے۔ ملان اتنی دُور سے آکر تیس اس لیے شکست

میں صاف کہہ دیا کہ اس منصوبے میں وہ پیش پیش نہیں ہوگا، درپردہ ساتھ ہوگا۔ اُس نے دہریہ بیان کی کہ سلطان محمود کے خلاف جتنی لڑائیاں اُس کے خاندان نے لڑی ہیں، وہ اودھ کی نے نہیں لڑیں اور ہر بار اُسے اپنا نقصان اپنے فرائض سے پورا کرنا پڑا ہے اور اُس نے مجبور ہو کر سلطان محمود کے ساتھ صلح اودھ ہاج کا معاہدہ کیا ہے۔ اس منصوبے کی زیادت مبارک قنوج راجا پال کو دی گئی۔ موغلوں نے لکھا ہے کہ اتنی بڑی سکیم کی قیادت کا اہل مناراجہ قنوج ہی تھا۔ اُس کے پاس جنگی فہم و فرست بھی تھی، جنگی طاقت بھی تھی اور شمالی ہند میں قنوج کی گندی احتراک کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی، لہذا مشترکہ کمان اس کی کو دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ منصوبہ کچھ اس طرح بنا کہ تمام راجوں مہاراجوں کی آدمی آدمی قنوج کی ایک مشترکہ قوچ بنائی جائے اور اپنی نصف مختلف قلعوں میں تقسیم کر دی جائے تاکہ سلطان محمود کو اپنی حد کرے یا کسی اور راستے سے آجائے تو قلعہ بند قنوج اُسے روکے۔ مشترکہ قنوج کے لیے طے پایا کہ پشاور کی طرف پیش قدمی کرے اور سلطان محمود کو پشاور کے قریب (دورہ خیبر کی سمت) سیدان میں ٹھکا راجائے اور اس سے پہلے قنوج کا کچھ حصہ بڑاؤں میں جگہ جگہ گھات میں بھجایا جائے جو اُس کی جنگی طاقت کو پینڈلیوں میں ہی کمزور کر دے۔

اس منصوبے پر سب نے اتفاق کیا۔ سب نے کشن واسیلو کے بت کے سامنے کھڑے ہو کر حلف اٹھایا کہ وہ اس منصوبے کی کامیابی کے لیے جان اور مال کی قربانی دیں گے۔

اسیرین تاشقین مبارک قنوج کے ذاتی محافظ کی حیثیت سے وہاں موجود تھا۔ تین چار اور مہاراجوں کے ذاتی محافظ بھی اندر بھتوں کی طرح کھڑے تھے۔

سمتھرا سے تقریباً ایک سو میل دور شمال مشرق میں دریا سے گنگا میں گرنے والے ایک چھوٹے دریا رام گنگا کے کنارے بلند شہر واقع ہے۔ اُس قدر میں یہ چھوٹی سی ایک راجہ دانی تھی اور اس کا نام بارن یا برن ہوا کرتا تھا۔ اس مہاراجہ ہر دت بھی اس کا کھڑنٹس میں موجود تھا۔

”تم نے سلطان محمود کو شکست دینے کا بڑا اچھا منصوبہ بنالیا ہے۔“ راجہ ہر دت

نے کہا۔ ”لیکن کسی نے بھی اس پہلو پر توجہ نہیں دی کہ سلطان ہریا کو بھلے فتح حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بھی سوچیں کہ اُن کے پاس کونسا جادو ہے جو ہم میں نہیں..... میں اتنے کی ایک خفیہ بیان کروں گا۔ غزنی کے جاسوس بہت تیز اور ہوشیار ہیں۔ وہ غزنی کی فوج کی سب سے بڑی طاقت ہیں..... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ میں بھی غزنی کے جاسوس مجدد ہیں اودھ ہاری باتیں سن رہے ہیں۔ رات کو نکلنے میں کچھ جانیں ضائع ہوئی ہیں اور آج غزنی کا ایک جاسوس اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ میری فوج کے ایک عہدیدار نے اتفاق سے ایک جاسوس سے اُس کا اصل مدبہ معلوم کر لیا تھا۔ اس جاسوس نے اپنے تین ساتھیوں کو پکڑ لیا چاہا مگر معلوم نہیں کہ ہر سے ایک خبر آیا اور یہ جاسوس ہلاک ہو گیا۔ اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے جاسوس کیسے ہیں اور ان کی نظر کہاں سمجھتی ہے۔“

راجہ ہر دت نے اودھ کے آپ سے سنا ہوا افسانے اور اودھ کا سارا واقعہ سنا لیا، بھر کھنڈے۔ ”مرنے والے نے ایک ایسے جاسوس کی نشاندہی کی تھی جس کا ابھی ہم نہیں لیا جاسکا کیونکہ اُسے ایسی حیثیت حاصل ہے کہ لازم غلط ہوا تو ہم میں غلطی پیدا ہو جائے گا۔“

ہر دت نے انکھیں اسیرین تاشقین کی طرف دیکھا جو بت بنا کھڑا تھا۔ وہ اندر سے لرز گیا مگر بت کی طرح کھڑا رہا۔ راجوں مہاراجوں نے ہر دت سے کہا کہ وہ اُس جاسوس کا نام لے لیکن اس نے کہا کہ وہ پہلے اپنے طور پر سرغزنی کرے گا، پھر اس جاسوس کو سب کے سامنے کھڑا کر دے گا۔

یہ مغل برخاست ہوئی تو مبارک قنوج نے راجہ ہر دت کو ساتھ لے لیا اور اُس سے پوچھنے لگا کہ چونکہ اُسے مشترکہ کمان دے دی گئی ہے، اس لیے اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ وہ کیسے جاسوس سمجھ رہا ہے جسے بیان اتنی اپنی حیثیت حاصل ہے کہ وہ اُس پر الزام لگانے سے ڈرتا ہے۔ ہر دت اُسے اُن کی تاشقین ساتھ ساتھ چلا لے گا۔ تھا۔ مہاراجوں کے خیمے اُڑ جانے کی وجہ سے اُن کے لیے مکان خالی کرائے گئے تھے۔ ہلاکت

قنوج اپنی رملش گاہ میں پہنچا تو اُس نے تاشقین کو جسے وہ جگن ناتھ سمجھتا تھا، جھنجھی دے دی اور وہ ہر دت کو پست لایا اور اندر لے گیا۔

چچا سدا راج کی لاڈلی رانی تھی۔ وہ اُس کے انتقاد میں تھی۔ اُس نے سدا راج اور راج ہر دت کو شراب کے پیالے پیش کیے اور سدا راج کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ہر دت نے چچا کی طرف دیکھا تو راجا پال اشارہ سمجھ گیا۔ اُس نے چچا سے کہا کہ ایک ضروری بات کرنی ہے اس لیے دو کچھ دیر کے لیے دوسرے کمرے میں چلی جائے۔ چچا جلی تو گئی لیکن تجسس نے اُسے دو کمرے کے ساتھ ہی روک لیا اور وہ باتیں سننے لگی۔

”میں جو بات کہنے لگا ہوں، وہ اُس قسم کے مطالبہ ہے جو ہم سب نے مندر میں کھائی ہے۔“ راج ہر دت نے کہا۔ ”مجھے میرے عمیدار نے بتایا ہے کہ آپ کا یہ ذاتی محافظ جگن ناتھ نیس امیرین تاشقین ہے اور یہ غنی کا بڑا بی دانشمند اور ہرن سولا جاسوس ہے۔ میرے قبیلا کو یہ بات اُس جاسوس نے بتائی تھی جو قتل ہو گیا ہے۔“ آپ کو میری بات ابھی نہیں لگی ہو گی۔

”تپسکی بات مجھے بڑی نہیں لگی۔“ سدا راج راجا پال نے کہا۔ لیکن میں مان نہیں سکتا کہ کوئی اجنبی مجھے اس طرح دھوکا دے سکتا ہے۔ میں آپ کے الزام کو ماننا نہیں۔“ اگر آپ سننے کی ہمت رکھتے ہیں تو میں ایک بات اور بھی کہنا چاہتا ہوں۔“

راج ہر دت نے کہا۔ ”آپ کے لیے حسین لڑکیوں کی کمی نہیں رہے گی۔ معلوم ہوا ہے کہ چچا رانی اور آپ کے ذاتی محافظ کا درپردہ دوستانہ ہے۔ اگر آپ چھوٹی رانی کی خاد سے پرہیز جو اُس کے ساتھ برسوں رات دیر پار گئی تھی تو آپ کو حقیقت معلوم ہو سکتی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ لڑکی اس جاسوس کے ساتھ مل کر آپ کے لیے ایک مین دھوکہ دہی ہوئی ہے۔“

”ذرا کھنکھ کر بتائیں کہ آپ کو یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئی ہیں۔“ سدا راج راجا پال نے کہا۔ ”میں غلام کو آپ کے سامنے بلاؤں گا اور صبح آپ میرے محافظ اور میری رانی کی لاشیں دیکھ لیں۔“

”اُس عمیدار کو میں نے اپنے ساتھ رکھا ہوا ہے۔“ راج ہر دت نے کہا۔ وہ باہر

کھڑا ہے۔ آپ اُس کی زبانی جاسوس کے متعلق سن سکتے ہیں۔“ اور اُس نے چچا اور تاشقین کی مددگی کی تفصیل سنائی شروع کر دی۔

چچا ران سے دہے پاؤں باہر نکل گئی اور تاشقین کے کمرے میں جا پہنچی۔

”خوارنگھو اور گھوڑا نکالو۔“ چچا نے اُسے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ہم دونوں کا راز کھل گیا ہے۔“

”کیسا راز؟“ تاشقین نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟“

”بلند شہر کا راج ہمارے سدا راج کو بتا رہا ہے کہ تم جگن ناتھ نیس، غزن کے مسلمان ہو۔ معلوم نہیں اُس نے تمہارا کیا نام بتایا ہے۔“ اور اُس نے سدا راج کو بھی بتایا ہے کہ میری اور تمہاری درپردہ دوستی ہے۔ وہ میری خاد کو بلارہے ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے کہ تم مسلمان ہو؟“

”کیا تم مجھے پکڑوانے آئی ہو یا مجھے یہاں نکل جانے کو کہنے آئی ہو؟“

”مجھ سے کہہ بھی نہ چیا۔“ چچا نے کہا۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔ خوارنگھو

اور مجھے ایک چادر دو جو میں اپنے اوپر ڈال لوں۔ جلدی کرو۔“

”وہ ٹھیک کہتے ہیں چچا۔“ تاشقین نے کہا۔ ”میں مسلمان ہوں۔ میرا نام

تاشقین ہے۔ کیا اب بھی میرے ساتھ چلو گی؟ مسلمان ہو جاؤ گی؟“

”میں تمہارے ساتھ چلنے اور تمہارے ساتھ مرنے کے لیے آئی ہوں۔“ چچا نے

کہا۔ ”مجھے چادر دو۔“

تاشقین نے ایک چادر چپا کو دی۔ تلوار کرے باز میں اور خنجر بھی مگر بند سے اُس

لیا۔ دونوں اصل کی طرف چل پڑے۔ اُدھر سدا راج راجا پال نے گرج کر حکم دیا کہ

اُس کے محافظ اور چہارانی کو فوراً حاضر کیا جائے۔

تاشقین نے چچا کو ایک جگہ اندھیرے میں کھڑا بننے کو کہا اور خود اُس جگہ چلا

گیا جہاں گھوڑے بندھے تھے۔ اُس کی حیثیت ایسی تھی کہ اُس کا حکم فوراً مانا جاتا

تھا۔ اُسے کوئی روک نہیں سکتا تھا۔ اُس نے سامنے سے کہا کہ اس کے گھوڑے

کی زمین وغیرہ جلدی لائے۔

اُدھر ساداجہ کو بتایا گیا کہ چپارانی معلوم نہیں کہاں ہے۔ ساداجہ نے حکم دیا کہ دونوں کو فوراً تلاش کرو۔ اگر وہ بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں ہلاک کر دیا جائے۔ اس حکم پر وہ دس بارہ محافظ جو ساداجہ کے پیروں پر رہتے تھے، دوڑاٹے۔ ایک جلدی شکل سے انہوں نے تین چار منٹ میں جلالپور اور ساتھ لے گئے تھے۔

شاہنشین کا گھوڑا تیار ہو گیا۔ وہ اس پر سوار ہوا اور وہاں پہنچا جہاں جہاں اس کے اختصار میں کھڑی تھی۔ اُس نے جہاں کو اپنے پیچھے سوار کر لیا مگر گھوڑا موڑا تو آٹھ سے منٹیں کہری تھیں۔ شہر کا دواڑہ کھلا تھا مگر اب اُدھر سے نکلنا مشکل تھا۔ اُس نے گھوڑے کو دوسری طرف موڑا۔ اسے وہاں نظروں کی للکار سنائی دی کہ رک جاؤ ورنہ تیرا رہے ہیں۔ وہ نہ رکا۔ اُسے جہاں کی چیخ سنائی دی۔ وہ اتنا ہی کہ سکی کہ میری بیٹی میں دوسرا اثر گئے ہیں۔ یہ کہہ کر وہ گھوڑے سے گر پڑی۔

گھوڑا بڑی زور سے سنایا اور رکنے لگا۔ شاہنشین سمجھ گیا کہ گھوڑا ابھی تیروں کا نشانہ بن گیا ہے۔ گھوڑا بے نظام ہونے لگا تو شاہنشین دوڑتے گھوڑے سے کوڑا۔ اُس کے قریب سے تیر گزر گئے۔ وہ ایک گاہ میں داخل ہو گیا۔ اپنے تعاقب میں آنے والوں سے پہلے ہی وہ محل کے دو تین موڑ مر گیا۔ اسے جہاں کا کوئی فہم نہیں تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ مر چکی ہوگی۔ اُسے اس لڑکی کے خون کا بدلہ نہیں لینا تھا۔ وہ جس فرض کے لیے بے مل آیا تھا، اُسے وہ پورا کرنا تھا۔ اُسے غری پہنچنا تھا۔

اُسے معلوم تھا کہ شہر کی دیوار کا ایک حصہ دیا کے باطل سمیت ہے اور رات کی بارش سے دریا میں آنا پانا ہو گا کہ دیوار کو چھوڑا ہو گا۔ بھیس میں اس کے تعاقب میں آنے والے شہر چھانے جا رہے تھے۔ شاہنشین اُس چوڑی دھلان تک پہنچ گیا جو دیوار کے اوپر جاتی تھی۔ نیچے کے شور سے دوسری جو دیوار پر پہرہ دے رہے تھے، اُس کے راتے میں آگئے۔ اُس نے ان کے قریب جا کر تلوار نکالی اور ایک کے پیٹ میں اتار دی۔ دوسرا بھاگ اٹھا۔ شعل بر دار ممالک دھلان تک آگئے۔ شاہنشین دیوار پر دیر کی طرف چلا گیا۔ وہاں سے دیوار بہت اونچی تھی۔ اُس نے

دریا میں چھلانگ لگادی۔

مستقر اسے غزنی تک کا ہوائی فاصلہ سات سو میل ہے۔ راستے میں سات بڑے دریا آتے ہیں۔ آدھے سے زیادہ راستہ پہاڑی علاقوں سے گزرتا ہے۔ تاریخ دان لکھتے ہیں کہ یہ تین بیہوشوں کی مسافت تھی۔

سلطان محمود غزنوی خوارزم کو اپنی سلطنت میں شامل کر چکا تھا۔ خوارزم کی فوج کو اُس نے غزنی کی فوج میں مذکور کر لیا تھا اور اُس نے بھرتی کی مہم تیز کر دی تھی۔ اس کی بہت سی فوج ضائع ہو چکی تھی۔ اُس نے سب دہا میں اعلان کر دئے تھے کہ ہندوستان جو محمد بن قاسم کے دور میں اسلامی ملک بنا جا رہا تھا، ہندوؤں کا بھارت خانہ بن گیا ہے اور وہاں اسلام کے سرچشمے کو بند کرنے کے چلن مندرجہ بن رہے ہیں۔ ہم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ اسلام کا پیغام دور دور تک پہنچائیں اور ہندوستان سے اُس وقت خاتون کا نام نہ کریں۔ یہ ایک ایسی شیطانی قوت ہے جسے وہیں نہ دیا گیا تو یہ اسلام کی بقا کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائے گی۔

سب دہا میں امام اسی موضوع پر وعظ دیتے اور لوگوں کو فوج میں شامل ہونے کے لیے تیار کرتے تھے۔ یہ وہ فوج قرآن اور احادیث کے حوالوں سے بھی ہوتے تھے اور جذباتی انداز سے بھی۔ سلطان محمود کا یہ پیغام سب دہا میں اور سرکاری انتظامات کے تحت سلطنت کے گوشے گوشے میں پہنچا گیا!

”سلطانی ایک بڑا نازک فرض ہے جو خدا نے مجھے سونپا ہے۔ سلطان کا کام صرف حکومت کرنا نہیں ہوتا۔ اس کے فرائض میں شامل ہے کہ قوم کو خوشحال اور باقدار رکھے اور اویٹ اس کو بے کوشگی طاقت اتنی تیار کرے کہ اپنے دین کے دشمنوں کے پاس خواہ کتنی ہی جنگی طاقت ہو وہ سر نہ اٹھا سکیں اور اگر اُس کے ہڑوس میں مسلمانوں پر کفار ظالم و تشدد کر رہے ہوں تو ان کی نجات کے لیے خود بھی جائے اور قوم کو بھی اس جہاد کے لیے تیار کرے۔۔۔۔۔ مجھے قوم کے تعاون کی ضرورت ہے۔ غزنی کے شیر داؤد ہم اپنی زندگی میں یہ فرض پورا کر جائیں“

اس نے شراب پیا اور سانسوں کو سنبھالنے لگوئے اور "بھلا کون سا راجہ اس کے نام بتائے جنہوں نے مندر میں کانفرنس کی تھی۔ سلطان کو ان کا منصوبہ بتایا اور نیکے پرائے دکھانے لگا کہ سترہ اتنوچ، بلند شہر اور مابین کابل کماں ہیں اور اس علاقے میں گھنے جنگل کے علاوہ گنگا اور جمن بہت مشکل پیدا کریں گے۔ پھر اس نے نیتے پر وہ چھوٹے چھوٹے قلعے دکھائے جن میں ماراجوں نے مشرک فوج کی نصف نفری رکھنے کا فیصلہ کیا تھا۔

"وہ پشاور کے اُس میدان میں آکر لڑنا چاہتے ہیں جہاں آپ بھیم پال نڈر کے باپ بے پال کو شکست دے چکے ہیں۔" امیر بن تاشقین نے کہا۔ "وہ لنگان کی پہاڑیوں تک اپنے دستے ہمارے انداز سے گتات میں بٹھائیں گے۔ اگر ہماری فوج لگے نکل گئی تو چھوٹے چھوٹے قلعوں کی فوج بدلا راستہ روکے گی۔"

"لاہور کے بھیم پال کے کیا ارادے ہیں بھائی۔ سلطان محمود غزنوی نے پوچھا۔

"وہ آپ سے دو تاشی ہے اور اس منصوبے میں بھی بری طرح شامل ہے۔"

"اُسے ایسا ہی کرنا چاہیے۔" سلطان نے کہا۔ "اُسے اپنی شکست کو فتح میں بدلنا چاہیے۔ ہندوستان کے راجپوت ویرلوگ جس عزت والے ہیں... کیا تم بتا سکتے ہو کہ ان کی فوجیں کب تک اکٹھی ہو سکیں گی اور وہ ہشتادی کب تک کریں گے؟"

"کم از کم ایک سال لگے گا۔" تاشقین نے کہا۔ "ستھرا کے بندت انہیں جلدی کرنے کو کہہ رہے تھے۔"

"ہم ان کا انتظار لنگان اور پشاور میں نہیں کریں گے۔" سلطان نے کہا۔ "ان سے ہماری ملاقات ستھرا اور تنوچ میں ہوگی... تاشقین! پورا ایک مہینہ آرام کرو تم بہت زیادہ انعام کے مستحق ہو۔ یہ تین تھوڑی دیر میں مل جائے گا۔"

"دشمن کی تیاری کی حالت میں جا بکر ڈ۔" سلطان محمود اپنے سالاروں اور نائب سالاروں کو اپنے فیصلے سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں بتا رہا تھا۔ "دشمن کو حملہ کرنے کی سکت نہ دور میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ ہند کے مدارجے کس طرح اکٹھے ہو رہے ہیں اور وہ فوج کو کس طرح تقسیم کر رہے ہیں۔ ہم اس وقت انہیں جا بکر ڈیں گے جب ان سے دستے منتر کر

سلطان محمود غزنوی جس قدر قابل جریں تھا، اتنا ہی قابل ناظم تھا۔ ہندوستان سے وہ جو زور و جہاز لے جاتا تھا، انہیں وہ لوگوں کی فلاح و بہبود اور تعلیم و تربیت پر خرچ کیا کرتا تھا۔ اس کا کچھ حصہ فوج کے باہریوں میں تقسیم کر دیا کرتا تھا۔ چونکہ لوگ شمال بچے اس لیے وہ سلطان کے اشاروں پر سرگرم عمل ہو جاتے تھے۔ اب ۱۰۱۷ء کے آخر میں اس نے اپنی سلطنت میں فوجی بھرتی کا جنون طاری کر دیا۔ وہ اپنے سالاروں سے کہنے لگا تھا۔ "مجھے اپنے والد محترم کی یہ حیثیت پوری کرنی ہے کہ ہندوستان کے کُرت خانے ختم کر کے ران اسلام پھیلانا ہے۔" مجھے خواب میں بھی یہی اشدہ ملا تھا۔ میرے برادر شہد شہنشاہ ابراہیم غزنوی نے بھی یہی حکم دیا ہے۔ میری عمر تھوڑی رہ گئی ہے اور ہم بڑی دور کی ہے۔"

سلطان ہندوستان کی خبروں کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ وہ یہ سننے کے لیے حجاب رہتا تھا کہ ہندوستان کے راجے مارا ہے اس کے خلاف جنگی تیاریاں کر رہے ہیں۔ ۱۰۱۷ء کا سال ختم ہو چکا تھا۔ ۱۰۱۸ء کے تین مہینے گزر گئے تھے۔ اسے کوئی اطلاع سنیں ملی تھی۔

ایک روز اُسے بتایا گیا کہ ہندوستان سے امیر بن تاشقین نام کا ایک آدمی آیا ہے۔

"تاشقین آگیا ہے؟" سلطان نے اچھل کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "تورا بلاؤ۔"

جب تاشقین اندر آیا تو سلطان حیرت سے دیکھتے بٹ گیا۔ یہ زرد رُو، مرمل چہرہ

جس پر گرد کی تہ جمی ہوئی تھی، تاشقین کا نہیں تھا۔ اس کی کمزور ہری ہوتی جاہی تھی۔ اُس سے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ سلطان نے اُسے سدا سے کر بٹھایا اور اُس کے لیے شراب اور کھانا لائے کو کہا۔

"تین مہینوں کا سفر دُورہ بیٹھنے میں طے کیا ہے۔" تاشقین نے باہمی آواز میں کہا۔ "ستھرا میں گرفتار ہو چلا تھا۔ خدا نکال لایا ہے... ہندوستان کا نقشہ لایا ہے... گھوڑے جوڑی کرتے اور دُور دُور اکر مارے پہنچا ہوں۔ ایک آدمی کو گھوڑے کی خاطر قتل کرنا پڑا۔ ایک دریا بغیر گھوڑے کے تیر کر پار کیا۔ گھوڑے پر ہی سوتا رہا ہوں۔"

نہیں ہوتی۔ لڑنے کے بعد ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادہ بھی ہے۔ رزیتہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ سلطان نے یہ فوج ترکستان، خوارزم، ہزارستان اور چند اور پڑوسی علاقوں سے اکٹھی کی تھی۔ ہر فیصد جیب نے مورخوں کے حوالے سے فوج کے تعداد ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار رضا کار بھی ہے۔

یہ فوج مکی میل لپی تھی اور زنا رست تیز۔ یہ فوج دریائے سندھ اور جہلم اس حالت میں پار کر گئی کہ دونوں دریاؤں میں مٹیانی تھی۔ مورخ لکھتے ہیں کہ ریل گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کے لیے کشتیوں کے پل بنائے گئے۔ فوج نے انسانوں کو پل بنا کر دے پار کر دیے۔ دریائے رومی دریا پر سے اس جگہ سے پار کیا گیا جہاں پاٹ بہت چوڑا ہو جاتا تھا اور دریا کی شاخوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔

سلطان نے اس سے آگے کسی ذرہ دار پھینک دی ضرورت محسوس کی۔ اس نے اپنا ایک ایلی کا لہڑ (موجودہ کوٹلی) کے راجہ کے پاس (۱۲۱) پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اُسے قنوج تک ایک رہبر کی ضرورت ہے۔ ایلی کے ساتھ سلطان نے ایک محافظ دے بھیجا۔

”سلطان غزنوی محمود نے سلام بھیجا ہے۔“ ایلی نے راجہ کا لہڑ سے اس کے دربار میں کہا۔ ”سلطان نے وہ معاہدہ یاد دلایا ہے جس کے تحت آپ غزنی کی فوج کی مدد کرنے کے پابند ہیں۔ سلطان نے کہا ہے کہ میری منزل لکھنؤ اور ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ میری فوج کو اپنے ہاں آ کر پرہیز نہیں کریں گے۔ اگر آپ آزاد اور خود مختار رہنا چاہتے ہیں تو میری خدمت فوری طور پر پوری کریں۔ رہبر ایسا بھیجیں جو دھوکہ نہ دے۔ دھوکے کی صورت میں میں اسے اپنے خلاف اعلان جنگ سمجھوں گا۔“

راجہ قنوج میں بڑ گیا۔ ایلی نے کہا۔ ”سلطان کے ساتھ جو فوج ہے آئی آپ کی رہائی کے لیے۔“

راجہ نے اُسی وقت اپنے بیٹے شانی کو (جسے بعض مورخوں نے لکھا ہے) ایلی کے ساتھ روانہ کر دیا۔ سلطان نے اُسے ساتھ لے لیا اور اُسے قنوج تک پھوٹے سے پھوٹے راستے سے لے چلے کوٹلی۔ راستے میں کئی قلعے تھے۔ سلطان محمود نے ہر قلعہ کا محاصرہ کر کے قلعہ داروں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں۔

فوج بنانے کے لیے ستر کی حالت میں ہوں گے۔ ہمداسب سے ہزار سوار اور کالیہ سہی سہی تھیں نے بھی بتایا ہے کہ ستر کے بہت مقدس جگہ جاتے ہیں اور ستر ہندوؤں کے کرشن ماراج کا جائے پیدائش ہے۔ کرشن ان کا پیغمبر تھا۔ تافقیں نے بتایا ہے کہ اُس کا بہنہ، سنگ برہما ہے اور اس کی آنکھیں نہایت خوشنما اور بیش قیمت ہر دل کی ہیں۔ سدرے ہند کے ہندو اس بہنہ کی زیارت کے لیے جاتے ہیں۔۔۔

”ہمیں فوراً کوچ کرنا ہے۔ ہم پنجاب میں سے نہیں گزریں گے۔ وہاں کا مارا جیہم پیل ہلا، جگر مارے گرائس کی زیت ٹھیک نہیں۔ ہم کشمیر کی ان پہاڑیوں کے ساتھ ساتھ جن کے دامن میں پنجاب واقع ہے، گزریں گے۔ ذہن میں رکھیں کہ ہمارے راستے میں سات دیا آئیں گے۔ پہاڑ اور جھیل آئیں گے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ ہم اپنے ملک سے بہت دور جا کر لڑیں گے۔ یہاں تک کہ لے گی۔ نہ رسد۔ نہ رسد نہیں راستے سے پوری کرنی ہے۔“ سلطان محمود نے ہندوستان کا نقشہ جو اُس نے اپنے ہاتھ سے چادر جتنے بڑے کپڑے پر بنا رکھا تھا، سب کے سامنے رکھتے ہوئے یہ بتایا کہ پیش قدمی کا راستہ یہ ہو گا اور مستقر پر براہ راست حملہ نہیں ہو گا۔ پہلے ارد گرد کی ریاستوں کو ختم کیا جائیگا۔

”لیکن ہم آسٹریلیا میں ہو گے۔“ سلطان نے کہا۔ ”ہم جان کی بازی لگا رہے ہیں۔ وہ اراج قنوج مارا جیہم پال سے مختلف ہے۔ سنا ہے وہ لڑنا اور اپنی فوج کو لڑانا جانتا ہے۔ ہمارے آدمیوں نے ستر میں جاں لاکھوں ہندو جمع تھے غزنی کی فوج کی ایسی دہشت پھیلانی ہے کہ وہاں کے لوگ بھگڑ پھریں گے مگر یہ نہ بھولنا کہ کئی مذہب پر ادرست مقام پر حملہ ہو تو وہ جان کی بازی بھی لگا دیا کرتا ہے۔“ سلطان محمود نے دیگر ہدایات دیں اور زیاری کے لیے صرف تین دن دے کر پچو تیر روز کوچ کا حکم دے دیا۔

سلطان محمود نے بروز ہفتہ ۲ ستمبر ۱۰۱۹ (۱۳ جمادی الاول ۹۴۰ھ) غزنی سے کوچ کیا۔ مورخوں میں اس کا جملہ لقب کے متعلق کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ علی نے اس کی فوج کی تعداد گیارہ ہزار بتا کر فوج اور بیس ہزار رضا کار بھی ہے جو صحیح معلوم

شہر کو غزنی کی فوج نے محاصرے میں لے لیا ہے تو لوگوں میں بھگدڑ پکڑ گئی۔ سارے شہر پر دہشت طاری ہو گئی۔ یہ غزنی کے جاسوسوں کی پھیلائی ہوئی دہشت تھی۔ سلطان نے قلعے کے دروازے پر اپنے آدمی بھیج کر اعلان کرایا کہ ہتھیار ڈال دو، ورنہ شہر کو بجے میں بدل دیا جائے گا۔

انھیں دروازے کو کھین مار کر توڑنے کے لیے سامنے کھڑے دیے گئے۔ راجہ فرت نے ایسی بزدلی کا مظاہرہ کیا کہ قلعے کا دروازہ کٹلا اور وہ باہر آگیا۔۔۔۔۔ کے قیدی دس ہزار افغانی کی فوج بھی بھاریوں کے بغیر باہر آگئی۔ ہر دہ کو سلطان۔ پاس لے گئے۔

”یہ اپنی، اپنے کنبے اور اپنی فوج کی سلاستی چاہتا ہوں۔“ راجہ سردار نے سلطان سے کہا۔ ”میں اور یہ دس ہزار فوجی اسلام قبول کر۔ ہزار آمانہ دیں۔ ہمیں اپنے مذہب میں قبول کر لیں۔“

زیر اثر تروٹین نے لکھا ہے کہ یہ دس ہزار افراد صرف فوجی تھے۔۔۔ ان میں شہریوں کی تعداد زیادہ تھی۔ انہوں نے ہر دت کو مجبور کیا تھا کہ وہ شہر سے تباہی سے بچانے کے لیے صبح کرے ورنہ وہ اپنے زیر اثر فوجیوں کے ساتھ دہلا دیا۔ دس دس گئے۔ ایک مونس گرونی نے لکھا ہے کہ راجہ ہر دت دھوکہ دے کر ہر گال گیا تھا۔

سلاطین محمود نے ان دس ہزار افراد کو تلے میں یا بند کر دیا، امدادات کے وقت اُس نے فوج سے دیر یا بے گھر کر دیا، اُس نے ستم کا رخ کیا، بلکہ ستمگر کو نظر انداز کر کے مہابین کی طرف توجہ دے دی۔ اُسے اطلاع ملی کہ مہابین کے راجہ کوئل چند نے اپنی زوجہ فنگل میں لڑائی کے لیے تیار رکھی ہوئی ہے۔ کوئل چند کو گھسے جنگل کا نامہ حاصل تھا۔ اُس کی فوج میں ہاتھی بھی تھے جنہیں اُس نے حملے کے لیے تیار رکھا ہوا تھا۔

سلطان محمد نے اپنی فوج کا زیادہ تر حصہ جنگل کے درختوں پہلوؤں میں بھیج دیا اور صرف ہراول کے دستے جنگل کے اندر اس انداز سے بھیجے جیسے وہ دشمن سے بے خبر ہوں۔ یہ دستہ جنگل کے وسط میں نیپیا تو کوئی چند نے چلے گا حکم دے دیا۔ سلطان کا دستہ گولہ بار
تھا، گھنے جنگل میں کبھر گیا۔ یہ گھنے جنگل کی زبان تھی جس میں تیر انداز زیادہ سوشلٹ

بیشتر قلعہ داروں نے اوپر سے سلطان کی فوج رکھیں تو سفید جھنڈا لہرایا۔ سلطان نے
برقیے سے اپنی ضرورت کا سامان لے لیا اور بعض اہم قلعوں میں اپنی کچھ فوجی جھوڑ دی
اور قلعے کے بندستانی دسے کو موٹا لیاں دھیکلنے اور سامان اٹھانے کے لئے ساتھ لے لیا۔
سلطان اپنی کجوزی اور غمخیزی دیکھتے ہیں کہ سلطان محمود کی اسی قدر دہشت مقلد
اُس کے آگے قلعہ اور چھوٹے بڑے شہر اور قصبے جیسے اپنے آپ فتح ہوتے جا رہے تھے۔
سرارل شیخ نے لکھا ہے۔ ”جن گھنے جنگوں میں ہوا بھی راز سے بھول جاتی ہے ان میں
سے سلطان اپنی فوج گذار کر لے گیا۔ اُس نے پنجاب کے پانچ دریا جیسے اُدک پار کئے
ہوں، اور وہ بلند شہر تک سندھ کی موجوں کی مانند پہنچ گیا۔

سلطان محمود نے متھرا کو اپنی سکیم کے مطابق نظر انداز کر دیا اور ۲ دسمبر ۱۰۱۸ء (۲۰ رجب ۱۲۴۰ھ) کو دریائے بنارس پر اس کے سامنے سرسواراں جو اُس وقت شادیاں کھلاتا تھا) کا قلعہ آگیا۔ اُس نے قلعے کا محاصرہ کر لیا لیکن محاصرہ مکمل ہونے سے پہلے ہی وہاں کارائے اپنے کنبے کو ساتھ لے کر بھاگ گیا۔ اُس کی فوج نے غیر لڑے ہوئے ہتھیار ڈال دیئے۔ سلطان کو قلعے سے بیس باقی بچے۔ اُسے اس علاقے میں ایک اڈے کی ضرورت تھی۔ اُس نے اسی قلعے کو رستہ کاہ بنایا۔ قلعے سے دس لاکھ درہم خزانہ ہاتھ آیا۔

سر سادہ اسے سلطان نے بلند شہر کا رخ کر لیا جو وہاں سے کم دیر میں ایک سو میل دور تھا اور وہاں پہنچنے کے لیے ایک تو دیوانے لگھا عبور کرنا تھا، دوسرے رام گھٹا چڑھ کر سلطان کو ایک اڑھ مل گیا تھا اس لیے اُس نے رمد کے قلعے کو ساتھ گھیننے کی بجائے صرف فوج ساتھ لی۔ قیدیوں سے کشتیوں کا بلی بنوایا اور دونوں دریا پار کر کے بلند شہر کو محاصرہ میں لے لیا۔

بلند شہر کا حکمران راجہ ہر رت تھا جس نے بہار اچھوتوں کو بتایا تھا کہ اُس کا ذاتی منظر
جگن ناتھ سلائی جا سوس ہے اور یہاں رانی کے ساتھ اس کی دہریہ دوستی ہے۔ دوسرے
راجوں والوں کے ساتھ اس نے بھی قہر کے مندر میں حلف اٹھایا تھا کہ مذہب اور
مساہدت کے لیے جان و مال کا قربانی دے گا مگر اس کے شہر میں لوگوں کو اطلاع ملی کہ

نہیں ہو رہے تھے سلطان گھوڑ سوار پھرتی سے ادھر ادھر ہو جاتے تھے۔
 اچانک کول چند کی فوج پر دایسے بائیں اور عقب سے تیاست ٹوٹ پڑی۔
 ہر اول دست ایک طرف ہو گیا۔ ہندوؤں کی فوج کے لیے اب کٹ مرنے اور بھاگنے
 کے سوا کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا۔ سرکار میں نے اس لڑائی کو ان الفاظ میں بیان
 کیا ہے۔ ”اتنے گھنے جنگیں جس غزنی کی فوج بالوں میں گھٹکی کی طرح پھرتی۔ ان کے درمیان
 تھا جو اس فوج نے عبور کیا تھا۔ کول چند کی فوج دریا میں کود گئی اور بہت کم نفری زندہ رہی۔
 ان میں سے جو کدے پر آتا تھا اسے سلطان ترانہ از قہم کر دیتے تھے۔“

راجہ کلاپتیکس نظر نہیں آ رہا تھا۔ اُس کے خوبصورت محل میں گئے تو اُس کے
 چرچہ کرنے بتا کر راجہ کی ایک بیوی اور ایک بچہ تھا۔ اُس نے دونوں کو تلوار سے قتل
 کیا اور اپنا خراج اپنے دل میں گھونپ لیا ہے۔ چوہدرے اندر سے جاکر تینوں کی لاشیں
 دکھائیں۔ راجہ کول چند کے ایک سو بچا کی جلی مانتھی غزنی والوں کے ہاتھ لگے۔
 ستھرا کے تعلق امیر بن آستین نے سلطان محمود کو بتایا تھا کہ اس کے ارد گرد دیوار
 بہت مضبوط ہے لیکن اس کا دفاع مارا جو تہج کی فوج کے ایک مدد سے کرتے ہیں۔
 اس کے علاوہ باباں کی فوج کی زبرداری میں ستھرا کا دفاع بھی تھا۔ سرسدا اور بلند شہر والے
 اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے تھے کہ کسی یرونی مدد آور نے ستھرا پر حملہ کیا تو وہ لئے ستھرا تک
 نہیں پہنچے دیں گے۔ وہ جتنا کہ ستھرا کا تھرتی دفاع کیا کرتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان محمود نے نہایت دانشمندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ستھرا
 کے اندر کے قلعے کے پھر باباں کی فوج کو رات سے بٹایا اور اہلینان سے ستھرا کی طرف
 بڑھا۔ اُس نے ستھرا کو در سے دیکھا تو شش عیش کر اٹھا۔ بعد میں اُس نے غزنی کے گورنر کو
 ستھرا کی خوبصورتی اور ہندوؤں کے قدیم فن تعمیر کے تعلق خد میں کھاتھا۔ ”میں ان کی
 عمارتیں یہاں کے عقیدہ مندوں کے عقیدوں کی طرح مضبوط ہیں۔ زیادہ تر تنگ ممر کی
 ہیں۔ بہت سے مندر ہیں سر بہتوڑ سے اڑھے میں تعمیر نہیں ہوئے ہوں گے۔ ان
 کی تعمیر پر کروڑوں دینار صرف ہوئے ہوں گے اور ان کی تعمیر دو صدیوں میں مکمل ہوئی
 ہوگی۔۔۔۔۔ میں اس شہر کے صحن کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا۔“

سلطان محمود کی فوج کا نعتان بہت کم ہوا تھا۔ وہ خود اعتمادی سے ستھرا کی طرف
 بڑھا جا رہا تھا۔ باباں کی فوج کے بھگڑے ستھرا پہنچ گئے تھے اور انہوں نے لوگوں میں
 خوب دہشت پھیلائی تھی۔ اس سے پہلے ہشام اور اُس کے ساتھی دہشت پھیلا چکے
 تھے۔ باباں کے شکست خوردہ پاسبانوں نے ستھرا میں یہاں تک کسا کہ غزنی کی فوج
 کے آگے دہشت کھڑ جاتے ہیں۔ ان افواہوں کا یہ اثر ہوا کہ شہر کی آبادی دفاع میں
 لڑنے کی بجائے مندروں میں اکٹھی ہو گئی۔ سکھ اور گھنیاں بچے لگیں۔
 غزنی کی فوج نے شہر کا محاصرہ کیا اور نہایت معمول مزاحمت ہوئی۔ شہر کے
 دروازے کھل گئے اور سلطان محمود شہر میں داخل ہو کر سب سے پہلے بڑے مندر میں گیا
 جہاں کرشن واسد لڑکا بت رکھا تھا۔ بہت خوبصورت بت تھا۔ اس کی آنکھوں میں
 بیش قیمت پیرے لگے ہوئے تھے۔ پانچ بت سونے کے تھے۔ ان کی بھی آنکھیں پیروں
 کی تھیں۔ ان سب پیروں کی قیمت غزنی کے مطابق پچاس ہزار دینار تھی۔ ایک اور
 بت سونے کا تھا۔ اس میں چار سو ستال ورنی پیرے جیسا پتھر جڑا ہوا تھا۔ اس
 بت کو گھلایا گیا تو ۹۸۳۰۰۰ ستال خالص سونا نکلا۔ ایک ستال ساڑھے چار مانے
 کا ہوتا ہے۔ ایک سو بت چاندی کے تھے۔

سلطان محمود نے پتھر کے بت توڑ ڈالے اور سونے چاندی کے بت پگھلا دیئے۔
 ہندو مت کے اس مرکز کو بھوش کے لیے ختم کرنے کے لیے سلطان محمود میں دوسرے ستھرا میں مار
 شہر جٹار اور خال ہوتا رہا جتنی کہ ستھرا گھنڈوں کا شہر بن گیا۔
 مہاراجہ تہج نے اپنا دفاع مضبوط کرنا شروع کر دیا۔ اب اُس کی باری تھی۔